"وہ کوہ کن کی بات..."

مولانا نور عالم خلیل امینی

ادارہ علم و ادب، دیوبند - یوپی

”وہ کوہ کن کی بات“...

"وہ کوہ کن کی بات"...

دارالعلوم
دیوبند کے سابق استاذ
وناظم تعلیمات ومعاون مہتمم مولانا وحید الزماں
قاسمی کیرانوی کے حالات وواقعات، نوجوانوں کی موجودہ نسل پر
ان کے اثرات واحسانات اور زندگی کے مختلف
میدانوں میں ان کے تابندہ کارناموں
کی ایک جھلک

مولانا نور عالم خلیل امینی
استاذ ادب عربی ومدیر 'الداعی'
دارالعلوم، دیوبند

ادارہ علم وادب، دیوبند - یوپی

"WOH KOH KAN KI BAT"
BY MOULANA NOOR ALAM K. AMINI

پہلا ایڈیشن ——— صفر ۱۴۱۶ھ ——— جولائی ۱۹۹۵ء
دوسرا ایڈیشن ——— جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ ——— اکتوبر ۱۹۹۵ء
تیسرا ایڈیشن ——— رمضان ۱۴۲۱ھ ——— دسمبر ۲۰۰۰ء

نام کتاب ——— ''وہ کوہ کن کی بات''...
مصنف ——— مولانا نور عالم خلیل امینی
کتابت ——— نواز پبلی کیشنز، دیوبند
طباعت ——— بھارت آفسیٹ، دہلی
ناشر ——— اِدارہ علم وادب، دیوبند، یوپی
تعداد ——— باراول ۱۱۰۰، باردوم ۱۱۰۰، بارسوم ۵۰۰۰
بہ اہتمام ——— مولوی سہیل اختر قاسمی
قیمت ——— ۲۰۰ روپے

Publisher
IDARAH ILM-O-ADAB
Afriqi Manzil Qadeem, Near Chhatta Masjid
DEOBAND - 247554 U.P.

-: ملنے کے پتے :-

کتب خانہ حسینیہ، دیوبند، یوپی ☆ کتب خانۂ نعیمیہ، دیوبند، یوپی ☆ ادارہ علم و ادب، افریقی منزل قدیم، دیوبند ☆ کتب خانۂ رشیدیہ، جامع مسجد، دہلی ☆ جامعہ علوم قرآن، جمبوسر، بھروچ، گجرات ☆ جامعہ اشاعت العلوم، اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹرا ☆ مدرسہ تحفیظ القرآن، تہائی مداری پور، مظفرپور، بہار، ☆ مدرسہ ابوبکر صدیق، ہرپور بیشی، اورائی، مظفرپور، بہار

انتساب

- مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے نام

جس کے فیضانِ عشق نے آدابِ جنوں سکھا کر
آشنائے لذتِ شعور و آگہی بنا دیا۔

- اُن مرحوم دادی کی روح کے نام

جو اپنے اکلوتے فرزند کی جاں گداز جواں مرگی کے بعد، محض اپنے پوتے کے لیے ذرا سی اور فرصتِ عمر پا جانے کی ناقابلِ بیاں تمنا لیے، دنیا سے سدھار گئیں اور اپنے خونِ جگر سے، اپنی محبت و پیار کا نقشِ جاوداں میرے دل پر ثبت کر گئیں، جو میرے لیے ان شاء اللہ زندگی کی راہیں روشن کرتا رہے گا۔

- اُن بوڑھی ماں کے نام

جن کی دعاء نے ہی زندگی کی گرہیں کھولیں اور جن کی سادہ و پرکار تدبیر و توجہ اور سایۂ ہما نے ہمت و حوصلے کو، اس طرح مہمیز کیا کہ اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود، دل کی پوری کائنات: اسلام، عربی زبان اور پیغامِ محمدی کے ساتھ، بے حساب وفاداری کے جذبے سے معمور و مسرور رہا کرتی ہے اور ان شاء اللہ تادمِ زیست رہے گی۔

مولانا مرحوم کے تعارف سے آئندہ نسلوں کو بہت فائدہ پہنچے گا اور ان میں کام کرنے کا جذبہ اور لگن پیدا ہوگی

بقلم : عارف باللہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندویؒ
متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء

جناب مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی مرحوم سے میرا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ راقم اُن کی شرافتِ نفس، حق گوئی و بے باکی، اخلاص فی العمل اور دوسری گوناگوں خوبیوں، بالخصوص عربی زبان وادب میں اُن کی مہارت اور خدمات اور انتظامی صلاحیت سے، بہت متاثر تھا۔ مولانا مرحوم کی خدمات کے تعارف سے، ان شاء اللہ، آئندہ نسلوں کو بہت فائدہ پہنچے گا اور اُن میں مولانا مرحوم کی طرح کام کرنے کا جذبہ اور لگن پیدا ہوگی۔

احقر صدیق احمد عفی عنہ
خادم جامعہ عربیہ، ہتھورا، باندہ
۲۵ رمضان ۱۴۱۶ھ

("پیغام حضرت مولانا صدیق احمد باندویؒ": ترجمان دارالعلوم، مولانا کیرانویؒ نمبر)

فہرست عناوین

سوانحی نقوش

☆ ☆ ☆

ہیں اور بھی دُنیا میں سخن وَر بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفے چند

(دیباچہ طبع ثالث)

صفر ۱۴۱۶ھ/ جولائی ۱۹۹۵ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا، یہ ایڈیشن ایک ماہ سے کم عرصے میں ختم ہوگیا۔ جمادی الاولی ۱۴۱۶ھ/ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں، اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا اور وہ بھی تقریباً اتنی ہی مدت میں ختم ہوگیا۔ مؤلف نے کتاب میں ترمیم واضافے کے پیش نظر، اس کی اگلی طباعت روک دی؛ لیکن کثرتِ کار اور ہجومِ امراض کی وجہ سے آج شنبہ ۱۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ مطابق ۹؍دسمبر ۲۰۰۰ء سے پہلے یہ کام، مسلسل اِرادے اور پیہم خواہش کے باوجود، انجام نہیں دیا جاسکا۔

اِس اثنا میں قارئین کرام کی دل چسپی کا یہ عالم رہا، کہ بہت سے لوگ میرا محفوظ نسخہ مجھ سے مانگنے آئے۔ بعضوں نے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کرائی۔ دیوبند کے کتب خانوں کا بہت سے قارئین چکر کاٹتے رہے۔ کہیں

کہیں سے تو کتاب کے بہت سے نسخوں: ۱۰۰، ۲۰۰ کی خریداری کا آرڈر بھی، کتب خانے والوں کو رد کردینا پڑا۔ شدید تقاضوں کے وقت وہ قارئین کو یہ کہہ کر تسکین دیتے رہے، کہ کتاب زیرِ طباعت ہے، عن قریب آیا چاہتی ہے۔ اِن سطور کے لکھتے وقت بھی قارئین کے جمِ غفیر کی طرف سے تقریباً دو ہزار (۲۰۰۰) نسخوں کی مانگ آئی ہوئی ہے۔

اس کتاب کی اس درجہ مقبولیت کی اصل وجہ تو صاحبِ سوانح کی حد درجہ اور مثالی محبوبیت ہے؛ لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا لفظ لفظ جگر پارہ اور قاشۂ قلب ہے۔ اس میں مولانا کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ دل سے نکلی ہوئی بات ہے؛ اِس لیے وہ اپنا اثر رکھتی ہے۔ کتاب میں کوئی خوبی نہیں؛ اگر ہے تو یہی خوبی ہے اور یہ ایسی خوبی ہے کہ بندے کے ہر کام کو مقبول بنادیتی ہے۔ دل کی صدا اور سچے جذبات کی سچی ترجمانی، ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ پھر متوجہ ہونے والا یہ نہیں دیکھتا کہ ترجمان کا لب ولہجہ خوب صورت ہے، شستہ بلیغ وفصیح اور ادب وزبان کے معیارِ مطلوب پر اترتا ہے کہ نہیں؛ کیوں کہ دل کا ترجمان کسی تکلف اور آورد کا دریوزہ گر نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ اپنی آواز کو اپنے لب ولہجے میں دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ الحمد للہ کہ قارئین نے دل سے نکلے ہوئے الفاظ کو، توقع سے زیادہ اپنی عنایات سے نوازا۔ اگر یہ کتاب ان کی عنایات کا لحاظ کرتے ہوئے مسلسل شائع ہوتی رہتی، تو شاید اس کے ۱۵-۲۰، ایڈیشن نکل چکے ہوتے؛ لیکن مؤلف کے اعذار نے، انھیں کئی سال انتظار کی زحمت میں مبتلا رکھا، اس

کے لیے وہ ان سے انتہائی معذرت خواہ ہے۔

اس ایڈیشن میں اصل کتاب میں حک و اضافے کے ساتھ ساتھ، تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) صفحات کا اضافہ ''سوانحی نقوش'' کے عنوان سے کتاب کے آخر میں کیا گیا ہے؛ کیوں کہ بہت سے قارئین کا اصرار رہا کہ مولانا کی زندگی کے ابتدائی حالات، طالب علمی کے واقعات، تدریسی عرصے اور کیمپ اور اس کے بعد کے حادثات کا مختصراً ہی سہی، تذکرہ آنا چاہیے۔ میں نے پہلے جو کچھ لکھا تھا، اس میں ''مانگے کے اجالے'' سے پرہیز کیا تھا؛ کیوں کہ وہ مولانا کے حوالے سے اپنے قلبی تاثرات تھے، جن میں ''غیر'' کی دخل اندازی اپنی غیرت کے خلاف محسوس ہوئی۔

لیکن اس سوانحی باب میں اپنی اور غیروں کی بات سے عرضِ حال کے تقاضے کو پورا کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس ''حال'' کی بہت سی کڑیوں اور مراحل کے مشاہدے سے میں، محروم رہا تھا، جیسے دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس اور کیمپ کے حالات، بالکلیہ میرے غائبانے میں رونما ہوے۔

کتاب کے بالکل آخر میں ''وہ کوہ کن کی بات'' کے حوالے سے نام ور علما، ادبا اور صحافیوں کے تاثرات بھی شائع کردیے گئے ہیں: تاکہ ان گراں قدر تاثرات کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے، نیز کتاب کے سلسلے میں بہت سے ان قارئین کی توجہات کے مرکوز ہونے کا ذریعہ بنے، جو ہوسکتا ہے کہ مولانا کیرانویؒ کی عظیم اور منفرد شخصیت سے کچھ زیادہ واقف نہ ہوں۔

بہ ہر کیف کتاب کے اس ایڈیشن میں اردو کے مروجہ املا کو بھی برتنے

کی کوشش کی گئی ہے۔ سابقہ دونوں ایڈیشنوں میں اس سلسلے میں ہاتھ کی کتابت کی صعوبت کی وجہ سے، خاصی کوتاہی واقع ہوگئی تھی۔

اِس طرح یہ تیسرا ایڈیشن پہلے سے زیادہ بہتر اور مکمل ہے۔ یقین ہے کہ قارئین پہلے سے زیادہ اس کی پذیرائی کریں گے اور نسلِ نو کو — جس نے مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کو نہیں دیکھا ہے — اس کتاب کو پڑھنے کی دعوت دیں گے، مدرسوں کے تمام طلبہ واساتذہ کو اس کے مطالعے پر راغب کریں گے؛ تاکہ مولانا کی تربیت کی برکات سے بعد از مرگ بھی، فائدہ اٹھانے اور چراغ سے چراغ جلانے کا سلسلہ باقی رہے۔ نظم ونسق اور تربیت کا موثر و لطیف انداز مولانا کی اصل شناخت تھی؛ اِس لیے ان کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت، ان کے اس پہلو سے بہ طور خاص سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب کے ہر پڑھنے والے سے، عظیم صاحبِ سوانح اور ناچیز مؤلف کے لیے، دعائے خیر کی دست بستہ درخواست ہے۔

نور عالم خلیل امینی

افریقی منزل قدیم دار العلوم دیو بند

شنبہ دو پہر ۱۲/ بجے

۱۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ = ۹/ دسمبر ۲۰۰۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ گفتار

(دیباچہ طبع ثانی)

الحمدللہ کہ دورِ آخر میں، برصغیر کے مدرسی ماحول کے منفرد مربی و معلّم اور اس وسیع تر دیار میں عربی زبان و ادب کے جمال آفریں، ذوق ساز، سلیقہ شعار اور بابرکت ''مستری'': مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ پر، راقم الحروف ایسے بے مایہ اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک گم نام؛ بل کہ بے نام و نشان انسان کی تاثراتی کاوش ''وہ کوہ کن کی بات''... کو جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور جس طرح ملک کے تمام تعلیمی حلقوں میں اُس کی پذیرائی ہوئی، کہ ایک ماہ سے بھی کم ہی عرصے میں اُس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا؛ اِس کی ناچیز مؤلف کو توقع نہ تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب، صاحبِ سوانح کی پرکشش شخصیت اور اُن کی شہرت و مقبولیت سے فیضانِ روحانی کے حصول میں کام یاب رہی۔

بلا شبہ کتاب کی غیر معمولی مقبولیت کا راز، درحقیقت مولانا مرحوم کی ساحرانہ شخصیت میں پوشیدہ ہے؛ لیکن قارئین کے بہ قول: کتاب کے خوب صورت ظاہر اور اس کے خوب سیرت باطن نے بھی اُنھیں گرویدہ کیا۔

ظاہر کے حوالے سے یہ عرض ہے کہ ناچیز مؤلف کی یہ آرزو اور کوشش بڑی حد تک کام یاب رہی کہ کتاب خوب سے خوب تر شائع ہو؛ تاکہ وہ صاحبِ سوانح کی نستعلیق و وضع دار شخصیت کے لیے، بعد از مرگ روحانی اذیت کا باعث نہ بنے؛ لیکن ظاہر کی زیبائش کا عمل چوں کہ نسبتاً آسان کام ہوتا ہے؛ اس لیے مؤلف کو اِس ''ظاہری کام یابی'' سے کچھ زیادہ خوشی نہ ہوتی اگر کتاب کا باطن مؤثر ثابت نہ ہوتا اور کتاب کی نکاسی صبار فتار نہ ہوتی۔

البتہ ''باطن کی درستگی'' چوں کہ ہفت خوانِ رستم [1] سے زیادہ کٹھن کام ہے؛ اس لیے بڑے سے بڑا خوش فعل انسان، اِس خوش فہمی کی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس نے اپنا، یا اپنے کسی نتیجۂ فکر کا باطن سنوار کر، ایسا عالی مقام کر دیا ہے کہ تنقید کا مولا نہیں؛ بل کہ شاہین بھی وہاں تک پر پرواز نہیں مار سکتا، صرف دامنِ تنقید کو حریفانہ کھینچنے والے، ہی اِس مقام کو طے کر سکتے ہیں۔

اِس لیے اس حوالے سے اپنی سی کوشش کے باوجود، اپنی اور قاری کی نسبت سے ''آپ بھی شرم سار ہو مجھ کو بھی شرم سار کر'' والی کیفیت کے مکمل اِحساس کے ساتھ، ڈرتے ڈرتے کتاب کو منظرِ عام پر لایا گیا۔ ناچیز مؤلف

(۱) کیکاؤس (ایران کا ایک مشہور بادشاہ) کی رہائی کے واسطے ماژندران (جسے اب ''طبرستان'' کہا جاتا ہے) تک رستم (فارس کا ایک مشہور بہادر پہلوان، جس کی بہادریوں کی داستانیں شاہ نامہ میں درج ہیں) نے سات دن میں جو راستہ طے کیا تھا، اسے ہفت خوانِ رستم کہتے ہیں (کنایتاً: کٹھن کام، مشکل ترین کام)۔

کو پوری طرح اعتراف ہے کہ اردو زبان و ادب تو کجا، جس میں اس کو "مشقِ حرف" کے مواقع بہت کم ہاتھ آئے، عربی زبان؛ جس میں اُس کے قلم کا ناتواں مسافر تقریباً تیس برس سے مسلسل محوِ سفر ہے، میں بھی اب تک اُس کا اپنا کوئی انفرادی لہجہ نہیں، نہ وہ اپنی شناخت یا علامتی طرزِ اظہار رکھتا ہے اور نہ اُس کے ہاں اُسلوب کا کوئی بانکپن، اچھوتے خیال کی کوئی چمک اور گہرے اور ہمہ گیر احساس کا کوئی نرالا پن ہے۔ اُس کو اپنے عجزِ بیان اور قوّتِ ترسیل سے اپنی تہی دامنی کا بھی اعتراف ہے اور اسالیب کی خوبیوں، اندازہائے بیان کی نزاکتوں اور طرزہائے تحریر کی نفاستوں کی تو اُسے ہوا بھی نہیں لگی۔ اُسے اپنے آپ کو منوانے کا فن بھی نہیں آتا اور نہ وہ اپنے بارے میں خوش فہمیاں پھیلانے کا گُر جانتا ہے، کہ یہ فن بعض دفعہ، کسی فن میں طاق ہونے سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔

اِن سب وجوہات کے پیشِ نظر اُسے یقین تھا کہ کتاب میں مواد، ترتیب، ترجیحات و انتخابات اور پیش کش: سبھی اعتبار سے خامیاں راہ پا گئی ہوں گی؛ بعض جگہ بالقصد جو ایجازِ مُخل اور اِطنابِ مُمِل سے کام لیا گیا ہے، وہ اس پر مستزاد ہیں؛ لیکن ناظرین نے جس طرح تمام لغزشوں اور فرو گذاشتوں سے چشم پوشی کی، جس فیاضی سے کتاب کو خراجِ تحسین پیش کیا، زبانی و تحریری طور پر گراں قدر تاثرات سے مؤلف کو شاد کیا اور بوقلموں گلستانِ زبانِ اردو کے ایک نونہال و بے کمال و بے رنگ؛ بل کہ "بے گانہ" پودے کا جس طرح دل بڑھایا، اس کے لیے میں اُن کا انتہائی ممنون اور

اپنے ربِّ ستّار کا بے حساب شکر گزار ہوں، کہ وہ اپنے بندوں کے نقائص پر، کس طرح دبیز و شوخ رنگ ردائے ستّاری ڈال کر، اُنھیں نگاہِ خلق میں مناقب بنادیا کرتا ہے۔ سُبْحَانَہٗ مَا أَعْظَمَ شَأْنَہٗ (پاک ہے وہ اور عظیم تر ہے اُس کی شان)۔

تقریباً سبھی قارئین نے مختلف لفظوں میں کہا ہے کہ کتاب کا سرورق اتنا جاذبِ نظر ہے کہ قاری اُس میں محو ہو جاتا ہے اور پوری کتاب کا غذ، کتابت اور طباعت وغیرہ کے اعتبار سے اتنی اچھی چھپی ہے کہ ''عروسِ جمیل درلباسِ حریر'' محسوس ہوتی ہے۔ دل فریب مناظر کے دل دادہ بعض قارئین کو کتاب پڑھتے ہوئے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ ''چاروں طرف قوسِ قزح کے رنگ برس رہے ہیں'' اور اُن کے بہ قول شگفتہ بیانی، قلم کی روانی، مسحور کن بے ساختگی، شادمانی و شادکامی اور بے تکلّفانہ فضا کے طفیل ایک ایسا پیرایۂ بیان تخلیق ہو گیا ہے، جو قاری کو اِس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، کہ کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کیے بغیر، درمیان میں کوئی دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ جن بزرگوں یا خردوں (۲) (ہم عصروں) کا ذکر کسی موقع سے متن میں آ گیا تھا، اُن میں سے اکثر پر کچھ تعارفی سطریں حاشیے میں لکھ دی گئی تھیں۔ ''خُردوں'' کے تذکرے میں برجستگی، محبت اور بہ قول قارئین، ظرافت و لطافت کے عناصر نے ایک خوش رنگ جمالیاتی فضا پیدا کر دی

---

(۲) (خُرد) بہ معنی چھوٹا، کا املا اسی طرح صحیح ہے (خورد) خوردن کا حاصلِ مصدر ہے، جو کھانا، طعام اور غذا کے معنی میں ہے۔

ہے؛ اِس لیے کتاب پڑھتے ہوئے بیتے ہوئے دنوں کی پُر کیف یادیں —— اور ماضی کی یادوں کو خدا نے یہ خوش نصیبی دی ہے، کہ وہ اپنی تلخی و شیرینی کے ساتھ بہت لذیز و عزیز ہوتی ہیں —— اُنھیں اِس طرح اسیر کر لیتی ہیں، کہ اِس حکایتِ لذیذ کو از اوّل تا آخر پڑھے بغیر اُنھیں کسی طرح کل نہیں آتی۔

بلا تکلف یہ عرض ہے، کہ یہ سب کچھ قارئین کے قلب ہائے قلعی دار و مرضی شعار کا عکسِ جمیل ہے، جو اُن کی خوش نظر نگاہوں کو محسوس ہوا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی رجب ۲۰۴ھ/ دسمبر ۸۱۹ء) کا ایک شعر ہے، جس کے متعلق اکثر اہلِ علم و نظر کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے، کہ یہ دنیا کے چند سچے ترین شعروں میں سے ایک ہے:

وَعَیْنُ الرِّضَا عَنْ کُلِّ عَیْبٍ کَلِیْلَۃٌ

وَلٰکِنَّ عَیْنَ السُّخْطِ تُبْدِیْ الْمَسَاوِیَا (۳)

ہم نے تو صرف یہ کوشش کی تھی، کہ اسلوب و مواد کے کھردرے پن کے خارزار سے، دامنِ قلم کو اُلجھنے نہ دیا جائے اور نوکِ خنجر یا نیزے کی اَنی سے تراشیدہ، کسی لفظ سے اس ''خمیرۂ وفا عنبریں جواہر والا'' کو تلخ نہ کیا جائے۔ ہمارے بعض اہلِ قلم کی عادت ہوتی ہے، کہ وہ صرف تیغِ مُحرّف کی نوک سے ہی لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے قلم کو شمشیرِ برہنہ اور اپنے اسلوب کو کم از کم ''سنگِ طفلاں'' کیے بغیر ایک سطر بھی نہیں لکھ پاتے؛ کیوں کہ اُن کا خیال ہے، کہ موضوع کوئی سا بھی ہو گرج، چمک، برق و باراں اور طوفان و سیلِ بے پناہ

---

(۳) نگاہِ خوشی ہر عیب سے کوری ہوتی ہے؛ لیکن نگاہِ ناخوشی تمام عیوب کو آشکارا کر چھوڑتی ہے۔

کی ایک ہول ناک فضا کے بغیر، اشہبِ قلم کو مطلوبہ سمت میں دوڑانا، نا قابلِ معافی جرم ہے۔ راقم نے کوشش کی تھی کہ صرف حالِ دل کو بے ساختگی کے ساتھ لکھ دیا جائے اور کسی طرح کی رنگ آمیزی اور آورد سے احتراز کیا جائے؛ چناں چہ بلا ضرورت کی تطویل، تحقیقی خشکی اور "مانگے کے اُجالے" سے پرہیز کیا گیا تھا؛ یعنی یہ کہ صرف اپنے تجربات، مشاہدات، تاثرات اور احساسات کی روشنی میں، مولانا مرحوم کو دیکھا گیا تھا اور انھیں جتنا اور جس طرح سمجھا؛ اپنی لفظیات، اپنے لہجے اور اپنے رویّے میں پیش کر دیا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں؛ اس لیے سارے قارئین بھی یک ساں نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں، کہ انگلیوں، قارئین اور مؤلفین کے خالق نے اِس جہانِ آب و گِل کے چمن کو گل ہائے رنگا رنگ سے زینت بخشی ہے اور اختلاف کو اِس کے پائے جمال کی خلخال بنا دیا ہے۔

چناں چہ کچھ ہم عصر دوستوں، یعنی مولانا مرحوم کے بعض خُردوں اور راقم الحروف کے "بزرگوں" کو کتاب دیکھنے یا سننے یا شاید پڑھنے کے بعد، یہ شکایت ہوئی کہ کچھ خوش نصیب دوستوں پر، سطروں کی سطریں سیاہ کی گئیں اور ہم حرماں نصیبوں کا ذکر تک نہ آیا؛ سطروں کی سیاہی کا کچھ حصّہ ہمیں بھی ملنا چاہیے تھا۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے، کہ کتاب مولاناؒ کے حالات پر لکھی گئی تھی، دوستوں کی "کھتونی" تیار نہیں کی گئی تھی، ورنہ سطروں کی سطریں نہیں؛ بل کہ تمام یا اکثر دوستوں کی نذر، ایک ایک سطر بھی کی جاتی، تب بھی

نتیجہ یہ نکلتا، کہ مولانا کے حالات والی سطریں، دوستوں کے تذکرے والی سطروں کے بالمقابل، پاسنگ بن جاتیں؛ یا کم از کم اوّل الذکر کی حیثیت حاشیے کی اور ثانی الذکر کا درجہ متن کا ہو جاتا۔ جن ''سعادت مندوں'' کے تذکرے سے کتاب کو رونق ملی، اُن کا تذکرہ، بعض واقعات کے تسلسل میں بے ساختہ گندھا ہوا آ گیا تھا؛ میں نے از خود لانے کی کوشش نہیں کی تھی، ورنہ بہ تکلّف تذکرے کے لیے ''خُردوں'' کی بات تو جانے دیجیے، کہ ''بزرگوں'' کی کوئی کمی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

ایک آدھا قاری کا یہ تاثّر بھی مؤلّف کے کانوں سے آ ٹکرایا، کہ کتاب میں صاحبِ سوانح کے حوالے سے، کچھ بوئے مبالغہ بھی محسوس ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے، کہ مولاناؒ کے ہاں تقلید یا روشِ عام کی پیروی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہ تعلیم و تربیت میں اپنے آپ کو مکمل طور پر لگا دینے؛ بل کہ کھپا دینے اور اپنے کثیر الجہات علم و ہنر کو عموماً اور عربی زبان و ادب، جس میں ان کو اختصاص تھا، کو خصوصاً قلیل ترین مدّت میں، غیر معمولی سہولت کے ساتھ اور بغیر کسی ادعائیت اور نمائش کے، اپنے خوشہ چینوں تک، کیف آور طریقے سے منتقل کر دینے کے حوالے سے: اس دورِ آخر میں یقیناً لاثانی تھے۔ اس پر مجھے سو بار اِصرار ہے اور ہزار بار اِصرار رہے گا۔ دورِ آخر کے اکثر فضلائے باکمال نے، جنھیں مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے استفادے کی سعادت سے محرومی رہی، چوں کہ عموماً اُن عالی مرتبت

اساتذۂ گرامی سے فیض پایا ہوگا، جو علم و ہنر کے فیضان میں عموماً ایک دوسرے کے مماثل ہوتے ہیں اور اُن کے ہاں اِس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر انفرادیت، جدّت اور نرالا پن نہیں ہوتا، خواہ وہ دوسرے حوالوں سے اپنی اپنی شناخت رکھتے اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہوں؛ بل کہ مولانا سے فائق ہوں؛ اِس لیے اُنھیں اِس کتاب میں متعدد جگہ بوئے مبالغہ یا افراطِ مدح سرائی کی تیز خوش بو محسوس ہوسکتی ہے۔ مؤلّف نے یہ کبھی نہیں کہا، کہ مولانا محدث بے مثال، فقیہِ باکمال، ادیبِ بے نظیر، خطیبِ بے بدل، مؤلّفِ کثیر التصانیف، علامۂ زماں، مُعلّمِ دوراں، مُربّیِ عصر، مُجدّدِ وقت، زاہدِ پاک باز اور خدا رسیدہ بزرگ، یا صاحبِ دل داعی اِلی اللہ تھے۔ مؤلّف نے اُس مادرِ علمی کے حوالے سے بھی، جس کے وہ واقعتاً فرزندِ فرید اور خادم وفا کیش تھے: یہ نہیں کہا، کہ "یک آفتاب بود و ہمہ ستارہ ہائے او بودند۔"

اس میں کوئی شک نہیں، کہ مولانا کو قادرِ مطلق نے انفرادی خصوصیات سے نوازا تھا اور اُنھیں اُن کے بابرکت نام "وحید الزماں" کا وافر حصّہ عنایت کیا تھا: اِس لیے تعلیم و تربیت کے ہمہ گیر گوشوں میں سے جس سمت میں بھی وہ جا نکلے، اُس میں اپنی شناخت قائم کرلی؛ اِس طرح وہ ہماری مدرسی زندگی اور ثقافتی تاریخ کے ایک زرّیں باب کا، ایک خوب صورت سا عُنوان تھے۔ اُنھوں نے نہ صرف ہماری بہت ساری تعلیمی و تربیتی روایات کی تہذیب کی؛ بل کہ برِصغیر کے مدرسوں کے ماحول میں عموماً اور دیو بندی مکتبۂ فکر کے مدرسوں میں خصوصاً، ایک زندہ و متحرک زبان کی حیثیت سے، عربی

زبان کے چلن کو عام کرنے کے لیے، جس ادبی سلیقے، تالیفی کوشش اور ہمہ گیر وبابرکت جہدِ مسلسل سے کام لیا، یہ سارا کچھ اُنھیں ''بے مثال'' کا درجہ عطا کردینے کے لیے کافی ہے۔

کہ:

ع تیری رفتارنئی ہے، تری گفتارنئی

(نظیر اکبرآبادی)

لیکن اس کے باوجود میں نے اُن کو اعلانیہ یہ سند، دینے کی سعادت حاصل نہیں کی۔ اُن کی ''بے مثالی'' کی نمایاں دلیل یہ ہے، کہ مدرسی زندگی میں اپنے بہت سے ہم عصروں کی بہ نسبت، اُنھیں نوجوانوں کی جو دیوانہ وار محبت وعقیدت ملی، اس کی نفی کرنے کی جرأت، شاید صرف اُسی کو ہوسکتی ہے، جس کو آفتاب کے وجود کے انکار کی توفیق حاصل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ماحول میں، عربی زبان کی ترویج کے لیے، جس طرح اُنھوں نے عقیدت ومحبت بہ کف اِنقلاب کی قیادت کی، اِس کی بناپر، وہ اس کے تازہ دم اِشاعتی عمل کا، استعارہ بن گئے تھے۔

مزید برآں یہ کہ مؤلف نے ''حرفِ اول'' میں صراحت کردی تھی، کہ اُس نے مولاناؒ کو اپنے ہی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی قاری کا زاویۂ نظر ''زاویۂ قائمہ'' یا ''حادہ'' کے دائرے میں آتا ہو اور مؤلف کا زاویۂ نگاہ ''زاویۂ منفرجہ'' کا درجہ رکھتا ہو، جو اوّل الذکر دونوں زوایا سے بڑا اور اُن دونوں کو مُحیط ہوا کرتا ہے؛ اِس لیے ہر ایک کو اپنے اپنے زوایۂ نظر پر مطمئن

رہنے کا حق ہے۔ اِس سلسلے میں آخری بات یہ ہے، کہ راقم الحروف نے مولاناؒ کی خصوصیات کو لکھتے وقت، بہ طورِ خاص ایک ایک لفظ کو محسوس کر کے لکھا تھا اور اُس نے قلم کو اپنے حال پر نہیں چھوڑ دیا تھا، کہ اُس کے جو جی میں آئے، لکھتا چلا جائے۔ سچ تو یہ ہے، کہ اُن کی خصوصیات و امتیازات کے حوالے سے مؤلّف کے بے سلیقہ، کم نگاہ اور کوتاہ پرواز قلم سے، اُن کی حق تلفی تو ضرور ہوئی ہے؛ لیکن یہ ہر گز نہیں کہا جا سکتا، کہ راقم نے اُن کے حق سے زیادہ کچھ، اُنھیں دے دیا ہے۔

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

☆ ☆ ☆

زاویۂ نظر ہی کے حوالے سے ایک آدھ قاری کا یہ تأثر بھی کان میں پڑا، کہ مؤلف نے مولاناؒ کو صرف اپنے ہی زاویۂ نظر سے کیوں دیکھا ہے؟ اس کو چاہیے تھا کہ تمام زاویہ ہائے نظر کو یک جا کرتا — خواہ اِسی عمل میں عمرِ عزیز: طویل یا قصیر، ختم ہو جاتی — پھر مولاناؒ پر کچھ لکھتا تو خاصے مزے کی چیز ہوتی۔

اِس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے، کہ اپنے زاویۂ نظر سے دیکھنے میں جو جذبہ، اپنائیت، سچائی، گہرائی، عقیدت اور کسی انسان کی داخلیت میں جھانکنے وغیرہ کے عناصر، کارفرما ہوتے ہیں، وہ دوسروں کے زاویہ ہائے نظر سے دیکھنے میں، نہیں ہو سکتے۔ جن دوسروں کے پاس اپنے اپنے زاویہ ہائے نظر ہیں اور خوش قسمتی سے، اُن سے دیکھنے کی وہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں، وہ اگر اپنی دید کے نتائج از خود پیش کریں، تو بڑے کام کی چیز ہوگی؛ کیوں کہ کوئی

دوسرا آدمی کسی دوسرے کے اندرون میں، اس طرح غوطہ زن نہیں ہوسکتا، جتنا کہ وہ خود ''اپنے گریبان میں جھانک'' سکتا ہے۔ راقم الحروف چوں کہ شکر کا بھی مریض ہے، جس کی وجہ سے بینائی بھی کافی کم زور ہوچکی ہے؛ اِس لیے ویسے بھی اس کو ''دور کی نہیں سوجھتی'' اپنے قریب کی چیزیں البتہ کسی نہ کسی طرح ضرور دیکھ لیتا ہے؛ اِسی لیے مولانا کو بھی اس نے قریب ہی سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے، کہ زاویہ ہائے نظر کا اختلاف، آنکھوں کے سامنے کی فضا کو اِس درجہ کُہر آلود کردیتا ہے کہ بعض دفعہ شخصیت، اُس کے کثیر الجہات ہفت رنگی عناصر: سبھی کچھ دھندلا جاتے ہیں اور ایک دیکھنے والے کو بعض دفعہ اپنی آنکھ، ذہن اور قوتِ شناخت پر اِس درجہ زور دینا پڑتا ہے، کہ اُس کی بینائی بھی جواب دے جاتی ہے۔ گویا ''سانپ'' تو مرتا نہیں اور ''لاٹھی'' بھی ٹوٹ جاتی ہے!!۔

☆ ☆ ☆

کچھ تبصرہ نگاروں کو ہم دردانہ شکایت ہے، کہ کتاب میں مولاناؒ کی سوانح آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس مسئلے میں اولاً تو یہ عرض ہے کہ راقم الحروف نے ''حرفِ اوّل'' کا آغاز ہی اِن الفاظ سے کیا تھا، کہ کتاب میں جو کچھ پیش کیا جارہا ہے، وہ مولانا کیرانویؒ کی کوئی باقاعدہ سوانح نہیں؛ بل کہ اِن سطور کا مقصد اپنے ذاتی تاثرات واِحساسات کو، اُن کے ساتھ اپنے تعلقات اور اپنے اوپر اور نوجوانانِ مدرسہ کی ایک پوری نسل پر، اُن کے احسانات واَثرات کی

روشنی میں، قیدِ تحریر میں لانا ہے۔

اور ثانیاً یہ عرض ہے، کہ اگر سوانح سے مراد، صرف یہ ہوا کرتا ہے، کہ فلاں صاحبِ سوانح کہاں پیدا ہوئے؟ وہاں کی زمین شوریدہ تھی یا زرخیز، آب وہوا اِنسان ساز تھی یا مردم سوز؟ وہ پیدا ہی کیوں ہوئے، اگر نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟ اُن کا جدّی مکان جس نکڑ پہ واقع تھا، وہاں صرف سادات و شیوخ ہی رہتے تھے یا ''اچھوتوں'' کی کوئی پٹی بھی اُس سے آملتی تھی؟ آباو اَجداد کا پیشہ ہمیشہ سے ''سپہ گری'' رہا تھا، یا صرف صاحبِ سوانح نے اپنی راہ الگ بنائی تھی؟ مرحوم تلمیذ الرحمٰن تھے، یا نوابغِ زمانہ سے اکتسابِ فیض کیا تھا؟ اُن کے مورثِ اعلیٰ نے (مثلاً) مرحوم اینگلو عربک کالج دہلی میں مولانا مملوک علی نانوتویؒ (متوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے لیے، اپنے گاؤں یا قصبے سے دہلی کا سفر بیل گاڑی سے کیا تھا، یا ریل گاڑی سے، اگر ریل گاڑی سے کیا تھا، تو اس کا انجن اسٹیم سے چلتا تھا، یا اس میں گھوڑے جوتے جاتے تھے؟ نیز یہ کہ انجن کو انگریز انجینیر وں نے بنایا تھا، یا وہ دیسی کاری گروں کی کرشمہ سازی کا نتیجہ تھا؟۔ صاحبِ سوانح نے لکھنے پڑھنے ہی کا پیشہ کیوں اختیار کیا، بیڑی بنانے کا کام کرتے، تو پھیپھڑوں کے مریضوں کی تعداد بڑھا کر، موجودہ دور کے ڈاکٹروں اور کثیر منزلہ گنجان کمروں والے ہسپتالوں کے عملے کا، کتنا کچھ بھلا کر جاتے؟ گھاس بھی کاٹ سکتے تھے، کیوں کہ طلبِ علم عموماً شہروں اور قصبات میں کیا جاتا ہے، جہاں کی آب وہوا گنجان آبادی کی وجہ سے، نہایت درجہ آلودہ ہوا

کرتی ہے، جب کہ گھاس کھلے دیہاتوں اور سبزہ زاروں میں کاٹی جاتی
ہے، جہاں سانس لینا، افزائشِ صحت کا یقینی ذریعہ ہے اور تندرستی علم و ہنر
سے، ہزار درجہ بہتر نعمت ہے؛ وغیرہ وغیرہ!!۔ یقین جانیے، کہ اکثر سوانح
نگار اپنی کتابوں کو، اِسی طرح کی دوراز کار تحقیقوں اور دماغ خور و فرصت سوز
جزئیات نگاری کے ذریعے، اِس درجہ بوجھل کر دیتے ہیں، کہ اگر کاغذ کو ان
کا بوجھ سہارنے کا حوصلہ ہوتو ہو، کہ یہ غیر ذی عقل اور ''معصوم'' ہوا کرتا
ہے؛ لیکن ان جیسے مؤلّفین کے قارئین اکثر اوقات، سوانح خواندگی سے
بیزار ہوکر، خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جو مردافگن قسم کے قاری جی کڑا
کر کے جیتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، وہ بقیہ زندگی میں سوانح خواندگی سے
مکمل پرہیز کے نسخے کو، اس طرح پابندی سے استعمال کرتے ہیں، جیسے
حکیم اجمل خاں (متوفی ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) کا نہایت معتقد مریض، اُن
کے نسخۂ شفایابی کو استعمال کرتا رہا ہوگا!۔

اور اگر سوانح کا مطلب، عملی زندگی کی مختصر یا مفصل تصویر کشی ہوا کرتا
ہے، تو راقم الحروف نے مولانا کیرانویؒ کی عملی اور تخلیقی زندگی کے اوراق مختصراً
ہی سہی، اِس طرح ضرور پلٹے ہیں، کہ ان کی علمی و فکری اور تربیتی سرگرمیوں کا
سبق آموز و حوصلہ پرور دورانیہ، آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور کتاب
مجموعی طور پر اپنے اس مقصد میں الحمدللہ بہت کام یاب اتری ہے، کہ ایک
قاری اسے بالاستیعاب پڑھنے کے بعد، مولاناؒ کی ذات و صفات کا ایک خوش
نما اور ولولہ انگیز خاکہ لے کر اٹھتا ہے۔ بہ قول ایم ودود ساجد صاحب (نئی

دنیا، نئی دہلی): ''حالاں کہ یہ کتاب مولانا مرحوم کی کوئی باضابطہ سوانح نہیں ہے؛ لیکن پڑھنے والے خود محسوس کریں گے کہ اُنھوں نے مولانا مرحوم کی ذات سے وابستہ معلومات کا، ایک وافر خزانہ پالیا ہے۔'' مشہور صاحبِ نظر اہلِ قلم مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنے مکتوب میں بڑی سچی بات کہہ دی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''کتاب میں نہ اِنشائیہ ہے، نہ سوانحی خاکہ ہے اور نہ سوانح عمری ہے؛ بل کہ مختصر ہونے کے باوجود، سب کچھ ہے۔''

☆ ☆ ☆

بعض دوستوں کو شکایت ہے کہ اِس میں مؤلف نے اپنا تذکرہ کیوں کیا ہے؟ گویا کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کی رو سے، شاید یہ ناجائز کام تھا؛ اس کے باوجود اِس کا ارتکاب، شوق سے کیا گیا!! شاید اُن کا مقصد — واللہ اعلم بالصواب — یہ ہو کہ اپنے تذکرے کے بہ جائے اُن ہی کا تذکرہ کیا جاتا، تو کتاب خوب سے خوب تر ہوتی!۔ اِس سلسلے میں ایک واقعہ برجستہ یاد آیا، جو اُمید ہے کہ قارئین کے لیے باعثِ مسرّت و بصیرت ہوگا؛ اِس لیے بلا تشبیہ عرض ہے کہ متواتر روایت سے ثابت ہے کہ ایک صاحب، قرآن پاک کی تلاوت فرمارہے تھے، بہت سے مقامات پر بہت سی قوموں اور افراد کے تذکرے سے، اُنھیں بےحد اذیت ہوئی، کہ اگر اُن کی جگہ خدائے ذوالجلال نے اُنھی کا اور اُن کے آبا و اَجداد کا تذکرہ کردیا ہوتا، تو اُس کی ذاتِ بے نیاز کا کیا بگڑ جاتا؟

صاحبو! اپنا ناگوارِ خاطرِ اَحباب تذکرہ، صرف اِس لیے کیا گیا ہے، کہ

اُس کی تان کسی نہ کسی طرح مولاناؒ کے حالات پر ٹوٹتی تھی؛ اپنے چراغِ حال سے درحقیقت اُن ہی کے اثرات و احسانات کی مجلس سجائی تھی؛ ورنہ اپنے تذکرے کے لیے قرطاس وقلم کی گنجائش ختم نہیں ہوگئی تھی؛ بہت کچھ کہا اور لکھا جاسکتا تھا، جو اِن شاءاللہ کسی اور موقع سے "یار زندہ صحبت باقی"۔

ظرافت ومزاح کے رویّے کو پس انداز کرتے ہوئے، اِس موقع سے اپنا یہ تاثر ثبت کرنے کو جی چاہتا ہے، کہ خودستائی دوسروں کے لیے کس قدر دِل سَتا ہوا کرتی ہے؟ اِس کا اندازہ مؤلفِ کتاب کی آپ بیتی کے چند ناگزیر واقعے کے، نہایت مختصراً ذکر سے بعض قاری — خواہ وہ کسی قد وقامت کے ہوں — کے اِظہارِ ناگواری سے کیا جاسکتا ہے۔ اپنی تعریف (یا اپنا ذِکرِ خیر) کسی موقع سے ہو، کیسی ہی ناگزیر ضرورت کے تحت ہو، کتنے ہی مقدار و معیار کے ساتھ کی گئی ہو، بہ ہر صورت اذیت رَسا ہوتی ہے۔ ذرا اندازہ تو کیجیے، کہ بعض مؤلفین، مقررین اور مفکرین، جو منھ بھر بھر کر اپنی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے، وہ دوسروں کے کرب میں، کس درجہ اضافے کا سبب بنتے ہیں " لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ " کاش اُنھیں اِس کا احساس ہوتا۔ بعض اچھے خاصے مہذب ومثقف لوگوں کو دیکھا گیا ہے، کہ صبح کی چائے کے بعد سے دوپہر کے قیلولے تک اور سہ پہر کی تازہ دمی سے رات گئے ہنگامِ خواب تک، صرف بزمِ خودستائی ہی آراستہ کیے رہتے ہیں، جیسے اُن کے وجود کا یہی ایک مقصد تھا؛ اِس لیے اسے حاصل کرکے ثوابِ دارین پارہے ہیں!۔

☆ ☆ ☆

سخنے ناگزیر در وجہِ تسمیہ

کتاب کی تکمیل کے بعد جب نام کی جستجو شروع ہوئی، تو دسیوں نام ذہن میں آئے۔ اُنھیں زیرِ تحریر لا کر اُن کے زیر و بم اور کیفیت و حیثیت کا اندازہ لگایا گیا۔ آرزو تھی کہ کسی ایسے نام تک خدائے علّام رسائی کرا دے، جو روایتی طرزِ تسمیہ سے علاحدہ بھی ہو اور خوش نما بھی اور مولاناؒ کی خارا شگافیِ حیات، کوہ کنیِ پیہم اور اُن کی حیاتِ مستعار کی دمِ آخر تک جاری تگ و تاز کی، باریکی اور خوب صورتی کے ساتھ غمازی بھی کرے۔ اِس مقصد کے تحت جتنے نام ذہن میں آئے، اُن کو ایک ایک کرکے ٹٹولا گیا۔ کافی چھان پھٹک کے بعد ''وہ کوہ کن کی بات''... کے عنوان کو، دل نے قبول کر لیا اور یوں محسوس ہوا، جیسے کسی کا دباؤ ہو کہ یہی نام رکھو اور صرف یہی۔ خدا کا فضل ہے کہ ذوقِ زبان و ادب کے تمام حلقوں نے اِسے حسبِ توقع، بہت پسند کیا۔ بعض اہلِ ذوق تو اس معنی ریز اور حسبِ حال نام کو پڑھ کر جھوم جھوم اُٹھے۔

چوں کہ یہ نام کوئی ایسا دقیق یا چیستاں نہیں تھا، کہ اِس کی شرح یا اِس کے انتخاب کی وجہ بیان کی جاتی؛ اِس لیے راقم نے کتاب کے قاری کے تئیں سوئے ظن کے شبہے سے بچنے کے لیے، شرحِ عنوان یا بیانِ وجہِ تسمیہ سے گریز کیا تھا۔

لیکن بے حد افسوس ہوا، کہ کچھ تو فارسی کا چلن ختم ہو جانے یا کم

ہو جانے کے سبب اور کچھ ہمارے حلقوں میں اردو سے ''بے نیازی'' کی بنا پر، اکثر طلبہ نے اور بعض اساتذہ قسم کے حضرات نے، کتاب چھپنے کے بعد اُس کے سرورق پر ''آہ! مولانا وحید الزماں کیرانوی'' طرز کا روایتی نام نہ پاکر، کافی کچھ مایوسی کا اظہار کیا۔ کچھ لوگوں نے ''کن'' کا ہجّے کرنے میں بھی غلطی کی۔ کسی نے اس لفظ کے ''ک'' کو پیش کے ساتھ ''کُن'' پڑھا، کسی نے زیر کے ساتھ ''کِن'' اور کچھ باتوفیقوں نے زبر کے ساتھ ''کَن'' پڑھ کر، ناچیز مُؤلّف کی لاج رکھ لی، جس کے لیے میں اُن کے حق میں دعا گو ہوں۔ ایک صاحب کے متعلق سنا گیا، کہ اُنھوں نے ''کُوہ'' کو کوّہ'' پڑھا اور فرمایا کہ مؤلّف کو ''کوّا'' (بہ معنی زاغ یا کاگ) کا املا بھی نہیں آتا اور پوری ایک کتاب لکھ ڈالنے کی جرأت کیوں کر ہوگئی؟!۔

اس لیے اپنی اور بعض اہلِ علم کی رائے ہوئی، کہ جس مصرع کا یہ عنوان جُز ہے، اُس کو مکمل لکھ کر اس کا مطلب، نیز اِس کے ذریعے جس واقعے کی طرف اِشارہ کیا گیا ہے، اُس پر روشنی ڈال دی جائے، تو یہ قارئین کے لیے بھی باعثِ دل چسپی ہوگا اور طلبہ کے لیے بھی بہت فائدہ مند رہے گا۔ اِسی مقصد کے تحت ذیل کی سطریں لکھی جارہی ہیں:

پورا مصرع اِس طرح ہے:

ع ''وہ کُوہ کَن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ''

اِس کی بعض روایت یوں آئی ہے:

''وہ بات کوہ کن کی گئی کوہ کن کے ساتھ''

بات کوہ کن اور شیریں کی

''کوہ کن'' فارسی اور اردو ادب میں ''فرہاد'' نام کے ایک شخص کا لقب ہے، جو داستانِ ''خسرو و شیریں'' کا ایک تاب ناک اور لازوال کردار ہے۔ فرہاد، خسرو (۴) شاہِ ایران کی ملکہ ''شیریں'' پر عاشق ہو گیا تھا اور اس طرح وہ عشق بے حساب میں شاہِ خسرو کا رقیب بن گیا تھا۔ روایت ہے کہ بادشاہ نے اپنی آتشِ انتقام کو فرو کرنے اور رقابت کا مزا چکھانے، یا اپنا اور اپنی حبیبہ کا پیچھا چھڑانے کے لیے، فرہاد سے کہا، کہ اگر تم کوہِ ''بے ستوں'' —— ایران کا ایک پہاڑ —— کاٹ کر ایک نہر میرے، یعنی شیریں کے محل تک لے آؤ، تو میں اپنی ملکہ تمھارے حوالے کر دوں گا۔ فرہاد چوں کہ شیریں کا عاشقِ صادق تھا؛ اِس لیے اُس نے بلا تأمّل شوق و ذوق سے یہ مشکل ترین کام کر گزرنے اور بابِ عشق کا یہ انوکھا اور سخت ترین امتحان دے ڈالنے کی ٹھان لی۔ سچی محبت چوں کہ ہمیشہ ایسے معجزات تخلیق کرتی رہی ہے، جن کے سامنے عقلِ انسانی دنگ ہوتی رہی ہے: اس لیے دنیائے عشق کا یہ نابغہ بے مثال، اپنے امتحان میں کھرا ثابت ہوا۔ بعض روایتیں کہتی ہیں کہ وہ نہر مکمل کر چکا تھا، جس سے

---

(۴) خسرو پرویز ساسانی، شاہ ہرمز ساسانی کا بیٹا اور کسریٰ اول یعنی نوشیرواں عادل ساسانی (۵۳۰-۵۷۹ء) ابن قباد ساسانی (۴۸۸-۵۳۱ء) کا پوتا تھا۔ نوشیرواں عادل اپنی عدالت کی بنا پر پوری دنیا میں ضرب المثل ہے۔

ساسانی خاندان، جس سے خسرو پرویز اور نوشیرواں عادل کا تعلق تھا، نے فارس پر ۲۲۶ء سے ۶۵۱ء کے عرصے میں حکومت کی تھی۔

بکریوں کا دودھ شیریں کے محل کے ایک حوض میں پہنچتا تھا اور کچھ روایتیں بتاتی ہیں کہ دودھ کی یہ نہر (جوئے شیر) لانے کا عمل پورا ہی ہونے والا تھا، کہ رقیبِ بدخواہ و روسیاہ (روسیاہ اس لیے کہ عشق کے حوالے سے خسرو گم نام ہے، جب کہ فرہاد کی شہرت سے دنیا آباد ہے) خسرو شہنشاہ نے کسی کے ذریعے یہ غلط اطلاع کوہ کن کو بھجوادی، کہ شیریں جاں بہ حق تسلیم ہو چکی۔ یہ خبر پاتے ہی اُس نے اپنے اُسی تیشے سے، جس سے پہاڑ کاٹنے کا کام کر رہا تھا، خودکشی کر لی۔

خسرو زندہ رہ کر بھی عشق کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر شہرت حاصل نہیں کر سکا؛ لیکن "باتوفیق" کوہ کن (فرہاد) نے مر کر زندگیِ جاوید پالی۔

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

(مفتی صدرالدین آزردہ)

مجھے کہنے دیجیے، کہ قتالہ و جمال افروز شیریں نے بھی، شہرت و عزت کا کوئی حصہ پایا ہے، تو وہ تمام تر دین ہے جاں نثار فرہاد کی قربانیِ جان و تن کی۔ عشق و محبت کا معاملہ بھی کچھ عجیب سا ہے؛ یہاں سارے پیمانے الٹ جاتے ہیں: وعدہ خلافی، دروغ گوئی، اذیت رسانی، دل گدازی، حتیٰ کہ خودکشی و جاں سپاری، جو دین و دنیا کی تمام شرائع میں ناپسندیدہ ہیں، یہاں نہ صرف پسندیدہ ہیں؛ بل کہ ایک عاشق کے لیے وجہِ امتیاز اور باعثِ سرخ روئی ہیں۔ یہ ایک عجیب سا جوا ہے، جس میں جیتنے والا ہار جاتا ہے اور ہارنے والا بامُراد رہتا ہے۔

سوداؔ کی زبان سے خدا نے کتنی سچی بات کہلوا دی ہے۔

سوداؔ! قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا، سر تو کھو سکا
کِس منھ سے اپنے آپ کو کہتا ہے: عشق باز
اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

یہ دوسری بات ہے کہ غالبؔ نے اپنی غزلیہ ظرافتوں اور شاعرانہ لن ترانیوں میں، یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ "کوہ کن" کی محبت کا نشہ اصلی نہیں، نقلی تھا۔ وہ درحقیقت دیوانۂ رسم و رواج تھا، تبھی تو وہ شیریں کی موت کی خبر پا کر، ایک آہِ جاں گداز کھینچ کر، از خود نہ مر سکا؛ بل کہ اسے تیشے کا سہارا لینا پڑا۔ میں ایسا عاشقِ صادق ہوں کہ مجھے حبیبہ کی موت کی محض خبر ہی، بے موت مار دے گی۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ!
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

دوسری جگہ اِرشاد فرماتے ہیں کہ "کوہ کن" پہاڑ کاٹ کر درحقیقت شیریں کی صورت گری و مجسمہ سازی کرتا رہا تھا؛ کیوں کہ محض سنگ سے سر ٹکرا کر، ایک انسان عشق میں کامل نہیں ہو سکتا اور نہ پتھر سے سر پھوڑ کر معشوق برآمد کیا جا سکتا ہے۔

کوہ کن نقّاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، اسدؔ!
سنگ سے سر مار کر، ہووے نہ پیدا آشنا

تیسری جگہ فرماتے ہیں کہ ''کوہ کَن'' ایک پیشہ ور سنگ تراش اور پتھر سے سر ٹکرانے والا ایک انسان تھا، نام کا عاشق اور اصل میں ایک حرفت پیشہ، اور ہر چند کہ پیشے میں کوئی عیب نہیں ہوتا؛ لیکن اس کو پکا عاشق نہیں کہا جا سکتا؛ البتہ اس سے اچھا اور سچا عاشق ہم شعر پیشہ اور آشفتہ سرانِ تاجرانِ عشق میں، ایک جواں سال میر تھا، وہ واقعتاً قابلِ صدرشک تھا۔

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں، وہ جواں میر بھی تھا (۵)

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے، کہ ہم شعرا حضرات عشق تو فرما سکتے ہیں اور بالفعل فرماتے بھی ہیں؛ لیکن عشقِ بلاخیز، اگر یہ دن دیکھنے پر مجبور کرے کہ پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کے عنوان سے جنابِ خسرو کی عشرت گاہ، یعنی محل کی مزدوری کرنی پڑے، تو اس طرح کی سرخ روئی و نیک نامی، فرہاد صاحب ہی کو مبارک ہو، یہ ہمارے بس کا روگ نہیں؛ کیوں کہ عشقِ صادق اور رقیب کے عشرت کدے کی مزدوری، کہ جوئے شیر لا کر اس کی زینت میں اضافہ کیا جائے، یہ

---

(۵) اس شعر کی شرح میں، یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بہت حد تک جانشین داغ دہلوی: سید وحید الدین بیخود دہلوی کی شرح دیوانِ غالب مسمّٰی بہ مرآۃ الغالب سے مستفاد ہے۔ دیگر شارحین نے ''جواں میر'' کے معنی جواں مرگ بتائے ہیں اور ''جواں مرگ'' سے ''فرہاد'' مراد لیا ہے اور شعر کا مطلب یہ بتایا ہے، کہ پیشے میں کوئی عیب نہیں ہوتا: اس لیے فرہاد کی سنگ تراشی بھی قابلِ عیب نہیں تھی: جواں مرگ فرہاد بھی ہمارے ہی ایسا عاشق آشفتہ سر و پریشاں حال تھا۔ لیکن غالب کے دیگر اشعار کی روشنی میں، جن میں وہ نام نہاد عشق کے حوالے سے احساسِ برتری میں مبتلا اور عاشقِ صادق فرہاد کو عموماً اپنے سے کم تر قرار دیتے نظر آتے ہیں، میرا دل کہتا ہے کہ یہاں بھی اُن کا مقصد فرہاد پر طنز ہی رہا ہوگا؛ اس لیے شعر کا دوسرا مطلب ذوق اور درایت کے زیادہ مطابق معلوم ہوتا ہے۔

بات باعثِ بدنامی تو ہوسکتی ہے؛ لیکن باعثِ نیک نامی ہر گز نہیں ہوسکتی۔

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

الغرض ''کوہ کن'' نے راہِ عشقِ ماجرا پرور و ستم گر میں، اپنی جانِ عزیز نچھاور کر کے، نہ صرف اپنا نام جریدۂ عالم میں رہتی دنیا تک کے لیے، سنہرے حروف اور جلی قلم سے، ثبت کر دیا؛ بل کہ اپنے سے منتسب جان دار، جیسے فتنہ پرور و محشر خیز شیریں اور جفا پیشہ و حسد شعار خسرو اور بے جان چیزیں، جیسے تیشہ (کلہاڑا) سنگ، کوہ اور جوئے شیر (دودھ کی نہر) ساری چیزوں کو شہرتِ دوام اور دنیائے عشق و سرفروشی میں عزّت و احترام سے سرفراز کر دیا۔

غالبؔ کی ظریفانہ شاعری اور لن ترانی آمیز غزلوں کے بعد، جب ہم شاعرِ اسلام، یعنی اقبالِ عالی مقام کی کلیات پر نظر ڈالتے ہیں، تو اُن کے ہاں فرہاد کی شناخت والی ساری چیزوں کی ''حرمت مآبی'' نمایاں طور پر نظر آتی ہے، کہ اقبال خود اسلام کے پیغامِ جاوداں کے ایک عزّت مآب عاشق تھے: اس لیے اُنھوں نے فرہاد کو اُسی حقیقت آشکار زاویے سے، سنجیدگی کی عینک سے دیکھا ہے، جس سے اُس کو دیکھنا چاہیے۔ سچ ہے ''ولی را ولی می شناسد'' یعنی کسی آدمی کی اصلیت کو وہی شخص تاڑتا ہے، جو خود اُسی جیسا ہو۔

''ضربِ کلیم'' میں ''اِیجادِ معنی'' کے عنوان کے تحت، ایک چھوٹی سی نظم میں علامہ اقبال کا ایک شعر یوں ہے:

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے، خانۂ فرہاد

پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس شعر کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ:

''سچ یہ ہے کہ مسلسل کوشش اور لگاتار محنت کے بغیر، انسان کی شخصیت کی کوئی خوبی ظاہر نہیں ہوسکتی؛ دیکھ لو فرہاد کا نام دنیائے عاشقی میں، اُس وقت روشن ہوا، جب اُس نے برسوں کی لگاتار محنت سے، پہاڑ جیسی چیز کاٹ کر رکھ دی۔''

اسی طرح کا ایک ولولہ انگیز شعر ''بانگِ درا'' میں ''جواب خضر'' کے عنوان سے ایک مسلسل اور طویل نظم میں ''زندگی'' کے ذیلی عنوان والے بند میں اِس طرح ہے:

زندگانی کی حقیقت، کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

(جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں) سے کوہ کن کی ناقابلِ تصوّر محنت و مشقت والی خاص زندگی کی طرف اِشارہ کرکے، علاّمہ اقبال یہ پیغام دینا چاہتے ہیں، کہ زندگی کی حقیقت جہدِ مسلسل ہے؛ لہٰذا کارگاہِ حیات میں سہولت پسند، عافیت طلب اور محنت سے جی چرانے والے بے توفیق لوگ، اپنی کوئی شناخت قائم نہیں کرسکتے۔ علاّمہ نے اپنے جمالیاتی اور پیغامی اسلوب میں ''جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں'' کی ایسی رونق افزا اور درس انگیز ترکیب استعمال کی ہے، کہ ''کوہ کن'' کے شعلۂ عشق کے ان تمام استعاروں کی

آبرومندی کو، چار چاند لگ گئے ہیں اور شعر کی پوری فضا ایسی خوش منظر بن گئی ہے، کہ زبان و بیان کی خوبیوں کی ذرا سی شُد بُد رکھنے والے کے لیے بھی، ممکن نہیں کہ اِس سے محظوظ نہ ہو۔

''تصویرِ درد'' کے عنوان کے تحت ایک طویل نظم میں، علاّمہ نے اِس مضمون کو کہ یہ ساری کائنات مظہرِ خدا ہے اور ہر شے میں اُسی کی حسن و خوبی اور کمال نظر آتا ہے۔ یہ شیریں، یہ فرہاد اور ایران کا وہ کوہِ ''بے ستوں'' جس کو کاٹ کر فرہاد نے ''جوئے شیر'' نکالی تھی: یہ سب کچھ اُسی کا پرتوِ حسن و جمال اور اُسی کی صنعت گری کا مظہرِ کمال ہے؛ اِس طرح ادا کیا ہے:

وہی اِک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے ستوں بھی، کوہ کن بھی ہے

ذرا غور کیجیے: اقبال نے کس طرح استعارۂ حسن: شیریں، استعارۂ عاشقی: کوہ کن اور استعارۂ محنت و مشقّت: کوہِ ''بے ستوں'' کو پرتوِ حسنِ خدائے بے نیاز و برتر بتایا ہے اور اِن خاکی استعاروں کو عروجِ افلاکی عطا کر کے، کس طرح اپنے تمام پڑھنے والوں کی نگاہِ حقیقت رسا میں پاکیزہ کر دکھایا ہے۔

''بانگِ درا'' میں تعلیم اور اُس کے نتائج'' کے عنوان کے تحت چار شعروں والی نظم میں علاّمہ نے کہا ہے کہ ''قوم کے نوجوانوں کی علمی ترقی سے میں بھی خوش ہوں؛ لیکن میری مسرّت میں رنج کا عنصر بھی شامل ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم حاصل کر کے، نوجوانوں کو سرکاری ملازمت تو بے شک مل جاتی ہے؛ لیکن اِس مغربی تعلیم کی وجہ سے اُن کے اندر اِلحاد کا رنگ بھی

پیدا ہو جاتا ہے۔" (۶)

اس نظم کا ایک شعر یہ ہے:

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

"پرویز" خسرو کے نام کا تتمہ ہے، اُس کا پورا نام "خسرو پرویز" تھا، جس کی ملکہ کا نام "شیریں" تھا، جس پر "فرہاد" یعنی "کوہ کن" عاشق تھا۔

یہاں اقبال نے "پرویز" سے مراد مغربی تعلیم یافتہ، شیریں سے مراد مغربی تعلیم، تیشۂ فرہاد سے مغربی تعلیم کی خرابیاں مراد لی ہیں۔ اقبال کہنا چاہتے ہیں کہ پیکرِ حسن: شیریں نے محل سرائے خسرو پرویز میں جلوہ نما ہو کر، نہ صرف اُسی کو؛ بل کہ اس کے علاوہ ایک عاشقِ بے مثال: فرہاد کو، مبہوت و مسحور تو کر دیا تھا؛ لیکن اُس کا خیرہ کن حسن کس کام کا تھا، جب اُس نے فرہاد ایسے عاشقِ وفادار کو تیشہ بہ کف کر کے اپنا کام تمام کر لینے پر آمادہ کر دیا تھا؟!۔ یعنی مغربی تعلیم اپنی ظاہری افادیت کی بنا پر، حوصلہ مند نوجوانوں کے لیے باعثِ کشش ہو تو ہو؛ لیکن اگر وہ الحاد و بے دینی پر مُنتج ہوتی ہے، تو اُس کا زیاں واضح ہے۔

اس شعر پر دوسرے زاویے سے غور کریں، تو اِس سے کوہ کن کی جاں سپاری کے پیچھے کارفرما ہاتھ، آلۂ خودکشی تک اُس کے ہاتھ کے بڑھ جانے کی وجوہات اور اُس کو فراہم کرنے والی سنگ دل و ستم ایجاد خاتون کا، اَتا پتا اور

---

(۶) شرح پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔

قتل ہو جانے کے لیے مکمل طور پر فضا ہموار کرنے والے وحشی دل انسانوں کی شناخت: بھی کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔

خلاصۂ گفتگو

پوری گفتگو —— جو لذیذ ہونے کی وجہ سے دراز ہوگئی اور طلبہ کے لیے بہ طورِ خاص مفید ہونے کی وجہ سے، دراز ہونے دی گئی —— کا خلاصہ یوں ہے:

''کوہ کَن'' فرہاد کا لقب ہے۔ مجازاً: عاشقِ صادق، جو اپنے عشق کے حوالے سے مشکل ترین؛ بل کہ ناممکن تصوّر کیے جانے والے کام کو، کر گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

فرہاد : ملکۂ اِیران: شیریں کا عاشق۔

شیریں : شہنشاہِ ایران: خسرو پرویز ہرمز بن نوشیرواں عادل کی ملکہ۔

کوہ کنی : مشکل یا تقریباً ناممکن کام انجام دینا۔

جوئے شیر لانا : کوہ کنی کا مترادف۔

غالب کا ایک شعر ہے:

کاوکاو سخت جانی، ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

یعنی شبِ فراق کی جاں گداز تنہائیاں اور مصیبتیں، ناقابلِ بیان ہیں اور

ہجر کی رات کو صبح تک گزار لینا، اتنا مشکل ترین کام ہے، جتنا فرہاد کا کوہِ ''بے ستون'' کو کاٹ کر، قصرِ شیریں تک جوئے شیر لانے کا عمل۔ ''کاوکاو'' کے معنی ہیں مشقت کے ساتھ سعی پیہم۔ شاعر نے سخت جانی کی وجہ سے اپنے آپ کو ''کوہ کن'' سے، شبِ ہجر کی تاریکی اور سختی کو پہاڑ کاٹنے اور جوئے شیر لانے کے عمل سے اور سپیدۂ صبح کو، جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔ (۷)

تیشہ : بسولا (۸)، کلہاڑی (۹)۔

برسرِ مطلب

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور عربی زبان کے عشق سے، جس طرح سرشار رہے اور اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کے ذریعے، جس طرح ان دونوں کی خدمت کے لیے، اپنے آپ کو وقف کیے رکھا اور اس سلسلے میں جس طرح جان وتن سوخت کیا، نیز جوانانِ مدرسہ کی ہمہ گوشہ تربیت کے ذریعے، صحت وعافیت کو تج کر، باصلاحیت افراد کی ایک پوری نسل تیار کردینے کا، جو ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا اور طلبۂ دارالعلوم کو خصوصاً اور دارالعلوم سے مربوط ہزاروں مدرسوں کے طلبہ کو بالواسطہ اور عموماً تہذیب وشائستگی، سلیقہ وطریقہ، احساسِ ذمے داری، محنتِ پیہم اور جوشِ

(۷) دیکھیے ''بیانِ غالب'' شرحِ دیوانِ غالب۔ از: آغا محمد باقر ایم اے، ط:۱۹۳۹ء۔

(۸) دیکھیے ''فیروز اللغات'' از: مولوی فیروز الدینؒ

(۹) ''بیانِ غالب''۔

عمل سے سرشار رہنے کا، جو آبرومندانہ درس دیا؛ کتاب کے عنوان سے اِن ہی سب باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے، کہ اس معیار و مقدار کے ساتھ بہ ظاہرِ حال، اُن کے اختصاص کی سمتوں کے حوالے سے، اُن کی طرح خدمت کرنا، آسان کام نہیں۔ ایسی جاں سوزی، کوہ کنی اور جوئے شیر لانے کا عمل، اُنھی کا حصّہ تھا۔

روحِ غالبؔ سے معذرت کے ساتھ اور اُن کے ''میرے'' کو ''تیرے'' کرکے، قدر شناسانِ ''وحید'' یہ مندرجۂ ذیل اشعار پڑھ سکتے ہیں:

شمع بجھتی ہے، تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا ''تیرے'' بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا ''تیرے'' بعد

☆ ☆ ☆

کتاب میں کچھ حک و اضافے کی ضرورت کا راقم الحروف کو شدید احساس تھا۔ ارادہ تھا کہ اسی دوسرے ایڈیشن میں یہ کام کرلیا جائے گا؛ لیکن ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں پہلے ایڈیشن کے ختم ہو جانے کی وجہ سے، اِن سطور کی تحریر کے وقت تک پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں ایک ماہ سے زیادہ کا فاصلہ واقع ہو چکا ہے؛ طباعت و تجلید و ترسیل کے عمل سے گزرتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا مزید فاصلہ، درآنے کا قوی اندیشہ ہے اور کتاب کی زبردست مانگ، مزید کسی تاخیر کی متحمل نہیں؛ اِس لیے صرف اِسی ضروری

مقدمے کے اضافے اور معمولی سی طباعتی غلطیوں کی تصحیح کے ساتھ، کتاب کو سپردِ مطبع کیا جارہا ہے۔ اِن شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں مزید تنقیح و اضافے سے دریغ نہ ہوگا۔

امید ہے کہ ناظرینِ کرام کو، اِس مقدمے کے ساتھ، یہ کتاب پہلے سے زیادہ دل چسپ اور پسندِ خاطر محسوس ہوگی۔

نور عالم خلیل امینی

استاذ ادبِ عربی و مدیر الداعی، دار العلوم دیوبند

جمعہ ۱۰/۵/۱۴۱۶ھ = ۶/۱۰/۱۹۹۵ء

حرفِ اول

ذیل کی سطروں میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانویؒ سابق استاذ و ناظم تعلیمات و معاون مہتمم دارالعلوم دیو بند کی، کوئی با قاعدہ سوانح نہیں؛ بل کہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اُن کے سلسلے میں اپنے ذاتی تأثرات واحساسات، ان کے ساتھ اپنے روابط وتعلقات اور اپنے اوپر، نیز نو جوانانِ مدرسہ کی ایک پوری نسل پر، ان کے گراں قدر، دور رس اور دیر پا احسانات واثرات کو تحریری شکل میں ریکارڈ اور محفوظ کر دیا جائے۔ تا کہ تحتی برِ اعظم کے ثقافتی اور ادبی اداروں، تحریکات اور ادب وثقافت اور تعلیم وتربیت کے حوالے سے قائدانہ رول ادا کرنے والی شخصیات پر سنجیدگی اور تحقیق وجستجو سے لکھنے والوں کو، کچھ ضروری مواد کے اخذ واستنباط اور تحلیل وتجزیے میں، مستقبل میں کچھ آسانی محسوس ہو۔

حضرت مولاناؒ جیسے تاریخ ساز ومردم ساز اور عہد آفریں انسان پر، جو شب و روز کے عام واقعات کی طرح نہیں؛ بل کہ جو گویا ''خرق عادت حادثات'' اور ''غیر معمولی واقعات'' کے دائرے میں آتے تھے، بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جائے گا، کہ ان کے خوشہ چینوں، شاگردوں اور محبین و معتقدین کے وسیع حلقے میں، ایک سے بڑھ کر ایک اہلِ قلم اور صاحبِ ادراک

مصنف و مؤلف موجود ہیں۔

لیکن ضروری نہیں، کہ ایک قد آور شخصیت کی خوبیوں اور کمالات کے تمام ضروری گوشوں تک، ہر ایک کی خوردبین نظر بالیقیں پہنچ جائے اور ہر گوشے کے اُن تمام اجزائے برہم پر، اس کی نگاہ بالضرور پڑ جائے، جن سے اس گوشے کے خدوخال کی تشکیل اور اس کے دائرے کی حد بندی ہوتی ہو؟۔ پھر ہر ایک کا زاویۂ نگاہ، نتیجہ اخذ کرنے کا طریقہ اور مطالعہ و تجزیہ کی طرز جداگانہ ہوتی ہے۔ بعض دفعہ ایک مؤرخ اور محقق ایک واقعے سے، ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے اور دوسرا اُس سے بالکل مختلف۔ یہی نہیں؛ بل کہ بعض دفعہ ایک شہیدِ جستجو محقق کی عقابی نگاہ، کسی بلند و بالا انسان کے بعض ضروری گوشوں تک نہیں پہنچ پاتی؛ لیکن ایک خُرد سال اور ہیچ مداں طالب علم بڑی آسانی سے انھیں دیکھ لیتا اور اپنے الفاظ میں اُن کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

اِن سطروں میں مولاناؒ کو اپنے ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے؛ اس لیے ان کی عظمت و عبقریت کے منکرین یا معترفین کو اس تحریر کو پڑھتے وقت، اگر کسی جگہ مایوسی دامن گیر ہو، تو اس کے لیے راقم الحروف معذرت خواہی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میرے دل کی آواز، میری نگاہوں کی شہادت، ضمیر کی صدا اور ''ظرفِ قدح خوار'' کا ترشح ہے وَ کُلُّ إِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْهِ۔ (ہر برتن سے وہی کچھ ٹپکتا ہے، جو اس میں ہوتا ہے)

جو آدمی کسی کام کا نہیں ہوتا، اس کا عیب و ہنر چھپا رہتا ہے اور ایسا شخص

کسی کی ثنا خوانی اور نکتہ چینی کا محل نہیں ہوتا؛ لیکن جو انسان جس درجے کام کا ہوتا ہے، اُسی درجے قدر دانوں کی مدح سرائی کا مستحق اور ناقدین کی عیب جوئی کا ہدف بنتا ہے۔ مولاناؒ جیسے انسان کے لیے، جو ہمہ جہت اور متنوع صلاحیتوں کا مالک، مختلف میدانوں میں تیز دوڑنے والا اور بغیر پڑاؤ کیے، صحرائے عمل کو طے کر لینے، بہ یک جست منزل تک جا پہنچنے اور وسیع تر دائرۂ عمل کو عجیب وغریب قوتِ کار کے ذریعے، بہ یک لمحہ سمیٹ لینے کا عادی رہا ہو، ضروری تھا کہ فطرت کے اِس آئین اور انسانی معاشرے کے اِس مکرر تجربے سے مستثنیٰ نہ رہے۔

مولاناؒ فرشتہ نہیں تھے، کہ ہر انسان مادہ وروح سے مرکب ہے اور ہر ایک کے ساتھ، دونوں عناصر کے تقاضے موجود اور معرضِ ظہور میں آنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں؛ اس لیے میں نے اُنھیں فرشتہ نہیں؛ بل کہ انسان ہی ثابت کیا ہے؛ لیکن معلمِ انسانیت رحمۃ للعالمین ہادیِ عالم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں؛ بل کہ انسانوں کو تعلیم دی ہے کہ انسان کی خرابیوں کو نظر انداز کر کے، اس کی خوبیوں کو نگاہ میں رکھا جائے —— کہ

مَنْ ذَا الَّذِیْ مَا سَاءَ قَطْ

وَمَنْ لَهُ الْحُسْنَی فَقَطْ؟

(کون ہے جس سے کبھی کوئی قصور نہ ہوا ہو اور کون ہے جس کے پلڑے میں صرف نیکی ہو)

میری نگاہِ نارسا میں یہ مربیِ جلی جیل اور استاذ جلیل، خوبیوں کا بحرِ بے

کنار تھے؛ اس لیے میں نے صرف اِسی پہلو پر نظر ڈالی ہے:

میں نے اپنے آشیانے کے لیے
جو چبھے دل میں، وہی تنکے لیے

یا بہ قولِ غالب:

ع دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اِس تحریر میں حضرت مولاناؒ کے حالات، ان کے کارنامے، ان کے سلسلے میں اپنے تأثرات و مشاہدات اور نتائج و استنباط کے ساتھ، اپنے ذاتی حالات، ماضی کے بیتے ہوئے اہم واقعات و حادثات، بعض ہم عصر دوستوں، ہم سبق ساتھیوں، بعض مخلص مربیوں اور محسنوں اور مولاناؒ کے بعض اہل تعلق کے تذکرے؛ اس طرح ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں، کہ ایک کو دوسرے سے علاحدہ کرنا مشکل ہے اور میں نے بہت سی ذیلی باتوں اور حالات کے تذکرے کی بے ساختہ آمد پر روک لگانے سے گریز کیا ہے، کہ اِس طرح ایک تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔

جن دوستوں، بزرگوں اور محسنوں کا ذکر، قلم کی زبان پر آ گیا ہے، حاشیے پر اُن کا مختصر اور دل چسپ تعارف بھی دے دیا گیا ہے؛ تا کہ جو گم نام ہیں، ان کا نام حضرت مولاناؒ کے نام سے جڑ کر زندہ و جاوید بن جائے اور جو مشہور و معروف ہیں، ان کے نام سے یہ تحریر بھی مبارک و منور ہو جائے۔ اِس طرح یہ عُجالہ سرسری تذکرے کے بہ جائے ایک تحقیقی سا مقالہ بن گیا ہے، جس میں ذکر کردہ واقعات کی بڑی حد تک تاریخی تعیین کے ساتھ ساتھ، اشخاص کے متعلق

معلومات میں، دقتِ نظر اور صدق بیانی سے کام لیا گیا ہے اور سخن سازی و لفظی صنعت گری اور الفاظ کے اِسرافِ بے جا سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت الاستاذؒ کی قائم کردہ (النادي الأدبي) کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔ لیکن زبانِ محمدی، تہذیبِ حجازی اور ثقافتِ عربی کی عکاس، اس مبارک انجمن کی گفتگو میں محبت، عقیدت، خلوص اور بے تکلفی کا رنگ کچھ اِس طرح بھر گیا ہے اور اُس کی بوئے روح افزا، احوالِ واقعی کی گزارش میں، اس طرح سما گئی ہے کہ زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والے اور دارالعلوم کے ایک عاشقِ صادق کے لیے، یہ طرز بیان پر کشش اور دلبرانہ بن گئی ہے، جس کی وجہ سے امید کی جاتی ہے، کہ ایک باذوق قاری اس داستانِ جمیل کو شروع کرنے کے بعد، اسے مکمل پڑھے بغیر، شاید کتاب کو دست انداز نہ کر سکے۔ "النادي الأدبي" کی گفتگو میں دراز نفسی کو بالقصد، اس لیے راہ پانے دیا گیا ہے، کہ یہ نہ صرف زبان وادب کے حوالے سے مولاناؒ کی بے حساب سرگرمیوں کا عرصے تک مظہر رہی تھی؛ بل کہ "جوانانِ مکتب" کو سنوارنے، بنانے اور کام میں لگانے کی اصل تربیت گاہ بھی یہی تھی۔ یہ صرف ایک بزمِ ادب و ثقافت ہی نہیں؛ بل کہ مولاناؒ کے زرخیز ذہن نے اسے ایک جامع ترین مدرسہ بنا دیا تھا۔

راقم الحروف کو اپنے گاؤں کے مکتب سے اعلیٰ تعلیم کے مراحل تک، متعدد مدرسوں میں ایک سے بڑھ کر ایک خوش خصال، ماہرِ فن، صاحبِ نسبت، زاہدِ شب بیدار اور "الفاظ میں سادہ، معانی میں دقیق" خوش اوقات

بزرگوں سے تعلیم حاصل کرنے کی سعادت حاصل رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کا، اس کی گردن پر جو احسان ہے، اُس سے وہ ہزار کوشش کے باوجود سبک دوش نہیں ہوسکتا۔ خدائے کریم ہی ان سب کو اپنی شان کے مطابق جزائے خیر دے۔ آمین۔

لیکن حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی ذات وصفات نے اس کے فکر و نظر کو جس طرح صیقل اور عقل و خرد کو جس طرح روشن و تاب ناک بنا دیا، اس کا اعتراف نہ کرنا، بڑی ناسپاسی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم ایسے لوگ جو کچھ ہیں، جہاں ہیں اور جس طرح ہیں: خدا کی حکمت و توفیق کے طفیل، مولاناؒ کی صنعت گری کی دین اور اُن کے علم و آگہی کی دُردِ تہِ جام ہیں۔ اس لیے مولاناؒ ہمارے قلم اور زبان کے اعصاب پر نہ صرف پیشِ نظر تحریر میں؛ بل کہ آئندہ بھی موقع بہ موقع چھائے رہیں، تو کچھ عجیب نہیں:

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کو، پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے، کافر کہے بغیر

سازِ مضطرب کی آواز، دلِ بے تاب کی صدا، بلبل کی نوا، عاشق کی آہ، کسی خارجی محرک کی شرمندہ اور زمان و مکان کی پابند نہیں ہوتی؛ بل کہ از خود ابلتی اور مچلتی رہتی ہے —— لہٰذا:

ہم پرورشِ لوح و قلم، کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے، رقم کرتے رہیں گے

کتاب میں شروع سے آخر تک، طرزِ تعبیر و اسلوبِ تحریر میں، بے تکلفی

اور برجستگی کا عنصر غالب رہنے دیا گیا ہے اور کسی ذہنی تحفظ کو دخل در معقولات کرکے، زبان و بیان کی بے ساختگی کا خون کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ گویا قارئین کو اِس کتاب میں روایتی اسلوبِ نگارش سے، جس میں قلم کے ایک مسافر کو ''قید و بند کی صعوبتوں'' سے گزرنا پڑتا ہے، خاصا ''خوش آئند انحراف'' نظر آئے گا۔ کتاب میں اُردو کے مُروّجہ جدید قواعد و رموزِ املا کی بھی، حتی المقدور پابندی کی گئی ہے۔ لہٰذا اِس سلسلے میں بھی یہ کتاب طلبہ کے لیے سبق آموز بن گئی ہے۔

اِس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ بالارادہ نہیں؛ بل کہ بے ارادہ وجود میں آگئی ہے۔ راقم نے ایک ہلکے اور کوتاہ نفس مقالے کے ارادے سے قلم اٹھایا تھا؛ لیکن قلم روانی کے ساتھ آگے بڑھتا گیا اور مقالہ دراز نفس ہوگیا۔ چوں کہ کسی رسالے اور جریدے میں اتنے ''کشیدہ قامت'' مضمون کی گنجائش، خارج از امکان تھی اور قطع و برید سے، اس کے ''تنِ شاہیں'' سے ''عقابی روح'' کے پرواز کر جانے کا اندیشہ تھا؛ اِس لیے اسے کتاب کی شکل میں طبع اور شائع کرنے کا ارادہ کرلیا گیا۔ گویا کتاب کی ذات ''طبع زاد'' اور اس کی شکل و صورت ''خانہ ساز'' ہے۔ بہ ہر کیف، یہ جو کچھ ہے، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر نذرِ قارئین ہے۔

نور عالم خلیل امینی
استاذ ادبِ عربی و مدیر الداعی، دارالعلوم دیو بند

دوشنبہ ۱۲/۱/۱۴۱۶ھ = ۱۲/۶/۱۹۹۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمھی سو گئے داستاں کہتے کہتے

۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۶/ اپریل ۱۹۹۵ء یک شنبہ کو تقریباً بارہ۔ ایک بجے میں اپنے گاؤں (ہرپور بیشی۔ اَورائی۔ مظفر پور۔ بہار) کی جامع مسجد کے شمالی جانب کے کمروں کی پہلی منزل کی چھت ڈلوا رہا تھا، کہ ایک طالب علم صورت آدمی کو دیکھا کہ مسجد کے نیچے سڑک پر سائکل کھڑی کر کے، تیز گام مسجد کے اندر میری طرف بڑھا آرہا ہے۔ اس نے علیک سلیک اور مصافحے کے ساتھ ہی ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: یہ خط قاری شبیر احمد صاحب مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواره، دربھنگہ (بہار) نے آپ کو لکھا ہے۔

میں نے پہلے تو یہ سمجھا، کہ شاید اُن کے مدرسے میں جلسے وغیرہ کی کوئی تقریب ہوگی، جس میں انھوں نے مجھے مدعو کیا ہوگا؛ لیکن جلدی میں خط پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی، تو معلوم ہوا کہ آج شب میں گیارہ بجے دیوبند سے فون پر، اُن سے پرزور درخواست کی گئی ہے، کہ مجھے کسی فرستادے کے ذریعے، علی الفور یہ خبر کروادیں کہ آج مغرب بعد، حضرت الاستاذ مولانا

وحید الزماں صاحب کیرانویؒ، دہلی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔

میں نے گھر ہی پر مولاناؒ کی وفات سے دو تین روز قبل، شب کو خواب میں دیکھا، کہ مولاناؒ کی عیادت کو پہنچا ہوں، مولاناؒ ہسپتال سے گھر آ گئے ہیں اور اُن کی اسی حالت میں، اُن کے ہاں جشنِ طرب کی ہمہ ہمی ہے اور برادرم مولوی صدر الزماں و مولوی قدر الزماں صاحبان مختلف جگہوں پر فون کرنے میں مشغول ہیں۔ یہ لوگ اتنے مشغول ہیں کہ توقع اور عادت کے برخلاف میری طرف ملتفت نہیں ہو سکے۔ میں نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا، کہ یہ اتنی بھیڑ کیوں ہے؟ تو اُنھوں نے بتایا، کہ مولاناؒ کے بڑے صاحب زادے کی صاحب زادی کی تقریبِ شادی ہے۔ میں واپس آ گیا، لیکن متعجب رہا، کہ تقریب ہی سہی، ان لوگوں نے مولاناؒ کے بیمار ہوتے ہی، مجھے اس طرح کیوں بھلا دیا، کہ تقریب میں شرکت کے لیے، مجھے یاد تک نہ کیا؟ باہر نکلنے کے بعد مجھے بہت مشکل سے سواری ملی اور خاصی دور تک پیدل چلنا پڑا۔

میں صبح کو نیند سے بیدار ہوا، تو طبیعت پریشان رہی اور دل میں کھٹکا سا لگا رہا، کہ حضرتؒ کو شدید بیمار چھوڑ کر آیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات ضرور پیش آ چکی ہے۔

بہ ہر کیف اس وحشت اثر خبر سے دل و دماغ کی دنیا بدل گئی، زبان مقفل سی ہو گئی اور ذہن کچھ دیر کے لیے ایسا مفلوج سا ہو گیا، کہ میرے پاس گاؤں کے چند معزز اشخاص جو موجود تھے اور جنھوں نے میرے چہرے پر غم

واندوہ کے آثار نمایاں دیکھے، ان کے استفسار واصرار کے باوجود، میں انھیں کافی دیر تک یہ بتانے پر قادر نہ ہو سکا، کہ کون سے حادثے کی خبر مجھ پر بجلی بن کر گری ہے۔

میں سایۂ شفقتِ پدری سے، شیر خوارگی میں ہی محروم ہو گیا تھا؛ لیکن یتیم رہنے کے باوجود "یُتم" کی تلخیوں کا مجھے ماضی میں کبھی بامعنی ادراک نہیں ہو سکا تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ سر سے سایۂ پدری کے اٹھ جانے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ یقیناً کچھ ایسا ہی احساس مجھ جیسے ہزاروں بادہ خوارانِ مے کدۂ وحیدی کو بھی ہوا ہوگا:

آنکھوں میں بس کے، دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی ، جگا کر چلے گئے
میری حیاتِ "عشق" کو دے کر، جنونِ شوق
مجھ کو تمام ہوش ، بنا کر چلے گئے
سمجھا کے پستیاں مرے "اوجِ کمال" کی
اپنی بلندیاں ، وہ دکھا کر چلے گئے
شکرِ کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا کیوں نہ مجھ کو ، بنا کر چلے گئے

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا

اواخرِ مارچ میں "جیون نرسنگ ہوم" دہلی میں (جہاں وہ پہلے سے زیر

علاج تھے) اچانک ایک روز طبیعت اس قدر ناساز ہوگئی کہ معالجین تقریباً مایوس ہوگئے اور انھیں ایمر جنسی وارڈ کے خصوصی دیکھ ریکھ والے کمرے میں لے جایا گیا، دہلی و دیوبند میں اعزہ و معتقدین و محبین دعا و تضرع میں مشغول ہو گئے، ادھر عیادت کنندوں کا تانتا بندھ گیا۔ اُن دنوں متعدد بار یہ ناچیز بھی عیادت کو گیا؛ لیکن حضرتؒ کی دید سے محروم ہی رہا، اعزہ سے مزاج پرسی کر کے واپس آ گیا۔ وسط مارچ میں مذکور الصدر ہسپتال میں بیماری کے شدید حملے سے دو تین روز قبل، اُن کی عیادت کو آیا اور ایک گھنٹے تک حاضرِ خدمت رہا، اُس وقت مختلف موضوعات پر انبساط کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ حضرتؒ سے ان کی زندگی میں، یہی میری آخری ملاقات تھی۔

مرض کی اِس شدت کے چند روز بعد مجھے سابقہ ضروری پروگرام کے مطابق، وطنِ مالوف مظفر پور جانا پڑا۔ اس موقع سے بھی مزاج پرسی کے لیے ہسپتال پہنچا؛ لیکن سوئے اتفاق کہ ڈاکٹروں کی طرف سے کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ میں وطن گیا؛ لیکن ڈاکٹروں کی طرف سے خدشے کے اظہار کی وجہ سے دل میں کھٹکا سا لگا رہا اور آخرش زندگی بھر کے مثالی تعلقات کے باوجود، خدا کی حکمت کہ آخری دید سے محروم ہی رہا، جس کا غم ہمیشہ ناسور بن کر ٹپکتا رہے گا۔

کس قدر آساں ہے موت

مرحوم سال ہا سال سے شکر کے مریض تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ سن و سال کے ساتھ ساتھ، مرض میں شدت ہوتی گئی؛ لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی

موت بہت کچھ ''خانہ زاد'' تھی، یا کہیے کہ ان کے اپنے کیے دھرے کا انجام ——— دراصل انھوں نے ''کار جہاں'' اور ''خاراشگافی'' میں اپنے جسم وروح اور ذات وصفات سے، جس طرح پیہم و بے حساب کام لیا، وہ منطقی طور پر ان کے ''دولتِ مستعجل'' ہونے پر منتج ہوئی۔

ادھر دو تین سال سے اس موذی اور دیرینہ سال مرض نے مزید بال و پر نکال لیے تھے۔ وقفے وقفے سے ان پر مرض کا شدید حملہ ہوتا رہا اور طرح طرح کی پیچیدگیاں اور نئے نئے عوارض نمودار ہوتے گئے۔ مرض نے طول پکڑا، تو اعزہ و مخلصین کا مشورہ ہوا کہ ایک آدھ مرتبہ ''جیون نرسنگ ہوم'' کے بہ جائے کسی اور اسپتال کو آزمایا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹروں کی تبدیلی سے فرق پڑے؛ چناں چہ لوگوں کے اصرار پر گزشتہ ماہ شعبان (۱۴۱۵ھ) کے اواخر میں ''گووندولبھ پنت'' اسپتال کے ''وی. آئی. پی. وارڈ'' میں عرصہ ایک ماہ تک داخل رہے، عالمی شہرت یافتہ ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر خلیل اللہ کو، اللہ جزائے خیر دے، کہ انھوں نے اُن کے علاج و معالجے کے سلسلے میں خصوصی دل چسپی لی، تقریباً روزانہ ہی وہ بہ ذاتِ خود دیکھنے آتے رہے۔ وہاں علاج سے فوری طور پر جسم کا ورم قدرے کم ہوا اور اشتہائے طعام، جو بالکل مفقود ہوگئی تھی، اس میں کچھ فرق پڑا۔ رمضان کے اوائل میں دیوبند آگئے؛ لیکن طبیعت سنبھلی نہیں اور پھر سابقہ کیفیت عود کر آئی۔ چناں چہ شروع شوال میں پھر جیون اسپتال میں داخل ہوے۔ برادران، فرزندان اور خویش و اقارب نے ان کی دیکھ ریکھ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، دن کو دن، رات کو رات نہ جانا، ہر

طرح کے جتن کیے؛ لیکن ایک پیش نہ گئی اور دورِ آخر میں سرمایۂ تعلیم و تربیت کا یہ نگہبان، ہم سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا۔ جو دوسروں کے لیے سہارا تھا، وہ آج ہر سہارے سے بے نیاز ہوگیا۔

ع ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو بھی مٹ گیا

اب تک ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ہماری اس دنیا سے نہیں گئے، کہیں سفر پر گئے ہیں، ابھی آنے کو ہیں —— آہ! زندگی اور موت کے بیچ کتنا کم فاصلہ ہے؟ دنیا میں موت کتنی سستی، یقینی اور ہر وقت اور ہر جگہ آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اور ایک نہ ایک دن ہر جان دار کو اس کا مزہ چکھنا ہے "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (العنکبوت/ ۵۷)

کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم، ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں، موت
دشت و در میں، شہر میں گلشن میں، ویرانے میں موت

(علامہ اقبال)

لیکن ایسا لگتا ہے کہ موت بھی اپنا شکار منتخب کرنے میں، دقتِ نظر سے کام لیتی اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا کرتی ہے؛ چناں چہ اکثر لاخیرے، دوشِ ہستی کے لیے بارِ گراں اور لوحِ جہاں پہ "حرفِ مکرر" قسم کے لوگ، بے تکان عرصۂ دراز تک جیے چلے جاتے ہیں، جب کہ "مردِ خلیق" و "گرہ کشا" اور "کارساز" بہت جلد رختِ سفر باندھ لیتا ہے:

ہزار پھولوں سے آباد ، باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ ، فقط ایک کو ترستی ہے

شمع اور پروانے

مولاناؒ کی رحلت، تعلیم وتربیت کے میدان کے عام شہ سواروں، برِصغیر کے اسلامی مدرسوں، جامعات اور دانش کدوں کے دیگر اساتذۂ کرام کی رحلت کا کوئی معمولی واقعہ نہیں؛ بل کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں غیر معمولی انقلابی کارناموں والی شخصیت کی رحلت کا، غیر معمولی اندوہ ناک واقعہ ہے، جس نے ہزاروں دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، کہ وہ علم وفن سے زیادہ اور تعلیم وتربیت کے سوا بھی متعدد میدانوں میں، نقوشِ جاوداں چھوڑ گئے اور صرف چار دہوں کی قلیل مدت میں ''جوانانِ مکتب'' کی بے شمار تعداد کو زبان و ادب، تحریر وتقریر، فکر ونظر، تبلیغ و دعوت اور اخلاق وآداب کے ہتھیاروں سے، اس طرح لیس کر دیا کہ اس کی مثال دورِ آخر میں، چشم فلک نے بہت کم دیکھی ہوگی —— ان کی تربیت کے نتیجے میں مدرسی زندگی کے دھارے بدل گئے، ان کے فیضان سے نہ جانے کیسے کیسے عزائم بیدار ہوئے اور کتنے ولولے دلوں میں تڑپنے لگے۔ انھوں نے ہمارے خون کو جس خلوص، جاں سوزی اور دل نوازی کے ساتھ رگوں میں دوڑنا سکھایا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ خود ہماری آنکھوں سے، خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔

ع ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

دوستوں نے بتایا کہ ان کی موت کی خبر، جیسے ہی دیوبند پہنچی، ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ ان کی نعش اواخرِ شب میں دیوبند پہنچ سکی؛ لیکن عشا کے وقت ہی سے علما، طلبہ، اساتذہ اور اہالیانِ دیوبند کا سیلاب، ان کی آخری دید کے لیے امنڈ پڑا اور تعزیت کرنے والوں کا تانتا ٹوٹنے نہ پاتا تھا۔ ہر ایک سراپا شوق بنا ہوا، وارفتہ قدموں کے ساتھ، بھاگا چلا آ رہا تھا اور گویا ہر ایک زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ——— کہ

آتا ہے ایک پارۂ دل، ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس ، کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت ! کنارہ کر، اے انتظام ! چل
سیلابِ گریہ، درپئے دیوار و در ہے آج

۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۶/ اپریل ۱۹۹۵ء کو تقریباً گیارہ بجے دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں (جس کے بام و در نے نہ جانے کتنی مرتبہ، ان کی انقلاب آفریں تقریروں کی بلائیں لی تھیں) ان کی نمازِ جنازہ میں ایک محتاط اندازے کے مطابق بارہ۔ پندرہ ہزار کے چیدہ و برگزیدہ مجمع نے شرکت کی۔ اتنی بڑی تعداد، دورِ آخر میں، دارالعلوم کے بہت کم بزرگوں کے جنازے میں شریک ہوئی ہوگی۔ نمازِ جنازہ، دارالعلوم کے استاذِ حدیث مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی (۱۰) نے پڑھائی۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب

---

(۱۰) مولانا نعمت اللہ صاحب قاسمی اعظمی، کشیدہ قامت، نحیف الجسم، سفید رنگ، متواضع، سادہ طبیعت، نیک طینت: پورہ معروف، ضلع مئو ناتھ بھنجن (سابق اعظم گڑھ) وطن ہے۔ ۱۳۷۲ھ میں دارالعلوم سے ←

الرحمٰن صاحب، اپنے وطن ''بجنور'' تھے؛ لیکن حادثے کی اطلاع ملتے ہی، علی الصباح دیو بند آ گئے اور مولاناؒ کے پس ماندگان سے اظہارِ تعزیت اور جنازہ و تدفین میں شریک رہے۔ تابوت میں بڑی بڑی بلیاں باندھ دی گئی تھیں، اس کے باوجود، کاندھا دینے والوں کے ہجومِ بے پناہ کی وجہ سے وہ ناکافی ہو رہی تھیں۔ بالآخر اس ''میرِ کارواں'' کو ہزاروں سوگواروں نے باچشم نم و بادلِ پُرغم ''مقبرۂ قاسمیہ'' میں اسلافِ کبار کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا۔

جمع کر رہا ہوں جگرِ لخت لخت کو

اب کسی کو کس طرح بتاؤں کہ نوجوانانِ مسلم اور عشاقانِ زبانِ محمدی و تہذیبِ حجازی کے لیے، مولاناؒ کیا تھے اور کیا نہ تھے:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ، کہ ہم بتلائیں کیا؟

خوابیدہ صلاحیتوں کے لیے مرغِ سحر، افسردہ دلوں کے لیے مرغِ چمن، مردہ ضمیروں کے لیے حرارتِ نَفَس ہائے مسیح، کسل مندوں کے لیے بانگِ درا، ناشکیبوں کے لیے ضربِ کلیم، شرمندگانِ ساحل کے لیے بحرِ بے کراں،

← فارغ ہوئے، اس کے بعد دو سال تک شعبۂ فنون میں داخل ہو کر، مختلف علوم و فنون کے سلسلے میں اپنی علمی پیاس بجھائی۔ مطالعہ اور کتب بینی کے رسیا ہیں۔ علوم و فنون میں کامل دست گاہ حاصل ہے۔ علم حدیث سے خاص شغف ہے۔ اسماء الرجال پر دقیق نظر رکھتے ہیں۔ خوش مزاجی، نرم خوئی اور استحضارِ علم کی وجہ سے طلبہ میں مقبول ہیں۔ ۱۳۷۵ھ سے آسام، گجرات، مئو، کوپاگنج اور بنارس وغیرہ کے مختلف مدرسوں میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۴۰۲ھ-۱۹۸۲ء سے دارالعلوم میں درجۂ علیا کے استاذ ہیں اور مسلم شریف، ابوداود شریف، بیضاوی شریف، مسامرہ، تقابلِ ادیان وغیرہ مضامین اور کتابیں، ان کے زیرِ تدریس ہیں۔

مغلوبانِ گماں کے لیے یقینِ محکم اور اسیرانِ آرزو کے لیے عملِ پیہم۔

جب بھی جی نہ لگتا، تو مولانا کے پاس جاتا اور تخمِ عمل اور نخلِ فکر و نظر کے لیے، ہمیشہ سازگار آب و ہوا کی ایک بڑی قسط لے کر واپس آتا۔ ناامید جاتا اور دل کے لالۂ افسردہ کو آتش قبا کر کے واپس آتا۔ کوئی خوشی ہو یا غم، ان سے ضرور ملتا؛ کیوں کہ وہ خوشی کو دوبالا اور غم کے لیے زود اثر مرہم، ہم دست کر دیتے۔

بعض دفعہ ملنے کا وقفہ دراز ہو جاتا؛ لیکن اِس احساس سے خوش رہتا کہ وہ موجود ہیں، جب چاہوں گا، ملاقات ہو جائے گی۔ آہ! اب کس کے پاس اس اعتماد و یقین کے ساتھ جائیں گے کہ ان شاء اللہ نہ صرف یہ کہ تشنہ کام نہیں آئیں گے؛ بل کہ غیر حاضری کے اس عرصے میں، صحرائے زندگی نے، جو کانٹے چبھو دئے ہیں، ان شاء اللہ سبھی یک لخت نکل جائیں گے۔

انسان کا اصل خمیر "اُنس" سے اٹھایا گیا ہے، وہ کسی بھی معاشرے میں رہتا ہو اور کسی بھی شعبۂ زندگی میں سرگرمِ عمل ہو، اس کو ایک ایسے مونس و غم خوار کی تلاش ہوتی ہے، جس کے سامنے اپنی ساری روداد ہائے حیات، بے کم و کاست سنا سکے اور اِس یقین کے ساتھ کہ مستیٔ سرور اور جاں کاہیِ غم، دونوں کا شافی نسخہ اُس کو، اِس طبیبِ ہم درد سے ضرور مل جائے گا۔

پارہ ہائے دل کو یک جا کر کے، خراجِ عقیدت کی یہ سطریں لکھنے کے لیے بہ مشکل تمام اپنے آپ کو تیار کر سکا ہوں، تو حیران ہوں کہ حضرتؒ کے متعلق بات کہاں سے شروع کروں، کیا کہوں، کیا نہ کہوں —— کہ

ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

ستارۂ بلند اقبال

تقریباً سات دہائیوں تک، ان کا ستارۂ بلند اقبال، برصغیر کے افق پر جگمگاتا رہا اور اپنی زندگی کی کم وبیش چار دہائیوں تک اسلامی مدرسوں اور جامعات کے منہاجِ تعلیم وتربیت کے حوالے سے، وہ عصریت وجدیدیت اور روایت پسندی وجدت کاری کی کش مکش سے، ہوش مندانہ طور پر نمٹنے کے لیے، خردمندانہ انقلاب واقدام کے نقیب بنے رہے۔ عربی زبان کی تعلیم و ترویج کے لیے انھوں نے جو آسان، سودمند اور زوداثر نسخہ مرتب اور نافذ کیا، اس کی مثال شاید ہی پیش کی جاسکے۔ انھوں نے اپنے منفرد، دل نشیں اور موثر طریقۂ کار کے ذریعے اس خصوص میں، جتنا فائدہ پہنچایا اور جس طرح اس کے لیے زبان وقلم اور صلاحیتوں سے کام لیا، وہ بھی اپنی نظیر آپ ہے۔

ایک مدرس بہت کچھ ہوتا ہے، تو وہ بہت اچھا مدرس ہی ہوتا ہے، یعنی یہ کہ اسے اپنے مضمون پر قدرت ہوتی ہے، وہ اسے اچھی طرح ذہن نشیں کراسکتا ہے، وہ اپنی بات طلبہ کو بہتر سے بہتر طریقے سے سمجھا سکتا ہے؛ لیکن مولاناؒ، اس کمال میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ، اپنے مخاطب کی طرزِ زندگی، فکر ونظر اور خواہشات وترجیحات کو، چند روز میں مکمل طور پر تبدیل کردینے اور انسان سازی، صلاحیت پروری؛ بل کہ صلاحیت انگیزی، کی جس صلاحیت سے بہرہ ور تھے، اس کی نظیر کم از کم میں نے عرب وعجم میں کہیں دیکھی، نہ سنی۔

مولاناؒ بہ یک وقت عالم، لغوی، انشا پرداز، مصنف، مقرر، خوش نویس، مدرس، مفکر، انجینیر ، مدبر اور منتظم: سبھی کچھ تھے۔ انھوں نے ایک سے زائد میدانوں میں اپنی عبقریت کی دھوم مچادی اور چھٹی اور دسویں دہائی کے درمیان کی ہندی نسلِ نو پر عمومی تربیت، عربی زبان کی محبت کی دلوں میں آبیاری اور جوانوں کی عقل وفکر کی تہذیب کے سلسلے میں ایسا گہرا اور وسیع تر اثر چھوڑا، جو میرے علم کے مطابق کسی معاصر معلم کے حصے میں نہیں آیا۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اکثر عبقری اپنا کردار، صحیح معنوں میں تب ادا کرپاتے ہیں، جب حالات سازگار اور آب وہوا موافق ہو؛ لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولاناؒ، اپنی کوشش میں ہر حالت میں کام یاب رہے اور ان کی تخلیقی قوت اور تربیتی صنعت گری کا نتیجہ، مخالف اور موافق دونوں طرح کی آب و ہوا میں خوش آیند طور پر سامنے آیا۔

دلوں پر حکم رانی کرنے والے مولانا

۱۹۶۵-۱۹۶۶ء کے تعلیمی سال میں داخلے کے لیے رمضان کے بعد، میں دارالعلوم دیوبند پہنچا، داخلے کی کارروائیوں کے دوران ہی جو ہفتہ عشرہ میں نے، دارالعلوم میں گزارا، تو جس چیز نے مجھے حیرت واستعجاب میں ڈال دیا اور جو میرے لیے زندگی کا سب سے انوکھا تجربہ تھا، وہ یہ کہ ہر قدیم طالب علم کی زبان سے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے چلتے پھرتے، آتے جاتے اور حتی کہ تفریح وفراغت کے اوقات میں بھی؛ میں ہر وقت یہ سنا کرتا تھا کہ

''مولانا'' آج یہ کر رہے ہیں، مولانا نے آج محاضرے میں یہ کہا ہے، مولانا آج سفر میں ہیں، مولانا نے نادی ادبی کے لیے ایک دوسرا پروگرام وضع کیا ہے، جو عن قریب منظرِ عام پر آنے والا ہے، مولانا کی آج عشا بعد فلاں مسجد میں تقریر ہوگی، مولانا آج درجے میں ایک طالب علم پر بری طرح بگڑ گئے تھے: اس لیے کہ وہ نامعقول، سبق سے بالکل غافل، اپنے کپڑوں سے کھیل رہا تھا۔ مولانا نے آج کے جلسے میں ایسی پراثر اور دل نشیں تقریر کی کہ سارا مجمع مکمل طور پر گوش بر آواز رہا۔

سارے طلبہ درس و تدریس اور عمومی تربیت کے سلسلے میں مولانا کی بے نظیر صلاحیت اور انفرادیت کا جس محبت، اخلاص، اعتقاد اور لذت و افتخار کے ملے جلے جذبات کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے، اب میں بھولی بسری یادوں کو، اپنے کم زور حافظے کی سلوٹوں سے سمیٹ کر، قلم کی نوک پر لانا چاہوں، تو میرے لیے ان کی عکاسی ممکن نہیں۔

قدرتی طور پر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ یہ کون سے مولانا صاحب ہیں، جو اس عصرِ خزاں دیدہ میں، دلوں پر اس درجہ حکم رانی کرتے ہیں، جس میں نوجوانوں نے بڑے سے بڑوں کے لیے احترام و عقیدت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ اس کلیے سے صرف وہی خوش قسمت لوگ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، جن کا اخلاص و یقین ہر شبہے سے بالاتر اور اپنے فکر و عمل سے، ان کی وفا شعاری و جاں نثاری، کسی سودے بازی یا تعریف و تحسین اور شکر و سپاس کی رہینِ منت نہ ہو۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا: بھئی! یہ کون سے مولانا صاحب ہیں، جن کے ''ذکر'' میں آپ لوگ اٹھتے بیٹھتے اس طرح مشغول ہیں؟ اُس وقت انھوں نے مولانا کا نام، ان کے اوصاف، جامعہ میں ان کے منصب ومقام، نوجوانوں پر ان کے اثرات واحسانات اور ان کے افکار وخیالات کی دنیا میں، صالح انقلاب برپا کرنے کی خاطر، ان کی شب وروز کی کوششوں کو تفصیل سے بتایا، نیز عربی زبان کے سلسلے میں، ان کی سنہری خدمات کی طرف توجہ دلائی۔ یاد آتا ہے کہ انھوں نے بہ اصرار یہ مشورہ بھی دیا، کہ ہم واجبی طور پر نادی سے جڑ جائیں اور کوشش کریں کہ مولانا کے پاس باقاعدہ بھی کسی کتاب کا سبق، دارالعلوم کے نقشۂ اسباق کے اعتبار سے، ہم لوگوں کو مل جائے (پیش نظر رہے کہ اس وقت دارالعلوم میں درجہ بندی نہ تھی) تاکہ ہمیں اچھی طرح اور علی وجہ البصیرت، یہ معلوم ہو جائے کہ مولانا کون ہیں، کیا ہیں اور نوجوانوں کی عقل وخرد اور دل وضمیر کو، انھوں نے اپنی گرفت میں کیوں لے رکھا ہے؟ موجودہ صدی کی آخری تین دہائیوں میں، عربی زبان وادب کی تعلیم، نوجوانوں کی تربیت اور ان کے عزم وحوصلے کو قلیل ترین مدت میں مہمیز کرنے والی انقلابی، منفرد، ساحرانہ اور روشن ترین شخصیت حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے، میری اور میرے رفقا کی دید وشنید کی ابتدا، عقیدت واخلاص کے اس گھنیرے سایے میں ہوئی۔

جس سال دارالعلوم میں داخل ہوا، اس سال مولاناؒ کے پاس میرا، باقاعدہ کوئی سبق نہیں ہوسکا، کہ دارالعلوم کے روٹینی نظام کی وجہ سے، اس سے

محروم ہی رہنا پڑا؛ لیکن مذکور الصدر اپنے مخلص احباب کے مشورے کے طفیل، ہم لوگ ''النادی الادبی'' کے تازہ دم اور حوصلہ بخش قافلے سے جڑ گئے۔

مولاناؒ کسی قدیم کتاب کی، نقل مطابق اصل نہیں تھے

دارالعلوم میں داخلے کے دوسرے سال، ہمیں اس کا موقع ملا کہ مولاناؒ سے ہم بہ راہ راست اور اسباق کے ذریعے مربوط ہو سکیں؛ جب ادب عربی کی ظریفانہ کتاب ''مقامات حریری'' کا گھنٹہ مولاناؒ کے پاس پڑا۔

دارالعلوم دیو بند میں اسی سال، اس سے قبل اور اس کے بعد بھی، نیز بہت سارے اساتذہ سے، دیگر مدارس اسلامیہ میں ہمیں تعلیم حاصل کرنے کی سعادت ملی، ان میں سے ہر ایک کا ہماری گردن پہ احسان ہے، ہر ایک کا ہم احترام کرتے ہیں، ان کی قدر و قیمت کے قائل ہیں، ان میں سے بعض کے تئیں قدر افزائی اور اعتقاد کا وہ جذبہ رکھتے ہیں، جس کے بیان پر قلم قادر نہیں؛ لیکن میں یہ کہنے میں ان کی ذرا بھی حقارتِ شان نہیں سمجھتا کہ وہ سب کے سب تقریباً ایک دوسرے کی نظیر تھے، وہ علم و فضل و تقویٰ میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ضرور تھے؛ لیکن درس کی وضاحت، طریقۂ تدریس، مضمون کی تفہیم اور زندگی کے بہت سارے گوشوں اور بہت سارے افکار و خیالات میں، وہ بڑی حد تک ایک دوسرے کے مشابہ اور ہم پلہ تھے۔

ملتے جلتے افراد، معمولی چیزوں کی طرح ہوتے ہیں، اُن کی مثال شب و روز کے روٹینی واقعات سے دی جا سکتی ہے، جو کسی کے لیے باعثِ توجہ

نہیں ہوتے؛ لیکن ممتاز افراد غیر معمولی واقعات؛ بل کہ ''خرقِ عادت حادثات'' ہوتے ہیں، وہ میدانی زمینوں میں پہاڑوں اور ٹیلوں کی طرح بلند ہوتے ہیں؛ اس لیے خواہی نہ خواہی اُن پہ نظر پڑتی ہے۔

مولاناؒ مجموعی طور پر ''غیر معمولی شخصیت'' تھے؛ اسی لیے انھوں نے ہماری اور ساری جامعہ کے طلبہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ گویا مولاناؒ، اپنے موضوع پر نئی طرز کی ایسی کتاب تھے، جس کی طرزِ نگارش دل کش اور طباعت دیدہ زیب ہو، قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں اور علم کے رسیا اسے پرشوق طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ اپنے اکثر معاصر علمائے گرامی کی طرح کسی قدیم کتاب کی ''نقل مطابق اصل'' نہ تھے۔

وہ ان سارے میدانوں میں (جن میں ان کی صلاحیت کا جوہرِ گراں مایہ ہمارے سامنے آسکا) اپنی نظیر آپ تھے۔ وہ بلا شبہ اُن ممتاز اور ذہین لوگوں میں تھے، جو اپنے ماحول سے، اپنا امتیاز اور اپنی انفرادیت منوالیتے ہیں اور اس کو اپنے پیچھے چلنے اور اپنی تقلید کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

تَرَى النَّاسَ إِنْ سِرْنَا يَسِيْرُوْنَ خَلْفَنَا

وَإِنْ نَحْنُ أَوْمَأْنَا إِلَى النَّاسِ وَقَّفُوْا

(تم لوگوں کو دیکھتے ہو کہ ہم چلیں، تب وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور ہمارا اشارہ پاکر یک سر رک جاتے ہیں)

مولاناؒ سے درس گاہ میں ملاقات کا پہلا دن تھا، جو چیز بڑی پیاری معلوم ہوئی، وہ یہ تھی کہ اُنھوں نے داخل ہوتے ہی واضح اور صاف عربی

لہجے میں سلام کیا، دو ایک باتوں کے بعد حاضری لی، تو حیرت ہوئی کہ ڈیڑھ سو طلبہ کی حاضری میں سات منٹ بھی نہیں لگے۔ اُن کا یہ طریقہ بھی بہت دل چسپ تھا کہ وہ ایک آنکھ سے رجسٹر حاضری میں لکھے ہوئے طلبہ کے نام دیکھتے اور اسی آن دوسری آنکھ سے حاضری یا غیر حاضری لکھتے جاتے۔

درس کے پہلے ہفتے میں مولاناؒ کا طریقۂ کار

وہ مکمل ایک ہفتے کتاب، یا اُس کے تعلق سے کچھ کہنے کے بہ جائے، اُن آداب کی تعلیم دیتے، جن کو باقاعدگی کے ساتھ برتنا، اُن کے درجے کے ہر متعلّم کے لیے ضروری ہوتا۔ وہ بتاتے کہ کوئی طالب علم دورانِ درس، درس گاہ سے باہر نہیں دیکھ سکتا، استاذ و کتاب کے علاوہ، اِدھر اُدھر نگاہ نہیں دوڑا سکتا، کوئی ایسی حرکت نہیں کرسکتا، جس سے درس کے تئیں اس کی بے رغبتی کی غمازی ہوتی ہو، مولاناؒ کے محاضرے اور شرحِ درس کے دوران، اُن سے کسی بات کے سلسلے میں کوئی سوال نہیں کرسکتا؛ اس لیے کہ اس سے سلسلۂ کلام ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر وہ کسی کلمے کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتائیں، کہ اس لفظ کے یہ معنی آتے ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ نہایت غور سے سنے، نہ یہ کہ وہ اس لفظ کے کسی ایسے غلط یا صحیح معنی پر غور کرنے میں اپنے ذہن کو مشغول رکھے، جو اس نے کسی لغت کی کتاب میں دیکھا ہو اور پتہ نہیں صحیح سمجھ سکا ہو کہ غلط، یا کسی استاذ سے سنا ہو اور خدا معلوم کس حد تک اس نے ان سے صحیح صحیح اخذ کیا ہو؟ نیز ہر طالب علم کے لیے واجب ہے کہ وہ درس گاہ میں داخل

ہونے سے قبل طاقت ور عربی لہجے میں سلام کرے، وغیرہ۔

مولاناؒ نے اِن آداب کی پابندی، اپنے طلبہ کے لیے بڑے تجربے کے بعد ضروری قرار دی تھی۔ درحقیقت وہ اِن سب باتوں کے ذریعے، طلبہ میں توازن اور باقاعدگی پیدا کرنا چاہتے تھے؛ کیوں کہ یہی طلبہ مستقبل میں اسلام کے داعی وسپاہی ہوں گے اور توازن و باقاعدگی ایک سپاہی کی کام یابی کی، سب سے بڑی ضمانت ہوا کرتی ہے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ بڑے مدرس تھے، یا بڑے مربی

مولانا کا سبق ''سنجیدگی'' کے طویل، خشک اور صبر آزما مفہوم سے ناآشنا ہوتا، وہ تفریحی جملوں سے ہمیشہ کلاس کو زعفران زار بنائے رکھتے، اُن کا دل چسپ اندازِ گفتگو، پرلطف نکتہ سنجی، زیرِ درس مسئلے پر مرتب اور فصاحت و بلاغت آمیز تقریر؛ پھر دین و دنیا، زندگی و کائنات، حال و مستقبل، ایمان و یقین، تعلیم و تربیت اور اخلاق و آداب کے حوالے سے بلیغ اشارے؛ اس پر مستزاد ہوتے۔ اِن سب وجوہات کی بنا پر ایک طالب علم، از اول تا آخر سراپا شوق و ذوق بن کر، اُن کا درس سنا کرتا۔

بعض دفعہ مریض ہونے کے باوجود، طالب علم کوشش کرتا کہ اُن کا سبق نہ چھوٹنے پائے، کہ صرف ایک گھنٹے میں خیرِ کثیر ہاتھ سے رہ جائے گا۔ طالب علم، ان کی درس گاہ سے نکلتا، تو اس کی طبیعت میں بشاشت ہوتی، اس کا دل مسرور ہوتا اور اس کا حافظہ جہاں، اس مضمون میں بہت کچھ سمیٹ لیتا،

جو مولاناؒ نے پڑھایا ہوتا، وہیں وہ بے شمار آدابِ زندگی کی آگہی بھی حاصل کرلیتا۔ چند روز میں ایک طالب علم، اُن کے پاس پڑھ لینے کے بعد، ایسا ہو جاتا کہ کسی علمی مجلس میں شریک ہوکر، اپنے کو کبھی بالشتیا محسوس نہ کرتا۔ مولاناؒ کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بڑے مربی تھے یا بڑے مدرس، ان کا درس ہمیشہ تعلیم و تربیت: دونوں کا حسین مجموعہ ہوا کرتا۔ وہ صرف متعلقہ مضمون کو اچھا بُرا، پڑھا دینے پر اکتفا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔

ہر چند کہ اُن کی تدریسی صلاحیت ایسی تھی کہ مدارس اسلامیہ میں رائج کسی بھی مضمون کو، وہ خوبی اور کام یابی کے ساتھ، طالب علموں کے ذہن میں اتار دیتے؛ لیکن ایک آدھ مرتبہ حدیث شریف کے بعض اسباق کے علاوہ، اُن کو عربی زبان کے سوا کسی فن کی تدریس کا موقع نہیں ملا، وہ عربی زبان کے بچپن سے ہی عاشق و دل دادہ اور اس کی خدمت کے خواہش مند رہے۔

عربی زبان کی تدریس کا اچھوتا طریقہ

ہم لوگ اپنے ناقص تجربے کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ عربی زبان کی تدریس کا جو سلیقہ اور طریقہ، خزانۂ قدرت سے اُن کو ودیعت ہوا تھا، برصغیر؛ بل کہ بیرونِ ملک میں بھی، عربی زبان کے بہت کم مدرسین کے حصے میں آیا ہوگا۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ مولانا علم و فضل میں یا ادب و زبان کے گہرے مطالعے میں، سبھوں سے بڑھ کر تھے؛ کیوں کہ خود اندرونِ ملک بہت سے فاضل گرامی، وسعت مطالعہ اور ذوقِ زبان و ادب

میں ان سے بہ درجہ ہا فائق ہیں؛ لیکن جو چیز مولاناؒ کو دوسروں سے بالکل ممتاز کردیتی، وہ اُن کا پیارا، خوب صورت، آسان ترین اور مفید ترین طریقۂ درس تھا، نیز اپنے شاگردوں تک کام یابی سے، زیرِ تدریس مضمون کے ساتھ ساتھ افکار و خیالات اور جذبات کو منتقل کردینے کی برق رفتار اور حیرت انگیز صلاحیت اور افہام و تفہیم، مرتب گفتگو اور مخاطب کو مطمئن کردینے کی بھرپور قدرت۔ اس سب سے بڑھ کر یہ کہ ''بہت دور تک جا پہنچنے کے لیے بہت مختصر راستے'' کی شریفانہ اور ہوش مندانہ راہ نمائی؛ چناں چہ ہم لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ مولاناؒ اپنے شاگردوں کو اپنے علم و معلومات سے زیادہ کچھ بتا دیتے ہیں۔ ہمارے بہت سے احباب جو مشرق و مغرب کی سیر کر آئے اور اُن میں سے متعدد بڑی بڑی جامعات میں اساتذہ ہیں، ان کی بھی یہی رائے ہے کہ ''بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری'':

ہیں اور بھی دنیا میں، سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے، اندازِ بیاں اور

مقناطیسی شخصیت

خیالات و جذبات کو دوسروں تک منتقل کردینے کی، اسی صلاحیت کے ذریعے، مولاناؒ نے جوانوں میں عقابی روح بیدار کردی، اُن کے فکر و خیال کو ایمان و یقین سے مہمیز کردیا؛ چناں چہ زندگی کا ہر میدان انھیں خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوگیا۔ مولاناؒ کی جامع تربیت کی نتیجہ خیزی کو محسوس کرنے

کی وجہ سے ہی، طلبہ اُن پر پروانہ وار ٹوٹتے رہے، مجھے اب تک اُن جلسوں کا منظر یاد ہے، جن میں مولاناؒ کی تقریریں ہوا کرتیں، تو طلبہ سراپا شوق بن کر جوق در جوق آتے، بعض دفعہ بغیر سابقہ اعلان کے، مولاناؒ کی تقریر دارالعلوم کے کسی ہال میں یا مسجد میں شروع ہو جاتی اور چند منٹ میں طلبہ اپنے کمروں سے، اس طرح بھاگے ہوئے آ جمع ہوتے، کہ بعض اپنی جوتیاں اور چپل بھی نہیں پہن پاتے۔ مولاناؒ کی اُن پرجوش، تحریکی، فکر انگیز، ادبی اور رقت آمیز تقریروں سے، فکر و نظر کے دھارے بدل گئے:

ہجوم کیوں ہے زیادہ ''شراب خانے'' میں؟
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے ''مردِ خلیق''
(علامہ اقبال)

سلیقہ مند معلم

دوسری طرف طلبہ بھی ہر چیز کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ، اس لیے سیکھ جاتے کہ مولاناؒ کی طرزِ ہمت افزائی ہی کچھ ایسی ہوتی کہ اُن کی خوابیدہ صلاحیتیں آناً فاناً بیدار ہو جاتیں۔ انھیں محسوس ہوتا کہ وہ بڑے لائق و فائق آدمی ہیں، وہ اتنا کچھ کر سکتے ہیں، جو ماضی میں بڑے بڑے لوگ نہ کر سکے۔ مولاناؒ کے الفاظ ایسے مواقع پر سدھائے ہوئے تیر کی مانند ہوا کرتے، وہ سیدھا دل میں پیوست ہو جاتے، سننے والے کی نیند حرام ہو جاتی اور حرکت و عمل اور بے خوابی و تکان کی لذت کے ماسوا، ہر لذت

سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا:

تیرے نَفَس سے ہوئی، آتشِ گل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی، تیری نَوا کا صلہ

ہمارا اور ہمارے بہت سے ساتھیوں کا، دار العلوم کے زمانۂ طالب علمی میں طریقہ تھا کہ جب ہم سستی و کاہلی محسوس کرتے اور کسی وجہ سے ہفتے دو ہفتے کے بعد، لکھنے پڑھنے سے جی اچٹ جاتا، تو ہمت و حوصلے کی بیٹری کو چارج کرنے کے لیے ہم مولاناؒ کے پاس آجاتے، مولاناؒ لکھنے پڑھنے اور اپنے مشاغل میں لگے ہوتے، ہم اُن کے پاس ایک آدھ گھنٹے بیٹھ کر اُن کی چستی اور پھرتی سے، ایسی طاقت اور غذا حاصل کر لیتے، کہ کئی کئی ہفتے ہم چست رہتے۔

باکمال عربی خطیب

ہم لوگ جب انھیں عربی میں سنتے، تو محسوس ہوتا کہ کوئی عربی نژاد بلیغ اور باکمال خطیب نوا سنج ہے، وہی لہجہ، وہی خوبی، وہی تلفظ، وہی نغمہ و جرس اور سب سے بڑھ کر حروف کی اپنے مخارج سے ادائے گی۔ اس پر ان کا وہ اخلاص مستزاد ہوتا، جس کی برکتیں اُن کے منھ سے نکلے ہوئے سارے الفاظ میں اس طرح محسوس ہوتیں، جیسے پھول کی پتیوں میں بادِ سحر گاہی کا نم۔ اُن کا ہر جملہ سچائی کی روشنی سے منور ہوتا اور صاف محسوس ہوتا، کہ دل کا بامقصد درد، الفاظ کے لباسِ جمیل کے اندر سے چھلک جانا چاہتا ہے۔ مولاناؒ کی قیمتی

نصیحتیں، گراں قدر ارشادات اور پاکیزہ و فکر انگیز خیالات، جو طلبہ کے لیے اُن کی زندگی کی راہیں دور دور تک روشن کردیتے اور اُن کے سارے کھرے صاف کردیتے، اُن کی تقریر کو نہایت پرکشش، پرلطف، لذیذ اور زندۂ جاوید بنادیتے؛ اسی لیے طلبہ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو، اس طرح اپنی گرفت میں بروقت لے لینے کی کوشش کرتے، جیسے وہ گول کیپر، جو اس گیند کو پوری دل چسپی کے ساتھ دبوچ لیتا ہے، جسے مخالف ٹیم ''یقینی گول'' کرنے کے لیے، اس کی طرف پھینکتی ہے؛ چناں چہ ان کی کوشش ہوتی کہ مولاناؒ کا کوئی جملہ، جملے کا کوئی لفظ اور لفظ کا کوئی حرف ضائع نہ ہونے پائے؛ ورنہ بڑی محرومی کی بات ہوگی۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولاناؒ، تقریر اور تدریس کے دوران اپنے مخاطب کے دل و دماغ کو: اپنے خلوص، اپنی حقیقت بیانی، شیرینیِ گفتار، اپنی پرکشش شخصیت، رعنائیِ خیال اور چشم کشا و عقل کشا معانی و مضامین کے ذریعے اسیر کرلیتے۔ وہ تاثیر آفرینی کے لیے کسی خارجی سبب کا سہارا نہ لیتے، یعنی وہ اس ''کرتب'' سے کام نہ لیتے، جس سے عام طور پر پیشہ ور مقررین، مدرسین اور مجلس باز لوگ کام لیا کرتے ہیں۔ وہ نہ بلا ضرورت کے لطیفوں سے کام لیتے، نہ داستاں سرائی کرتے اور نہ زینتِ گفتار کے لیے بے مقصد لفاظی کا سہارا لیتے، نہ موقع بہ موقع اشعار پڑھتے۔

ان کے اشعار نہ پڑھنے کی بات آہی گئی ہے، تو یہ ذکر کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا، کہ میں نے یا میرے کسی دوست نے، زندگی میں کبھی بھی

مولانا سے، کوئی شعر یا کوئی مصرع نہیں سنا؛ دورانِ تقریر، نہ دورانِ مجلس، نہ دورانِ تدریس۔ وہ غالبًا ادب کے میدان کے واحد شہ سوار تھے، کہ تحریر و تقریر میں مسلّم فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود "مشقِ سخن" ہی نہیں؛ بل کہ "شغلِ سخن" سے بھی پرہیز رکھا، ہم لوگوں کو اس سلسلے میں تعجب تو رہا؛ لیکن اِس کی وجہ دریافت کرنے کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی، نہ موقع سامنے آیا:

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے، بزمِ جانانہ

عربی یا اردو میں مولاناؒ نے طلبہ کے سامنے، جو اس طرح کی تقریریں کیں، انھوں نے انھیں کیا کچھ نہیں دیا۔ ادب و زبان کا ذوق بلند، فصیح و بلیغ زبان، جوش و جذبہ، حوصلہ اور اقدام کا ولولہ۔ اُن کی تقریروں سے انھیں سب کچھ ملا اور اس سے بھی قیمتی یہ داعیہ، کہ خدائے حکیم کی طرف سے یہ فرصت عمر جو ملی ہے، پتہ نہیں کب تک میسر رہے؛ اس لیے اسے اس عظیم مقصد کے لیے مکمل طور پر استعمال کرنا چاہیے، جس کے لیے انھوں نے پردیس کی زندگی گزارنا گوارا کی ہے۔ ان تقریروں کے طفیل بہ ظاہر غبی طلبہ کے ڈھیر میں سے، بہت سی غیر معمولی صلاحیتیں دریافت ہوئیں اور خوابیدہ استعدادوں کو حرکت و بیداری کی دولت ملی۔

دوسروں تک صلاحیت منتقل کردینے کی بے نظیر صلاحیت

میدانِ علم و ادب کے میرے بعض مشہور دوستوں نے (جو مولاناؒ کے

شاگرد ہیں) مجھے بتایا کہ مولاناؒ نے مجھے صرف پانچ دس منٹ میں خطاط بنادیا۔ میں نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے؟ کہنے لگے: یقین کیجیے۔ میں نے کہا: یہ ہوا کیسے؟ انھوں نے بتایا کہ مولاناؒ نے تختۂ سیاہ پر چاک سے ایک لکیر کھینچی اور لکیر پر تحریر فرمایا "إِنَّ الإِنسَانَ لَفِی خُسْرٍ" پھر فرمایا: کچھ حروف ایسے ہوتے ہیں، جو لکیر کے اوپر لکھے جاتے ہیں، کچھ لکیر کے نیچے، جب کہ کچھ بالکل ہی لکیر پر۔ آپ لوگ اسے غور سے سنیں، دیکھیں اور یاد رکھیں۔ پھر دوبارہ اُنھوں نے آیت کریمہ کو خط نسخ میں ایسا خوب صورت لکھا کہ اس کا جمال اب تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ میں ان کی بیان کردہ راہ پر چلتا رہا اور ان سے بعد میں، میں نے دو ایک مرتبہ مشورے لیے اور میں خوش نویس بن گیا۔

مجھے اس واقعے پر اس لیے زیادہ حیرت نہیں ہوئی، کہ میں جانتا ہوں کہ مولاناؒ کو خدائے پاک نے، جو بہت ساری صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، ان میں نافع ترین صلاحیت یہی تھی، کہ وہ دوسروں تک اپنی صلاحیت بڑی آسانی سے منتقل کردیتے تھے۔ یہ صلاحیت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، صرف اسی کو خدائے حکیم اس صلاحیت سے نوازتا ہے؛ جس سے کوئی بڑا، غیر معمولی اور انقلاب آفریں کام لینا اسے منظور ہوتا ہے۔ بعض دفعہ آدمی اپنی جگہ جلیل القدر عالم، یا زبردست ادیب، فطری شاعر، زوردار مقرر، باکمال انشا پرداز، عظیم ترین مدبر و منتظم اور ہوشیار سیاست داں ہوتا ہے؛ لیکن وہ ہرگز یہ صلاحیت نہیں رکھتا، کہ دوسروں تک اپنی صلاحیت کو کسی

درجے میں منتقل کردے اور اپنے چراغ سے دوسرے چراغ روشن کردے۔ ایسا آدمی چاہے کتنا بڑا ہو اور کتنا قابل تعریف ہو؛ مگر اس کا نفع محدود ہوتا ہے، اور اس کی حیثیت ''فعلِ لازم'' کی ہوتی ہے؛ لیکن ایک بڑا آدمی، اگر رجال سازی کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی بڑا بنا سکتا ہے، تو وہ واقعی بہت بڑا ہے۔ کسی اور کے لیے یہ صلاحیت ضروری ہو یا نہ ہو؛ لیکن ایک معلم کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جو معلم جس درجہ اس سے بہرہ ور ہوگا، اسی درجہ اپنے فریضے کی ادائے گی میں کام یاب ہوگا اور جو معلم، جس قدر اس صلاحیت سے عاری ہوگا، وہ اسی قدر ناکام ہوگا، ہر چند کہ وہ اس کے خلاف دعوی کرے۔

ہم لوگ، ان کی ہر ادا سے تعجب کرتے اور کہتے: بھلا دیکھو تو سہی: ایک کم زور اور دبلا پتلا شخص ہے؛ لیکن کس طرح چستی اور پھرتی اس کی رگ رگ میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔ وہ ہمارے درمیان علم و ادب کی عطر پاشی کے ساتھ ساتھ، چستی اور پھرتی کی گراں بہا دولت بھی تقسیم کرتے۔ وہ تیز چلتے، ان کے اٹھنے بیٹھنے، پہلو بدلنے اور حرکت و سکون میں سستی کا کوئی گزر نہ تھا۔ ان کی زندگی جمود و تعطل، ناامیدی، قنوطیت، تردد اور آج کا کام کل پر ڈالنے کے نامعقول رویے سے، مکمل ناآشنا تھی۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے اور کر سکتے تھے اور بڑے سلیقے سے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ انھوں نے ہر کام کا کرنا، اس فن کے اعلیٰ درجے کے ماہرین سے سیکھا ہے۔

ایک معتقد جس سے اعتقاد رکھتا ہے، اس کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے؛

چناں چہ مولاناؒ کے شاگرد، اُن کے ہر حرکت وسکون کی پیروی کرتے، حتی کہ ان سے دسترخوان بچھانے، دسترخوان چننے کا سلیقہ، چائے دم کرنا اور چائے کی پیالیاں دھونا بھی سیکھتے۔ میں ذاتی طور پر بہت سارے ایسے طالب علموں کو جانتا ہوں، جو دارالعلوم آئے تو دیہاتی تھے، الگ تھلگ رہا کرتے تھے، مولاناؒ سے مربوط اور نادی سے منتسب ہوتے ہی، اچانک ان کی شخصیت بدلنا شروع ہوئی اور دیکھتے دیکھتے ایک ہی سال کے عرصے میں وہ مہذب، مثقف اور روشن خیال بن گئے!

بات یہ ہے کہ مربی کا محض علم وتقوی (ہر چند کہ یہی اصل خوبی ہے اور اس کے بعد ہی کسی خوبی کو شمار کیا جاسکتا ہے) اس کو اپنے ماننے والوں یا شاگردوں میں، وہ ناقابلِ بیان مقبولیت؛ بل کہ محبوبیت نہیں دیتا؛ جو مولاناؒ کو اپنے شاگردوں میں حاصل تھی۔ درحقیقت اس محبوبیت کا سرچشمہ ان کا غیر معمولی اخلاص اور نفع رسانی میں فنائیت تھا۔ مخلص ہمیشہ محبوب ہوتا ہے، یہ قاعدہ مشرق یا مغرب میں کسی زمانے میں اور حالات کی بے پناہ تبدیلی کے باوجود، کبھی نہیں ٹوٹ سکتا:

وہ ادائے دلبری ہو، کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتحِ زمانہ

آپ جانتے ہیں کہ کسی واقعے، تربیت، بیداری، انقلاب، یا تحریک کے اثرات؛ صرف اسی نسل تک محدود نہیں رہتے، جس نے اس واقعے یا تربیت، یا بیداری، یا انقلاب، یا تحریک کو دیکھا، برتا اور اس میں زندگی

گزاری ہوتی ہے؛ بل کہ اس کا فیضان بعد کی نسلوں تک منتقل ہوتا رہتا ہے؛ اسی لیے مولاناؒ کی کوششوں کے نتیجے میں جو ثقافتی اور فکری بیداری، دارالعلوم دیوبند میں رونما ہوئی، اس کے اثرات نہ صرف یہ کہ اب تک باقی ہیں؛ بل کہ ان شاء اللہ ہمیشہ باقی رہیں گے:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے، قفس میں ایجاد
فیض! گلشن میں، وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

النادی الادبی، ایک جامع مدرسہ

''النادی الادبی'' کی بنیاد مولاناؒ نے ۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں رکھی تھی۔ اس کا مقصد ہر چند کہ دراصل عربی زبان میں تقریر و تحریر کی مشق اور عربی زبان کو مدرسوں کی زندگی میں، ایک زندہ زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کی تحریک پیدا کرنا تھا؛ لیکن مولاناؒ کے زرخیز ذہن، تخلیقی صلاحیت اور مربیانہ نفسیات نے اس کو ایک جامع ترین مدرسہ بنا دیا تھا۔ طلبہ یہاں وہ سارے اسباق پڑھتے اور ہوش و خرد کے ساتھ یاد کرتے تھے، جن کی انھیں آج، دارالعلوم میں اور کل دارالعلوم کے باہر کے معاشروں میں ہر جگہ ضرورت تھی اور جنھوں نے ان کی زندگی کی چولیں درست کر دیں۔ ان کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، حوصلہ بلند ہوا، عزم و ہمت پر سان چڑھی، صلاحیتیں اجاگر ہوئیں، افکار و خیالات کا زنگ دور ہوا، جینے کا سلیقہ آیا، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر رحم کھانے کا سبق ملا، انتظامی اور تنظیمی صلاحیتیں

پروان چڑھیں، میزبانی اور مہمان نوازی کا گر معلوم ہوا، خدمت اور محنت کے خوگر بنے، صبر وثبات کی لذت انھیں معلوم ہوئی؛ حسن سلوک، ہم دردی، غم خواری، عدل ومساوات، ایثار وقربانی اور اسلامی اخلاق پر عمل، تجربے کی راہ سے جان گئے۔ مریضوں کی خدمت، محتاجوں سے الفت، تواضع، احساس ذمے داری اور ہر کام کو اپنے وقت پر کرنے کی عادت، ان کے فکر و عمل کا حصہ بن گئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ایک فوجی کی چستی، اس کی تیزی، اس کا ساڈسپلن اور اس کی سی اطاعت شعاری، ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی اور طالبِ علم کی حیثیت سے اپنی ذمے داری اور اس مسلم قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی اور کائنات میں اپنا مقام سمجھ گئے، جو لوگوں کی اصلاح، قیادت وسیادت اور ہر گوشۂ عالم انسانیت سے، ظلم و تیرگی کو مٹانے کے لیے معرضِ وجود میں لائی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ نادی ہی کے ذریعے، اکثر طلبہ دعوت الی اللہ کے ڈھنگ اور عصرِ حاضر میں اس کو پیش کرنے کے طریقے، نیز اس سلسلے میں حکمت اور تدریجی عمل کی مصلحت وغیرہ سے بھی، اچھی طرح گزر گئے، جس سے انھوں نے بعد میں دعوت والی زندگی میں، خدا کی توفیق سے بہت کچھ کر دکھایا۔

نادی کا جال، دارالعلوم کے سارے کیمپس میں پھیلا ہوتا اور اس سے انتساب، طلبہ کے درمیان وجہ امتیاز اور باعث افتخار ہوتا۔ ہر چند کہ نادی کا دروازہ، ہر ایک طالب علم کے لیے کھلا ہوا تھا؛ مگر اکثر محنتی اور ذہین طلبہ ہی اس سے مربوط ہوا کرتے۔

النادی کے اسٹیج سے مولاناؒ کی زندہ جاوید اور ہمہ گیر خدمات

نادی کے شعبوں، ان کی خصوصیات اور ان کی افادیت کا اگر بالتفصیل جائزہ لیا جائے، تو قاری کے لیے باعث حیرت ہونے کے ساتھ، خود راقم الحروف کو ایک مقالے کے بہ جائے، ایک ضخیم کتاب کے لیے تیار ہونا پڑے گا؛ لیکن میں غایتِ اختصار کے ساتھ، نادی اور اس کے شعبوں کا تذکرہ، اس لیے ضروری سمجھتا ہوں، کہ مولانا کیرانوی رحمہ اللہ کی علمی، تعلیمی، تدریسی، فکری، تربیتی، تحریری اور تقریری سرگرمیوں کو، کما حقہ گرفت میں لانے کے لیے ''نادی'' کا جاننا ضروری ہے، کہ نادی ہی کے اسٹیج سے مولاناؒ نے وہ گراں قدر خدمات انجام دیں، جو ان شاء اللہ ابدالآباد تک باقی رہیں گی، ان کے صحیفۂ اعمال کو روشن کریں گی اور کل بہ روزِ حساب، ان کی حسنات کے پلڑے کے لیے پاسنگ ثابت ہوں گی۔

نادی کی اہمیت اور قدر و قیمت جاننے کے لیے، یہ جاننا ضروری ہے کہ دار العلوم میں مولانا وحید الزماںؒ سے قبل، عربی زبان کے تئیں ایک ایسی زندہ زبان کی حیثیت سے، جس کو لکھنے، پڑھنے اور بولنے کے لیے یک ساں طور پر استعمال کیا جا سکتا ہو، کوئی سنجیدہ اور ٹھوس کوشش سامنے نہیں آئی۔ مولاناؒ کو کتاب و سنت اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں، برصغیر کے اِس سب سے بڑے مرکز اور اسلام و مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کے حوالے سے، اس دیار کے اس سب سے بڑے نقیب ادارے اور تحریک کی طرف سے، قرآن

کریم اور اسلام کی قانونی زبان کے سلسلے میں، اس عظیم کوتاہی کا بار آور احساس ہوا، اللہ نے اُن کو عربی زبان کے بلند و پاکیزہ مذاق سے نوازا تھا اور دوسری طرف اُن کمالات سے بھی، جو ایک کام یاب اور مثالی معلم و مربی کا لازمہ ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اِس کوتاہی کی تلافی کی ٹھانی؛ کیوں کہ وہ دارالعلوم کے سپوت فرزند تھے اور اپنے خدا سے وعدہ کیا، کہ وہ اس زبان کی خدمت اور نشر و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ اُنھوں نے عملاً جو کچھ کیا، ذیل میں ہم اس کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

النادی کے اہم شعبے اور اُن کا طریقۂ کار

تذکرہ نادی کا ہو رہا تھا اور بات اس کے شعبوں کی چل رہی تھی۔ اب یہ سنیے کہ ہر شعبے کا ایک ناظر (یعنی ناظم) ہوا کرتا تھا اور ناظم کے تحت مراقبین (یعنی نگراں) ہوا کرتے تھے؛ کیوں کہ کام کو گرفت میں لانے کے لیے، ایک شعبے کو کئی ایک ذیلی شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔

سارے شعبوں میں سب سے اہم شعبہ، شعبۂ تقریری ہی تھا، اس کا دامن زیادہ وسیع اور اس کے بال و پر بہت پھیلے ہوئے تھے۔ یہ شعبہ درس گاہوں میں ہفتہ واری جلسوں کے علاوہ، ماہانہ اور تعلیمی سال کے اختتام پر، سالانہ اجتماعات بڑے دھوم دھام سے منعقد کرتا۔

نادی کے دفتر میں لکڑی کا ایک لیٹر بکس ہوا کرتا، جو مولاناؒ نے تیار کروا کر مشرقی دیوار پر لٹکا رکھا تھا، ہفتہ واری اجتماعات کے ہر نگراں کے لیے ضروری

تھا، کہ وہ سارے شرکائے جلسہ کی مفصل، مدلل اور مکمل رپورٹ نام بہ نام تیار کرے، نیز نادی کی طرف سے اس سلسلے میں چھپے ہوئے فارم کی صحیح صحیح خانہ پری کرے اور ہر شریکِ بزمِ خطابت کو مناسب نمبر دے، ساتھ ہی یہ تصریح بھی کرے کہ اس کا تلفظ، اس کی آواز، اس کی زبان، اس کی طرز ادا اور اس کی رفتارِ محنت کیسی ہے؟ یہ سارا اصلاحی نظام تنِ تنہا مولاناؒ کے ذہنِ رسا کی پیداوار تھا، جو ہر آن نت نئے پروگرام وضع کرتا اور قدیم کو جدید سے بدل دینے کے لیے آمادہ رہتا۔

عربی زبان کے یہ مشقیہ ہفتہ واری جلسے، جمعرات کی شب میں مغرب و عشا کے مابین ہوا کرتے۔ نگراں حضرات اپنی رپورٹیں جمعہ کو علی الصباح لیٹر بکس میں ڈال دیا کرتے۔ نادی کا ایک ''معتمد'' (ذمہ دار اعلیٰ) ہوا کرتا تھا، جس کا انتخاب مولاناؒ کی ژرف نگاہی کی، بہ ذات خود دلیل ہوا کرتا۔ ''معتمد'' ہمیشہ ذہین، مرنجاں مرنج، عام طلبہ سے زیادہ صوم وصلاۃ کا پابند اور اپنی زندگی میں اسلام کو برتنے والا ہوا کرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ ''مکتب'' کی کرامت ہوتی، یا مولاناؒ کی سحر نگاہی، کہ اس جواں سالی اور دورِ طالب علمی میں، جس قائدانہ صلاحیت اور اجتماعی کام کرنے کے لیے، جس غیر معمولی خوبی اور سلیقے کا وہ مظاہرہ کرتا، میں آج ہوش وخرد کی دو ایک دہائیوں کو پار کرنے کے بعد جب بھی، اس مسئلے پر غور کرتا ہوں، دم بہ خود رہ جاتا ہوں۔

معتمد، نادی کے سارے شعبوں کا ذمے دار ہوا کرتا اور مولاناؒ کی حیثیت ایک مربی، سربراہ اور صدر کی تھی۔ معتمد لیٹر بکس کھولتا اور دو دن کے

عرصے میں ساری رپورٹیں پڑھ جاتا، ان کی روشنی میں ایک دوسری جامع اور مختصر رپورٹ تیار کرکے، مولاناؒ کی خدمت میں پیش کردیتا، مولاناؒ کثرت مشاغل کے باوجود اسے غور سے پڑھتے اور اس سلسلے میں جو راہ نمائی مناسب سمجھتے، دیتے؛ مگر اہم نکتوں پر نادی کے ذمے داروں کی میٹنگ میں اظہارِ خیال فرمایا کرتے، جو اکثر چہار شنبے کی شب میں ہوا کرتی تھی۔ مولاناؒ ہمیشہ ایسے سہل ترین طریقوں کی طرف اشارہ کرتے، جن کا برتنا بھی آسان ہوتا اور ان کے فائدے بے پناہ ہوتے اور جو چیز ساری چیزوں میں رنگ بھر دیتی، وہ مولاناؒ کی طرزِ گفتگو اور ان کی پرکشش طرزِ تکلم ہوتی۔

ذمے داروں کی میٹنگ پر مولاناؒ کی طرف سے پابندی تھی کہ عربی زبان کے سوا کسی بھی زبان کا کوئی لفظ بھی استعمال نہ کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ذمے دار حضرات چوں کہ دیگر طلبہ کے لیے مقتدا اور نمونے کا درجہ رکھتے ہیں: اس لیے ضروری ہے کہ وہ روانی سے بولنے اور لکھنے میں ان سے ممتاز ہوں؛ تاکہ دیگر طلبۂ نادی ان کی نقل کرسکیں۔ قدرتی بات تھی کہ شروع شروع میں ان میٹنگوں میں شرکت کرنے والے ذمے داران (صدر، معتمد، ناظرین، مراقبین) خصوصاً اگر وہ کاروانِ نادی سے اسی سال جڑے ہوتے، کچھ یا بہت کچھ دشواری محسوس کرتے؛ لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں میں اس پر قابو پالیتے؛ اس لیے کہ دنیا کی کوئی مشکل ایسی نہیں، جس پر انسان، اپنے ارادے سے قابو نہ پاسکتا ہو، سوائے موت کے، جس کی دوا ہے، نہ کوئی تدبیر، جیسا کہ مولاناؒ اکثر کہا کرتے تھے۔

خاکِ عجم میں زبانِ عربی کی شادابی

کوئی وارد و صادر، مغرب و عشا کے مابین، ان درس گاہوں کے درمیان اگر ایک چکر لگالیتا، جن میں بزمِ خطابت منعقد ہوا کرتی، تو اسے عجیب وغریب منظر نظر آتا۔ ایسا لگتا کہ سوقِ ''عکاظ'' بپا ہے، شعرا اور خطبائے عرب اپنی زبان کا جوہر دکھا رہے ہیں۔

ساری فضا عربی زبان کی مقدس اور روحانی خوش بو سے عطر بیز اور مشک بار ہو جاتی اور دار العلوم عربی زبان کا چمن زار نظر آنے لگتا۔ ایک دیکھنے والے کو یہ دیکھ کر خوشی بھی ہوتی اور استعجاب بھی، کہ اسلام کے یہ شاہین بچے، کس طرح اسلام اور رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی زبان اور آپ کے ملک کے ساتھ وابستگی اور وفاداری کا تاکیدی لہجے میں اظہار کر رہے ہیں۔ وہ دیکھتا کہ عربی زبان کا پودا خاکِ عجم اور ''دیار پردیس'' میں کس طرح سرسبز و شاداب نظر آرہا ہے۔ یہ اگر ایک طرف اسلام اور قرآن کے معجزے کی کرشمہ سازی تھی، تو دوسری طرف اس کے پیچھے، اس کوششِ پیہم کی کاری گری تھی، جسے مولاناؒ نے تن تنہا حضور پاکؐ کی ذات سے عقیدت اور آپ کی زبان سے والہانہ عشق کی بنیاد پر، انجام دیا تھا۔ انھوں نے اخلاص سے یہ کوشش کی، کہ اس کا پودا ایک ایسی زمین میں بوئیں، جس کی آب وہوا اس کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی؛ مگر اخلاص چوں کہ ہمیشہ معجزنما رہا ہے؛ اس لیے وہ اپنی کوشش میں کام یاب رہے اور آج عربی کے قدردانوں کی آنکھیں

اس کی سبزہ زاری کو دیکھ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔

عربی زبان کے ساتھ فرطِ عقیدت کی ایک مثال

مولاناؒ کو عربی زبان سے کس درجہ والہانہ لگاؤ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگوں سے فرمانے لگے:

''عربی زبان میں لکھی ہوئی ایک معمولی سی بات، محض زبان کی حیثیت سے اردو یا کسی اور زبان میں لکھی ہوئی کسی غیر معمولی بات سے بہتر ہے، عربی زبان کی ہر جگہ قدر کرو۔ اخباروں میں، رسالوں میں، کتابوں میں۔''

آپ نے یہ بات اس وقت کہی تھی، جب آپ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ بعض کم شعور طلبہ اور بے شعور مولانا لوگ، عربی اخبارات کو دستر خوان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

بزمِ خطابت سے مولاناؒ کی ذاتی دل چسپی

بزمِ خطابت کی ذمے داریاں نظمائے خطابت اور نگراں کے سپرد کر کے، مولاناؒ یک سو نہیں ہو جاتے تھے؛ بل کہ وقتاً فوقتاً وہ جلسہ گاہوں کے درمیان، گشت لگایا کرتے اور بہ چشم خود ساری کارروائیوں کو نگاہ میں رکھا کرتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کسی حلقۂ خطابت میں چپکے سے آ بیٹھتے، غور سے شرکا کے پروگرام سنتے اور اخیر میں اپنے قیمتی نصائح سے حاضرین کو نوازتے۔ جس حلقے میں کسی بھی ہفتے وہ چلے جاتے، اس کا سر سارے حلقوں پر فخر سے،

پورے ہفتے اونچا رہتا، کہ مولانا اُن کے ہاں تشریف لے گئے۔

ماہانہ جلسے اسلامی مہینوں کے اختتام پر منعقد ہوا کرتے اور ہفتے واری اجتماعات کے ساتھ ساتھ، ماہ کی ۱۵ تاریخ سے ہی اس کی تیاریاں شروع ہو جایا کرتیں۔ تیاریوں کی دیکھ ریکھ مولانا بہ نفس نفیس کیا کرتے اور جان و دل سے ان میں شریک رہتے، تقریریں لکھتے، انھیں طلبہ میں تقسیم کرتے اور انھیں یاد کراتے؛ کیوں کہ اکثر طلبہ از خود اور برجستہ تقریر کر لینے کی صلاحیت، ظاہر ہے اتنی جلدی کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ مولانا ڈرامے لکھتے، افسانے تیار کرتے اور ان کے کردار کے حسبِ حال طلبہ کو تیار کرتے، مضامین لکھ کر طلبہ کو دیتے، ان کو لکھنے کا سلیقہ سکھاتے، وہ اس سلسلے میں صحت کی پرواہ کرتے نہ وقت کی، اکثر وبیشتر وہ رات کو ایک؛ بل کہ دو بجے سے پہلے نہ سو پاتے، پھر صبح سویرے بیدار ہو جاتے، فجر کی نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کے بعد، پھر اسی طرح تازہ دم اور چاق چوبند نظر آتے۔

ماہانہ اجتماعات سے دو تین روز قبل نو درہ اور باب قاسم (صدر دروازہ) کے بیچ کے دروازے — یعنی دارالاہتمام کے نیچے کے دروازے — کی دونوں پرشوکت دیواروں پر، جلسے کے پروگرام آویزاں کر دیے جاتے، جو

عموماً تقریروں، مقالات، ڈراموں اور ایمان و یقین و عزیمت کو مہمیز کرنے والے عربی ترانوں پر مشتمل ہوا کرتے تھے، جنھیں چند طلبہ تو خالص عربی سُر میں اور کانوں میں رس گھول دینے والی آواز میں پڑھا کرتے، ہوا کی دوش پر یہ آواز ساری فضاؤں میں، دور دور تک گھل مل جاتی اور ایسا محسوس

ہوتا کہ بادِ نسیم کے ساتھ، شعرائے عرب کی جنت نگاہ ''نجد'' سے کوئی روح افزا جھونکا آ گیا ہے۔

سارے اعلانات عربی زبان میں ہوتے، جن میں عصر جدید کے مطابق برتے جانے والے تمام آداب کا لحاظ ہوتا۔ اعلانات کی زبان بھی وہ ہوتی، جو اس وقت عالم عربی میں استعمال ہوتی ہے۔ مولاناؒ چوں کہ عربی کے سلسلے میں جدید ترین معلومات سے ہر آن بہرہ ور رہتے؛ اس لیے طلبہ ان سے اعلان کا سلیقہ اور جدید ترین طریقہ بھی سیکھ جاتے تھے۔

دل کی دھڑکنیں سننے والا مربی

ہفت روزہ، ماہانہ یا سالانہ اجتماعات میں مولاناؒ ہمیشہ ایک بیدار مغز، ذہین اور نہایت ہی ذمے دار فوجی افسر کا رول ادا کرتے، جو اپنے ماتحت فوجیوں کے دلوں کی دھڑکنیں اچھی طرح سن سکتا اور ان کی چھوٹی بڑی ساری غلطیوں کو گرفت میں لانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مولاناؒ بسا اوقات جلسے کے عین پروگرام کے دوران بہ یک جنبشِ اَبرو، یا بہ گوشۂ چشم، یا ہونٹوں کو ذرا دبا کر، پروگرام میں شریک کسی بھی طالب علم کی اصلاح کر دیتے؛ اگر وہ اُن آداب و قواعد کے برتنے میں غلطی کرتا، جو مولاناؒ نے اس موقع کے لیے اسے سکھائے تھے۔ جلسے کے درمیان اصلاح کر لینا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں، مولاناؒ اس سلسلے میں منفرد تھے اور وہ اس لیے بھی ایسا کر لے جاتے تھے، کہ وہ جلسوں سے قبل طلبہ کو باقاعدہ بتاتے تھے، کہ وہ کس طرح ایک

فرماں بردار اور سمجھ دار سپاہی کی طرح، ہر اشارے کو بروقت سمجھ کر، اس کو نافذ کریں گے۔ اس کے باوجود اگر کوئی طالب علم کم شعور ہوتا (اور لوگوں کی ان گنت قسمیں ہیں) تو مولاناؒ نہایت سلیقے سے دورانِ جلسہ اس کو غلطی پر متنبہ کرتے، مولانا کی سلیقہ مندی سے، جلسے کی زینت بڑھ جاتی اور کوئی بھونڈا پن پیدا نہ ہوتا۔

پروگرام میں شرکت کرنے والے طلبہ کو مولانا بتاتے کہ ان کے اور مائک کے درمیان کتنا فاصلہ ہو؛ تاکہ آواز صاف رہے؛ نیز یہ کہ ایک مقرر کو کس طرح ایستادہ ہونا چاہیے، اپنی حرکات وسکنات سے وہ کیا کام لے سکتا ہے اور ہاتھ کے اشاروں سے کسی موضوع یا لفظ کو حاضرین کے ذہن سے کتنا قریب کرسکتا ہے؛ اس کی خطابت کب زیادہ مؤثر، نفع بخش اور دیرپا اور دور رس اثرات کی حامل ہوسکتی ہے؛ اسی طرح ایک شاعر کو اپنا قصیدہ کس سلیقۂ دل نوازی سے پڑھنا چاہیے اور کسی مسرحیہ کے کردار کی تمثیل کرنے والوں کو کیا کرنا چاہیے؟ ایک مضمون نگار کو اپنا مقالہ کسی جلسے میں، کس طرح پڑھنا چاہیے؛ کیوں کہ پڑھی جانے والی چیز، اپنی چاشنی اور قدر و قیمت کے باوجود، سامعین کے لیے صبر آزما ہوتی ہے۔

ماہانہ اور سالانہ اجتماعات سے بہت پہلے ہی سے، مولاناؒ اُن آداب کی تعلیم، پروگرام میں حصہ لینے والوں کو دینی شروع کردیتے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ان کے برتنے سے پہلو تہی کرتا، تو بھلا مولاناؒ کب اس طرح کی نامعقولیت کو علم وادب وتربیت کے باب میں برداشت کرسکتے تھے، جب کہ

ان کی نازک اور حساس طبیعت کے لیے، زندگی کے کسی بھی شعبے میں، کسی احمق کی نامعقولیت کا برداشت کرنا بڑا مشکل تھا!

رجب کی ۱۵ر تاریخ یا اس سے ذرا پہلے، یا ذرا بعد منعقد ہونے والے سالانہ اجتماعات کے موقع پر، یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا، کہ مولانا نے طلبہ کی تعلیم و تربیت پر سال بھر کیسی عرق ریزی کی ہے۔ سالانہ جلسوں کے موقع پر ایک ہفتہ قبل سے، ہم لوگوں کو ایسا لگتا کہ دار العلوم میں شادی کا سا جشن ہے، یا عید کی سی چہل پہل ہے۔ مجمل قسم کے اعلانات تقریباً ایک ماہ قبل آویزاں کر دیے جاتے اور پندرہ روز قبل تفصیلی پروگرام منظرِ عام پر آ جاتا، جس میں شرکت کرنے والے سارے طلبہ کے نام اور یہ تصریح ہوتی کہ وہ خطیب، مقالہ نگار، نظم خواں یا ڈرامہ پیش کرنے والے، یا کس حیثیت سے شریک ہوں گے؛ تلاوتِ قرآن پاک کا شرف کون حاصل کرے گا، وغیرہ۔

اعلان نویسی کا بے مثال فن

چھوٹے بڑے، چوڑے اور لمبے سائز کے اعلانات سفید، سیاہ، سرخ، نیلے، زرد، کافی کے رنگ، گلابی رنگ یا سبز رنگ وغیرہ کے خط رقعہ، خط فارسی، ثلث، نسخ، ریحانی، دیوانی اور کوفی میں لکھے ہوئے، جاذب نظر اور نہایت خوب صورت؛ دفتر اہتمام کے زیریں دروازے کی دونوں دیواروں پر، اوپر سے نیچے تک نظر آتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک اعلان مثلاً دس سطروں کا ہے، تو ہر سطر کا خط اور رنگ، دونوں چیزیں، دوسری سطر کے خط اور رنگ سے

مختلف ہوتیں۔ اعلان نویسی بھی دارالعلوم کے طلبہ کا، اس دور میں ایک امتیازی فن بن گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض طلبہ کا خط، اتنا پاکیزہ ہو گیا تھا، کہ وہ عرب کے بعض خطاطوں کے خط سے آنکھیں ملا سکتا تھا۔ مولاناؒ چوں کہ ممتاز خطاط بھی تھے؛ اس لیے اُنھوں نے طلبہ کو اس کی بھی مشق کرائی، بہت سے طلبہ اس کوچے میں اتنا آگے نکل گئے، کہ بہ قول ان کے: خود ان سے بھی آگے بڑھ گئے اور انھوں نے اسے باقاعدہ ذریعہ معاش یا ذریعہ خدمتِ علم و دین بنالیا۔

سالانہ اجتماعات کے لیے جلسہ گاہ کی تیاری

جس رات کو سالانہ جلسہ منعقد ہوتا، اس سے پہلے والے دن مرکزی ہال کو، اس مقصد کے لیے اچھی طرح تیار کیا جاتا۔ یہ کام طلبہ کرتے، مولانا ان کی نگرانی کرتے۔ سارے ہال میں سفید چاندنی بچھائی جاتی، تپائیوں کو چاندنی پر قرینے سے دو رُویہ لگا کر، دونوں گیلریوں اور دار جدید کی طرف سے سیدھے راستے بنائے جاتے، جو اسٹیج پر جا کر ختم ہو جاتے۔ ہال کو اس طرح سجایا جاتا کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ ہال کی دیواروں اور اس کے پر شوکت دروازوں پر نہایت خوب صورت طغرے اور بڑے بڑے سائز کے فریم لگائے جاتے، جنھیں ماہر خوش نویس طلبہ تیار کرتے، ان میں بانیِ دارالعلوم اور دارالعلوم کے فرزندوں کے حالات اور آیات و احادیث لکھی ہوتیں؛ نیز ہندوستان میں علوم وفنون کے باکمال لوگوں کی تاریخِ وفات وولادت بھی۔

اسٹیج کی تیاری وگل کاری؛ بل کہ مینا کاری پر خاص توجہ صرف کی جاتی

اور مولاناؒ اور مولاناؒ کے فوجی (جو بھوک، پیاس، بے خوابی، تکان: ساری چیزوں کو برداشت کرنے کے عادی تھے) اسٹیج پر ذمے داروں کے بیٹھنے کی جگہ، چھوٹی چھوٹی خوب صورت کاغذی تختیوں سے متعین کر دیتے، جن پر سبھوں کے نام خوب صورت عربی خط میں لکھے ہوتے، نیز یہ بھی کہ صدرِ جلسہ کی نشست کہاں ہوگی؛ شرکائے پروگرام کہاں بیٹھیں گے؛ مہمانانِ کرام کس جگہ فروکش ہوں گے اور اساتذۂ گرامی کی نشست گاہ کہاں ہوگی؟

جلسہ گاہ میں بیٹھنے کی دل چسپ ہدایات

ایک دل چسپ بات یہ بتا تا چلوں کہ، سالانہ جلسے کے انعقاد سے ہفتہ عشرہ پیش تر مولاناؒ، نادی سے متعلق سارے طلبہ کو ہال میں بیٹھنے کی بھی ٹریننگ دیتے۔ وہ بتاتے کہ اگر حاضرین کی تعداد کسی وجہ سے کم ہو، تو وہ آناً فاناً، ہال میں اس طرح پھیل کر بیٹھ جائیں کہ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا محسوس ہو اور اگر حاضرین کی کثرت ہو، تو سائے کی طرح سمٹتے جائیں، تا آں کہ اگر ضرورت پڑے، تو ہال سے بالکل ہی نکل جائیں؛ تاکہ مہمان اور نادی کے ممبران کے علاوہ دیگر طلبہ آرام سے بیٹھ سکیں۔

النادی کے جلسے، ایک نیا رنگ و آہنگ

نادی کے سالانہ اجتماعات خصوصاً اور دیگر جلسے عموماً، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے، ملک کے گوشہ گوشے سے آئے ہوئے طلبہ کے لیے،

بالکل نئے ہوتے، اپنے معنی و مفہوم اور شکل وصورت، انتظامات و تیاریاں، پروگرام اور سج دھج: ساری چیزوں کے اعتبار سے؛ اس لیے کہ برصغیر کے مدرسوں کے قائد و رائد دارالعلوم دیوبند میں، ایک زندہ اور متحرک شکل میں، مولاناؒ کی حجازی بانسری سے عربی لَے نکلنے سے قبل، برِصغیر کے کسی بھی مدرسے میں اس جامع ترین اور خوب صورت ترین شکل میں (جس کی کچھ تفصیل آپ نے سابقہ صفحات میں پڑھی) اس طرح کے جلسوں کا کوئی نظام موجود نہ تھا۔

ہمارے بہت سارے دوستوں نے مولاناؒ کی صحبت اور نادی کے پروگراموں سے مستفیض ہوکر علم وادب میں مہارت کے ساتھ ساتھ، انتظامی اور تنظیمی صلاحیت پیدا کرلی، نیز کسی جماعت یا انجمن کی سربراہی، جوانوں کی تربیت، اسلامی بیداری کی راہ نمائی، انقلاب کی قیادت اور کسی مدرسے یا ادارے کے انصرام کی لیاقت بہم پہنچائی۔ نادی کی پیہم سرگرمیوں نے، جن میں مولاناؒ روز بروز نت نئے طریقوں کا اضافہ کیا کرتے، انھیں زندگی کے نفع ونقصان سے واقف کرادیا۔ بعضوں کی قسمت نے یاوری کی، تو انھوں نے اس کی برکت سے، ایسی شہرت وعزت حاصل کی، کہ دولت و ثروت نے بھی ان کے قدم چومے۔ بہت سے احباب مدرسوں کے مہتمم بن گئے، کچھ عصری یونیورسٹیوں میں پروفیسر یا لکچرر ہوگئے اور سینکڑوں؛ بل کہ ہزاروں وہ ہیں، جو برصغیر کے مدرسوں میں کام یاب ترین مدرس ہیں۔ تصنیف وتالیف اور دعوت وصحافت کے میدانوں میں بھی سینکڑوں حضرات دادِ صلاحیت دے رہے ہیں۔

سالانہ اجتماعات اور عید کی سی چہل پہل

جلسے والے دن اور رات میں یوں لگتا کہ سارا دارالعلوم نور و سرور کے زرق برق لباس میں رقصاں ہے، سارے طلبہ اس جلسے میں شرکت کے لیے، اس طرح تیاری کرتے، جیسے انھیں کسی جشنِ شادی میں شرکت کرنی ہو۔ وہ اِس کے لیے اپنے ضروری اسفار اور بعض نہایت ضروری کاموں کو مؤخر کر دیتے؛ بل کہ بہت سی لذیذ اور عزیز چیزوں کی بھی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتے۔

اس جلسے کی صدارت، ہر سال ہندوستان کا کوئی بڑا افاضل گرامی کیا کرتا؛ لیکن ایک مرتبہ کے بعد کوشش ہوتی، کہ اب کسی دوسرے کو زحمتِ صدارت دی جائے۔ جلسے کی صدارت کرنے والے سارے علمائے کرام کا اس پر اجماع رہا کہ انھوں نے اپنی زندگیِ مستعار میں ایسا جلسہ، ہند یا بیرون ہند نہیں دیکھا، جو طلبہ کی دل چسپی، تربیت، انتظام و انصرام، ڈسپلن، اُن کی محنت، ان کے شعور اور ان کے مربی کے اخلاص کے سلسلے میں، اس جیسا ہو۔ ان لوگوں کے الفاظ مختلف ہوتے، مگر مطلب یہی ہوتا کہ یہ جلسہ اپنی نظیر آپ ہے۔

ٹی پارٹی یا تربیت گاہ

جلسے والی شب کی صبح کو، صدرِ جلسہ اور مہمانوں کے اعزاز میں، ایک پروقار ٹی پارٹی ترتیب دی جاتی، جس میں نادی کے ممبران بھی شریک ہوتے۔ یہ ٹی پارٹی بھی ایک مدرسہ ہوتی، کیوں کہ مولاناؒ طلبہ کو بتاتے کہ وہ

کس طرح کھائیں، کتنی مقدار میں کھائیں، یا نہ کھائیں؛ مگر دوسروں کو کھانے کا موقع دیں۔ اسی طرح وہ مہمانوں کی خدمت کے لیے، پارٹی کے دوران ہر طرف طلبہ کو اس طرح متعین کر دیتے، جیسے مسلح افواج کو خطروں کی جگہوں کی حفاظت پر مامور کر دیا جاتا ہے؛ چناں چہ وہ نہایت چستی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے، چاہے "مالِ غنیمت" ملے یا نہ ملے۔ جلسے کے علاوہ عام دنوں میں بھی، مولاناؒ اکثر طلبۂ نادی کو جمع کر کے، ان کے ساتھ ماحضر تناول فرماتے اور خورد و نوش کا سلیقہ عملی طور پر سکھاتے۔

اس سلسلے کا ایک دل چسپ واقعہ یاد آ رہا ہے: ایک مرتبہ ایک دوست نے ایک بڑی قاب سے، بہت سارا گوشت اپنی پلیٹ میں انڈیل لیا، مولاناؒ کے دستر خوان پر ہم تقریباً ۳۰-۳۵ طلبہ اس وقت موجود تھے، اس طالب علم کے اتنی مقدار میں گوشت کی بوٹیاں لے لینے کے بعد، دوسرے لوگوں کے لیے کچھ بوٹیاں اور صرف شوربا بچ سکا۔ مولاناؒ نے اس کو تنبیہ کی، مولاناؒ چوں کہ ہر دل عزیز تھے؛ اس لیے کسی طالب علم کو، ان کا ڈانٹنا یا اس کی غلطی پر متنبہ کرنا، اس کو ذرا بھی برا نہیں لگتا تھا۔ اس کے بعد مولاناؒ نے یہ نصیحت فرمائی: برادرانِ عزیز! دستر خوان پر تمھارے سامنے، جب کوئی کھانے کی چیز آئے اور کئی آدمی شریکِ طعام ہوں، تو تم ذہنی طور پر یہ تقسیم کر لو کہ اس میں تمھارا حصہ کتنا ہے؟ اپنے حصے سے زیادہ اپنی پلیٹ میں ہرگز نہ لو، چاہے شرکائے دستر خوان کتنا ہی اصرار کیوں نہ کریں۔

اس کے بعد مولاناؒ نے اپنا بیتا ہوا ایک اور واقعہ اس پر لطف انداز میں

سنایا کہ ہم لوگ ہنستے ہنستے بے خود ہو گئے: فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے ایک دوست نے، جو دہلی کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، مجھے اطلاع بھیجی، کہ فلاں دن فلاں وقت، میں تمھارے پاس ملنے آرہا ہوں، میرے پاس وقت تھوڑا ہے؛ اس لیے صرف آدھ گھنٹہ رک سکوں گا۔ میں نے اُن کے لیے چائے کا انتظام کیا اور بازار سے اچھے قسم کے رس گلے منگوا لیے۔ وہ ٹھیک اپنے وقت پر آ گئے۔ علیک سلیک کے بعد، میں نے چائے اور ماحضر پیش کیا، ہم دونوں ابھی دسترخوان پر بیٹھے ہی تھے کہ ایک مولانا صاحب تشریف لے آئے۔ ہم لوگوں نے شریکِ بزم ہو جانے کی دعوت دی، چناں چہ وہ بیٹھ گئے۔ ابھی ہم لوگ مشکل سے ایک آدھ رس گلا لے سکے ہوں گے، مگر وہ چمچے سے ایک مرتبہ میں ایک عدد اٹھا کر، پوری چابک دستی اور منھ کی صفائی سے ہضم کر جاتے اور ہر چمچے کے بعد ہم لوگوں سے کہتے: لیجیے لیجیے، آپ لوگ کیا خاک لے رہے ہیں؟ اس طرح انھوں نے پانچ منٹ میں سارے رس گلے اور نمکین ختم کر دیے اور پروفیسر صاحب، اُن کا منھ دیکھتے اور اُن مولانا کی عدمِ شائستگی پر سر پیٹ کر رہ گئے۔

راقم الحروف کو ایک سے زیادہ سالانہ جلسوں میں شرکت کا موقع ملا، ایک جلسے کے موقع پر، میں نے ایک ڈرامے میں، پولیس والے کا رول ادا کیا اور بہت سے چوروں، ڈاکوؤں اور عزت و ناموس کے لٹیروں کو پکڑ لیا، جب کہ میں صغیر السن تھا، زندگی اور لوگوں سے قطعاً ناواقف تھا!

بے مثال اخوّت ومحبت

نادی کے اجتماعی کام کے ذریعے، مولاناؒ نے طلبۂ نادی کے درمیان اخوت ومحبت کی بنیاد، اس درجہ استوار کردی تھی کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسی محبت واخوت، کسی ادارے، محفل اور انجمن کے ارکان کے مابین دیکھی، نہ پڑھی، نہ برتی۔ ظاہر ہے صحابہ کی اخوت اور بعض اسلامی اور تبلیغی جماعتوں کی اخوت ومحبت، اس ہمارے دائرہ موضوع سے باہر ہیں۔ اجتماعی کام کے لیے، اخوت ومحبت کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے، جو انسان کو ایک دوسرے کی کم زوریوں کو برداشت کرنے اور اس کے لیے معقول عذر تلاش کر لینے پر آمادہ کرتی ہے اور ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے نیچ اونچ سے جو تکلیف پہنچ سکتی ہے، اس کو گوارا کر لینے کی خو پیدا کر دیتی ہے ـــــ کہ بہ قول علامہ اقبال:

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا، آئی نہیں
اُس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی، نہیں

اور

یہ جوہر اگر کار فرما، نہیں ہے
تو ہیں علم وحکمت، فقط شیشہ بازی

شعبۂ تحریر اور اس کا طریقۂ کار

شعبۂ تحریر کا ایک باقاعدہ نظام ہوا کرتا تھا، اس شعبے کا بھی ایک ناظم ہوا

کرتا اور اس کے ماتحت متعدد طلبہ نگرانی کے فرائض انجام دیتے۔ یہ طلبہ باصلاحیت اور ہوش مند ہوتے۔ اس شعبے میں طلبہ، عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے اور عربی میں مقالہ لکھنے کی مشق کرتے۔ ان کے نگراں شعبۂ خطابت والوں کی طرح، شعبے سے متعلق طلبہ کی پیہم اور مکمل روداد مولاناؒ کو پیش کرتے۔ مولاناؒ رپورٹ پر ذاتی تجزیے اور براہ راست جائزے کی روشنی میں، طلبہ کی ترقی اور عدمِ ترقی کا بنیادی سبب تلاش کرکے، اس کے ازالے کے طریقے وضع کرتے۔

دیواری رسالوں کا نظام، بزمِ خطابت کی طرح ہمہ گیر ہوا کرتا۔ اس شعبے سے بیسیوں رسالے نکلتے، ان کے مدیر ہوتے، ان کے ماتحت مجلسِ ادارت میں کئی طلبہ شامل ہوتے، اس شعبے کا ذمے دار بھی باشعور اور سمجھ دار طالب علم ہوا کرتا۔ ہر مدیر کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنا رسالہ، اپنے قلم سے لکھے، مضامین بھی؛ یا تو خود ہی لکھے یا اپنے احباب سے لکھوائے؛ لیکن رسالہ وقتِ معین پر نکلنا ضروری ہوتا؛ چناں چہ مدیر حضرات مجبور ہوتے کہ وہ اپنی تحریر چند ہفتوں کے اندر درست کرلیں۔ اس طرح بہت سے طلبہ بہ یک وقت انشا پرداز اور خوش خط دونوں بن گئے۔ مولاناؒ کا طریقہ تھا کہ اُسی طالب علم کو مدیر بناتے، جس کے متعلق اندازہ کرلیتے، کہ اس میں مضمون نگاری کے ساتھ، حسنِ خط کا جوہر بھی موجود ہے اور ذرا سی توجہ اس کو درجۂ کمال تک پہنچادے گی۔ چناں چہ وہ سلیقہ مندانہ راہ نمائی کے ذریعے، یہ کمال اس میں پیدا کروا چھوڑتے۔

بات دیواری پرچوں کی چل رہی تھی، تو اب سنیے کہ ان پرچوں کو تقریباً ایک میٹر لمبے اور پون میٹر چوڑے چکنے اور موٹے کاغذ پر لکھا جاتا، پھر شیشوں کے تیار فریموں میں ڈال کر، عموماً دارالاہتمام کے نیچے والے دروازے کی دوطرفہ دیواروں پر آویزاں کردیا جاتا۔ یہ پرچے طلبہ میں لکھنے پڑھنے کا ذوق اور مطالعہ، نیز معلومات میں وسعت پیدا کرنے کی خواہش کو بیدار کرتے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ بہت خوب صورت منظر بھی پیش کرتے اور مشکل تھا کہ کوئی وارد وصادر، مہمان اور بیرونِ دارالعلوم سے آنے والا طالب علم، یا استاذ اسے نہ دیکھے اور دیکھ کر خوش نہ ہو۔

رسالوں کے نام سب سے اوپر اور بیچوں بیچ میں لکھے جاتے، یہی طریقہ رائج تھا اور عموماً کوفی خط میں، کہ طلبہ کا خیال تھا کہ وہ زیادہ خوب صورت لگتا ہے، نیز اس کو سنوارنا اور آراستہ کرنا بھی آسان ہوتا ہے؛ لیکن باقی صفحات خط نسخ میں لکھے جاتے۔

یہ رسالے مختلف الطبائع تھے: بعض کا رنگ دینی، بعض کا سیاسی، بعض کا ادبی ہوتا؛ جب کہ بعض جامع ہوتے۔ ہمارے دور میں "الربیع" "السیاسة" "النهضة"(۱۱) "الروضة" اور "النادی" حددرجہ مقبولِ عام رسالے تھے،

---

(۱۱) (النهضة) کی ادارت راقم الحروف کے ذمے تھی اور میرے نائب، میرے دوست مولانا مجیب اللہ قاسمی گونڈوی (حال استاذ دارالعلوم) تھے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ خط نسخ تو مجھے اچھا خاصا آتا تھا؛ لیکن خط رقعہ لکھنے کا سابقہ، اس دیواری رسالے کی ادارت سے قبل نہیں پڑا تھا۔ مجھے اس حسین خط کو سیکھنے کی بڑی خواہش تھی، کہ اس میں طویل سرخی بھی ذرا سی جگہ میں لکھی جاسکتی ہے۔ اتفاق سے میں اپنے رسالے کے پہلے شمارے کی کتابت کے لیے النادی کے دفتر (موجودہ درس گاہِ تکمیل ادب عربی) میں بیٹھنے ہی جارہا تھا، کہ ←

ان میں لکھنے والے قلم کافی حدتک خوب صورت تھے۔ " النادی " اور "الربیع" ادبی مزاج کے تھے، ان دونوں کی زبان، اس وقت ہم ''نوگرفتاروں'' کے لیے خاصی دشوار تھی۔

میں یہ لکھنا بھول گیا کہ نادی کا ایک بھراپُرا کتب خانہ تھا۔ عالم عربی کے مطابع سے تازہ نکلی ہوئی کتابیں، مولاناؒ نے بڑی مشکلوں سے کسی طرح طلبہ کے لیے حاصل کی تھیں۔ یہ مکتبہ عصر بعد کھلتا، اس کے مدیر کتابیں تقسیم کرتے اور وقتِ متعین پرطلبہ اُنھیں واپس کردیتے۔ طلبہ ان عربی روزناموں اور رسالوں سے بھی مستفید ہوتے، جو بہ راہ راست نادی کے دفتر میں آتے یا ''دعوۃ الحق'' کے دفتر میں ''دعوۃ الحق'' عربی کا سہ ماہی رسالہ تھا، جو مولاناؒ ہی کی ادارت میں دارالعلوم دیوبند سے نکلتا تھا۔

النادی کے ماتحت کچھ فنڈ

نادی سے متعلق کچھ فنڈ بھی تھے: ''نادی فنڈ'' ''قرض فنڈ'' ''بچت فنڈ''

← حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی بنارسی (دارالعلوم میں میرے صف ابتدائی کے استاذ) رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم واستاذ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، بنارس، کہیں سے ادھر آنکلے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا خط رقعہ پاکیزہ ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ کم از کم ایک مضمون کی شاہ سرخی اپنے قلم سے تحریر فرمادیں: تاکہ ان کے شاگرد کے لیے باعث افتخار بھی ہو اور باعث برکت بھی۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے، کہ انھوں نے خط رقعہ میں خوب صورت سی سرخی لکھ کر، میرے رسالے کی بسم اللہ کرادی۔ پھر خدا کی توفیق سے، دقت نظر سے مشق کرکے، میں نے صرف دوتین روز میں ان کے قلم سے قلم ملادیا۔ میں اب کس کو کس طرح بتاؤں کہ میں نے بعد کی عملی زندگی میں، اپنی عربی کی خوش خطی سے بھی، کتنے فائدے حاصل کیے، کتنے ہفت خواں طے کیے اور کتنے ''معرکے'' سر کیے، وفعلُ الرّبِّ الحکیمِ لا یخلُو من الحکمۃ۔

''امدادی فنڈ''۔ فنڈ کا یہ معقول اور کار آمد نظام بھی، مولاناؒ کی ذہانت کا فیضان تھا۔ اس کے ذریعے بھی نادی نے غریب اور نادار نیز بیمار طلبہ کی کافی مدد کی اور اپنی ضروریات بھی پوری کیں، اِسی کی راہ سے، طلبہ نے بہت کچھ غم خواری و ہم دردی کے سبق سیکھے اور برتے۔

اس طرح نادی ایک سے زیادہ میدانوں میں سرگرم عمل رہتی، طلبہ کو علم وادب سے زیادہ کچھ سکھا دیتی اور اِس طرح مولاناؒ کی فکر، جامع اور ہمہ گیر ہوا کرتی، وہ جوانوں کی تربیت کے لیے، ہمیشہ نئے نئے گوشے اور شوشے تلاش کرلیا کرتے۔

عربی زبان کی طویل اور ہمہ گیر خدمات

اس جاں فشانی کے ذریعے مولاناؒ نے اپنے شاگردوں میں عربی زبان کی محبت؛ بل کہ اس سے والہانہ عشق پیدا کردیا، چناں چہ انھوں نے دیوبند سے فارغ ہوکر، برِصغیر کے طول وعرض میں پھیلے ہوے مدرسوں میں مدرّس بن کر، مولاناؒ کی طرز پر اس کی تدریس شروع کردی اور ان کے ذریعے عربی زبان کا حلقہ اتنا وسیع ہوا، جتنا اور کسی طریقے سے نہ ہوا، نہ ممکن تھا۔

القاموس الجدید کی تالیف

مولاناؒ کی عربی زبان کی خدمت، صرف تدریس اور مدرسین تیار کرنے کے دائرے تک محدود نہیں رہی۔ انھوں نے عربی زبان کی مخلصانہ خدمت

کے لیے دو عربی لغات "القاموس الجدید" اردو سے عربی اور "القاموس الجدید" عربی سے اردو ۱۹۵۲-۱۹۵۹ء کے عرصے میں لکھے۔ یہ دونوں کتابیں بہت سارے نئے الفاظ کا احاطہ کرتی ہیں، جو آج کل عالم عربی میں اخبار و رسائل میں مستعمل ہیں، یا جن کو عربی زبان نے اس طرح سمولیا ہے کہ ان سے اب کسی مصنف یا اہل قلم کو مفر نہیں۔ یہ کتابیں چوں کہ وقت کی ضرورت تھیں، برصغیر میں اس طرح کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی اور اب تک نہیں لکھی جا سکی؛ اس لیے بے پناہ مقبول ہوئیں۔ دونوں کے بے شمار ایڈیشن چھوٹے بڑے سائز کے نکلے۔ لغت کی یہ دونوں کتابیں اُن چند کتابوں میں ہیں، جو مقبولیت میں ضرب المثل ہیں۔ مقبولیت کو دیکھتے ہوے بعض لوگوں نے، ان کی سی شہرت حاصل کرنے کے لیے، بعض کوششیں کیں، جو اس سطح تک نہ پہنچ سکیں۔ پاکستان میں تو یار لوگوں نے یہاں تک جرأت کی کہ دونوں کتابوں کے سرورق سے، مولاناؒ کا نام اڑا دیا اور ناشر نے اپنا یا غالباً کسی کمیٹی کا نام ڈال دیا۔ یہ دونوں کتابیں ہندی نژاد طلبہ اور اساتذہ کے لیے کس درجہ ناگزیر ہیں، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ راقم الحروف نے عالم عربی کی جامعات میں زیرِ تعلیم سارے ہندی اور پاکستانی طلبہ کے پاس، دونوں کتابوں کے نسخے ضرور دیکھے۔

القراءۃ الواضحہ کی تالیف

۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۰ء کے عرصے میں مولاناؒ نے "القراءۃ الواضحہ" کے

نام سے تین جلدوں میں عربی زبان کا ریڈر لکھا اور اس کی گائڈ بک بھی تیار کی، جس میں عربی زبان کے اسباق، طلبہ کے معیارِ زبان و ثقافت کا لحاظ کرتے ہوے، اس طرح لکھے ہیں کہ اس میں منزل بہ منزل کی مکمل پابندی ہے، طالب علم کو کسی طرح کی دشواری معلوم نہیں ہوتی، چناں چہ پہلا حصہ زیادہ آسان ہے، دوسرا حصہ اس کی بہ نسبت قدرے مشکل ہے اور تیسرے حصے کا معیار قدرے اس سے بھی بلند ہے۔ ہر حصے کے اسباق میں بھی آسان سے مشکل کی طرف آنے میں تدریجاً پیش قدمی کی گئی ہے۔ مولاناؒ نے کوشش کی ہے کہ شروع سے ہی نحو وصرف کا دشوار گزار بوجھ، ایک مبتدی کے دوشِ ناتواں پر نہ پڑے؛ کہ یہ بعض دفعہ ہمت ہار جانے کا بھی سبب بن جایا کرتا ہے۔ ویسے بھی اِس بات کو ہمارے مدارس کا حلقہ (جو بہت سی وجوہات کی بنا پر زبان وادب سے، بڑی حد تک بے پروا رہا ہے) سمجھنے لگا ہے کہ کوئی زبان قواعد سے نہیں بنا کرتی؛ بل کہ زبان سے قواعد معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

مولاناؒ کی یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی، وہ برصغیر کے عربی مدرسوں کے علاوہ متعدد سرکاری کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں داخلِ نصاب ہے، خود دارالعلوم دیوبند میں بھی اب تک زیرِ تدریس ہے۔

اس عرصے میں مولاناؒ کو محسوس ہوا کہ عالم عربی میں، عربی زبان کے تازہ دم اور پیہم رواں قافلے میں ''القاموس الجدید'' کی تالیف کے بعد سے، اب تک بہت سے نئے الفاظ و اصطلاحات ومحاورات شامل ہو گئے ہیں:

اس لیے ایک دوسری اور مستقل کتاب کی شدید ضرورت ہے، وقتاً فوقتاً وہ کثرتِ مشاغل کی وجہ سے ''القاموس'' میں ضمیمہ لگانے پر اکتفا کرتے رہے، آخرش ۱۹۸۸ء میں اپنے مشغول اوقات کو فارغ کرکے، ایک ضخیم قاموس مرتب کر، اسے اسی سال شائع کردیا۔ الحمد للہ وہ بھی ان کی دیگر کتابوں کی طرح مقبول عام ہے اور ''القاموس الاصطلاحی'' کے نام سے معروف ہے۔

القاموس الجدید میں اضافے کے لیے حضرتؒ سے میری درخواست

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کئی سال تک زبان وادب کی تدریس اور عربی زبان میں تحریری مشاغل کے بعد، مجھے بھی ذاتی طور پر اندازہ ہوا کہ مولاناؒ اگر اپنی ''قاموسین'' میں اس طویل عرصے میں معرضِ وجود میں آنے والے الفاظ شامل کردیں، تو اُن کی افادیت اور قدر و قیمت بہت بڑھ جائے گی: ورنہ نام آوری کے خواہش مند بہت سے ناتجربے کار ''خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھانے'' کے بھونڈے عمل سے گریز نہ کریں گے: چناں چہ پاکستان میں بعض ادارے مولاناؒ کا نام اڑا، کسی اور کی طرف منسوب کر، من وعن مذکورہ لغت کو شائع بھی کرچکے تھے۔

اس صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حقیر نے جرأت کرکے، ایک عریضے کے ذریعے، اُن سے درخواست کی اور اپنی مذکورہ بالا خواہش کا اظہار کیا، تو نہ صرف یہ کہ میری گزارش قبول کی؛ بل کہ عنایت نامے میں اس تجویز کو

بہت سراہا اور لکھا، کہ میں عربی زبان ولغت کے سلسلے میں کچھ مزید منصوبوں کو عملی جامہ پہنا رہا ہوں۔ غالباً راقم الحروف کی درخواست کی وجہ سے ہی حضرت مولانا کو "القاموس الاصلاحی" کی مستقل تالیف، یا "القاموس الجدید" میں ضمیمہ لگانے کی تحریک ہوئی ہوگی، جیسا کہ ان کے عنایت نامے سے مترشح ہے۔ ذیل میں مکتوب گرامی من وعن نقل کیا جارہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند

۱۳۹۷/۶/۷ھ

"برادرِ عزیز القدر! زید علمکم وصلاحکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عرصے کے بعد آپ کا مودّت نامہ ملا، عرصے سے ملاقات نہ ہوسکنے کی قدرے تلافی ہوئی۔ کئی بار اطرافِ لکھنؤ کا پروگرام بنا اور پھر بعض مجبوریوں کے تحت ملتوی ہوگیا، رمضان سے قبل اُس طرف ان شاء اللہ ضرور آنا ہوگا، اُس وقت ملاقات ہوسکے گی۔

آپ نے جس محبت وخلوص سے "القاموس" اور عربی زبان کے سلسلے میں کام کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس کی تہِ دل سے قدر کرتا ہوں۔ کام کسی حد تک شروع کرچکا ہوں، خیال یہ ہے کہ فی الوقت القاموس اردو۔عربی اور عربی۔اردو: دونوں کا ضمیمہ تیار کرکے شائع کردوں اور اُس کے بعد، ایک بڑے لغت کی تیاری شروع کردی جائے۔ اس وقت موجودہ القاموس، اس میں ضم ہوجائے گی اور ترتیب وغیرہ سب بدل

جائے گی۔ آپ نے جن امور پر توجہ دلائی ہے، پیشِ نظر رہیں گے اور تحریر کردہ کتب بھی اکثر موجود ہیں، جو نہیں ہیں، وہ بھی جلد آ جائیں گی۔

نیز ایک ایسی کتاب کی تیاری بھی پیشِ نظر ہے کہ جس میں زندگی کے مختلف شعبہ جات سے متعلق، عنوانوں کے تحت اصطلاحات و تعبیرات اور اُن کا اردو ترجمہ لکھا جائے۔ یوں سمجھیے کہ ایک موضوع وار ڈکشنری ہوگی اور اس میں زیادہ استعمالی جملے اور تعبیرات ہوں گی۔ آپ بھی اس بارے میں اپنی رائے لکھیے کہ کیا یہ کتاب مفید رہے گی؟ یہ کتاب ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ، لغت کا مواد بھی بہت عمدہ جمع ہو جائے گا اور اس کی ترتیب میں مدد ملے گی۔

نیز کچھ عربی پمفلٹ علمی، ادبی، معلوماتی اور دینی موضوعات پر شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ چار پمفلٹ طبع ہو چکے ہیں، جو بھیج رہا ہوں اور دیگر جلد طبع ہوں گے۔

گاہ بہ گاہ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیے۔''

والسلام، طالبِ خیر و دعا: مخلص وحیدالزماں

القاموس المحیط

وفات سے چند روز قبل انھوں نے ''القاموس المحیط''(۱۲) (عربی سے اردو) کے نام سے ایک جامع اور ضخیم لغت کی تالیف کا کام مکمل فرمایا۔ یہ

(۱۲) اس ڈکشنری کا ایک نام ''القاموس الوحید'' بھی زیرِ غور ہے۔

لغت بڑے سائز کے کم از کم (۱۹۵۰) صفحات میں آسکے گا۔ اِس وقت وہ کتابت کے آخری مرحلے میں ہے، ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ قدیم اور جدید الفاظ وتعبیرات کا یہ جامع لغت طلبہ، مدرسین اور عربی زبان وادب سے اشتغال رکھنے والے تمام ہی حضرات کے لیے، نہ صرف یہ کہ ناگزیر ضرورت بن جائے گا؛ بل کہ بہت سے لغات سے مراجعت کرنے کی زحمت سے بھی بے نیاز کردے گا۔ حضرت الاستاذؒ کی بہت خواہش تھی کہ یہ لغت جلد زیورِطبع سے آراستہ ہوکر، اہلِ علم کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔ افسوس ہے کہ زندگی نے مہلت نہ دی اور اس گراں قدر علمی کاوش کو، شائع شدہ دیکھ کر، اپنی آنکھ ٹھنڈی نہ کرسکے۔

نفحۃ الأدب

دارالعلوم دیوبند میں عرصے سے یہ احساس پایا جاتا تھا کہ درسِ نظامی میں مُتداوَل عربی نثر کی کتاب "نفحة اليمن" جس میں بعض ایسے نامناسب قصے اور اشعار درج ہیں، جو عریاں نویسی کے دائرے میں آتے ہیں؛ نہ صرف دینی مدرسوں کے ماحول اور اس کے اعلیٰ وارفع مقاصد سے ہم آہنگ نہیں؛ بل کہ اُن نوعمر طلبہ کے لیے بھی کسی طرح موزوں نہیں، جو عمر کی اس منزل میں تاثّر وانفعال کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوتے ہیں؛ اس لیے مجلس شوریٰ دارالعلوم کی تجویز کے مطابق حضرت مولاناؒ نے مذکورہ کتاب کے متبادل کے طور پر عربی حکایات وقصص پر مشتمل " نفحة الأدب " کے

نام سے، عربی نثر کا ایک مناسب نمائندہ مجموعہ تالیف فرمایا، جو دارالعلوم اور دیگر بہت سارے عربی مدرسوں میں داخلِ نصاب ہے۔

سلسلة الدروس العربية

مولاناؒ، عربی زبان وادب کی خدمت ١٩٤٨-١٩٥٢ء کے عرصے سے کرتے رہے تھے، جب وہ طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر فارغ ہوئے۔ وہ زمانۂ طالب علمی میں "سلسلة الدروس العربية" کے عنوان سے عربی کے اسباق لکھ کر، دارالعلوم کی دیواروں پر آویزاں کرتے اور طلبہ میں عربی زبان کا ذوق وشوق، بیدار کرتے تھے۔ اس زمانے میں دارالعلوم میں کوئی عربی مہمان آتا، تو اس کے لیے مولاناؒ ہی سپاس نامے لکھتے اور استقبالیہ جلسوں میں تعارفی تقریریں بھی کرتے۔

جواہر المعارف

عرصے سے اُن کا خیال تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی پاکستانیؒ (متوفی ١٣٩٦ھ) کی مشہور ومقبولِ خاص و عام تفسیر "معارف القرآن" میں جوگراں قدر علمی وتحقیقی مباحث، مختلف مقامات میں بکھرے پڑے ہیں، اُنھیں اگر آٹھ جلدوں پر مشتمل مذکورہ تفسیر سے علاحدہ کرکے، دو تین جلدوں میں مستقل طور پر شائع کردیا جائے، تو وہ شائقانِ علم کے لیے، بے حد مفید ہوں گے، پھر انھیں عربی اور دیگر زبانوں میں بھی منتقل

کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ ۱۹۹۴ء میں اپنی علالت اور کم زوری کے باوجود، کئی ماہ کی مسلسل محنتِ شاقہ کے بعد، انھوں نے یہ کام مکمل کرلیا، جس کی پہلی جلد ''جواہر المعارف'' کے نام سے اکتوبر ۱۹۹۴ء میں ''دار المؤلفین'' سے شائع ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ مولاناؒ کے فرزندان، عن قریب ہی دیگر جلدوں کو شائع کر کے، اس خزانۂ جواہر کو عشّاقانِ علم و دانش تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ مذکورہ مجموعے میں تخلیقِ کائنات، خلافت الٰہیہ، بعثت انبیا، توحید و رسالت، جزا و سزا اور قیامت وحشر و نشر ایسے دقیق تفسیری مباحث شامل ہیں۔ طالبِ علم اور اہلِ علم کو ترتیب وار، ان کے مطالعے میں بڑی سہولت ہوگی

ترجمۂ قرآنِ پاک کا آغاز

حضرت مولاناؒ کی زندگی کے آخری دو تین سالوں کے دوران، ناچیز نے اُن کے ساتھ مغربی یو۔پی کے مختلف علاقوں اور مقامات کے کئی ایک دینی اور ثقافتی سفر کیے۔ اُن علاقوں میں ناگل، پانڈولی، گاگل ہیڑی، چھٹمل پور، سہارن پور، رائے پور، مرزاپور، ریڑھی تاج پورہ، تاوَلی، باغوں والی، مظفر نگر، کھتولی، مرادآباد، شاہ جہاں پور، ہاپوڑ، کٹھور، شاملی، بجنور، نجیب آباد، چاند پور اور خورجہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان اسفار کے دوران مدرسوں اور دینی و فلاحی اداروں کو، قریب سے دیکھنے، سمجھنے، اُن کے طریقۂ کار سے واقف ہونے اور ان کے دعوتی و ثقافتی

پروگراموں میں شرکت کی سعادت کے ساتھ ساتھ، تعلیمی وتربیتی امور پر، اُن کے ذمے داروں کے ساتھ تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس طرح کے اسفار ہمیشہ کار سے کیے جاتے؛ تاکہ تھوڑے وقت میں، پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق، کئی ایک تعلیم گاہوں اور اداروں کی تقریبات اور پروگراموں میں شرکت کے بعد، دن ہی دن میں دیوبند کو واپسی عمل میں آسکے۔

ان اسفار کے دوران، راقم الحروف کو زمانۂ طالب علمی کے بعد، دیوبند کے بارہ۔تیرہ سالہ تدریسی دور میں، اتنے طویل اور قیمتی مواقع، پہلی مرتبہ ہاتھ آئے اور ان گنت دینی، علمی، فکری، ثقافتی، دعوتی، اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اور مسلمانانِ ہند و مسلمانانِ عالم اور مسلم ممالک وحکومتوں کے حوالے سے، تبادلۂ خیال کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ تمام ہی موضوعات پر مولاناؒ کی ذہانت، حاضر جوابی، انتقالِ ذہنی، تازہ واقفیت، بھرپور معلومات، تجزیے کی قدرت اور منظم ومعروضی گفتگو سے، اُن کے لیے اعتقاد واحترام کا نقش میرے دل میں اور گہرا، شوخ اور اَن مٹ ہوگیا۔ سب سے زیادہ جو چیز متاثر کرتی، وہ اُن کی کسی بات کو دوسروں کے ذہن میں اتار دینے کی، معجزانہ قدرت اور مخاطب کو اختلاف کے باوجود، اپنے نقطۂ نظر کے معقول ہونے کا، قائل کر لینے کی عجیب وغریب صلاحیت تھی۔

بہ ہر صورت ۱۹۹۳ء کے موسمِ سرما کے آغاز میں، بجنور اور نجیب آباد وغیرہ کا مذکورہ بالا سلسلے کا، ایک یادگار اور پر بہار سفر، حضرتؒ کی صحبتِ بابرکت میں کیا گیا۔ اتفاق سے ہمارے اکابر کی تفسیری خدمات اور تراجمِ قرآن پاک

کا تذکرہ چل نکلا، اُن کی خوبیاں اور کم زوریاں زیرِ بحث آئیں اور اُن کے عظیم مؤلفین کی قابلِ شکر، مخلصانہ اور غیر معمولی محنتوں پر اظہارِ حیرت کے ساتھ، پتہ نہیں کیوں معاً راقم کے ذہن میں یہ خیال آیا، کہ اکابر کے تراجم میں ہر چند کہ مسلّمہ عقائد، اہلِ سنت والجماعت کے مسلک کی پیروی، تفسیری اصول، قرآنی آداب، اکابر مفسرین اور جلیل القدر ائمہ و مجتہدین اور مخلصین علمائے امت کے افکار و تصورات کے صراطِ مستقیم کی پابندی کی گئی ہے؛ لیکن اس عرصے میں اردو زبان کے اسلوب و بیان اور طرزِ تعبیر وغیرہ میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے، نیز زمانے کے مذاق و ذہن نے جو نیا رنگ و آہنگ اختیار کرلیا ہے، اس کے پیشِ نظر اکابر کی تمام خوصیتوں کی پابندی کرتے ہوے صحیح ادبی اردو میں، دیو بندی مکتبہٴ فکر کے کسی نمائندہ اور معتبر عالم کی طرف سے، کوئی نیا ترجمہ سامنے آئے، تو ان شاء اللہ اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ پھر راقم نے مولاناؒ سے عرض کیا کہ لغت نویسی اور عربی اردو کے حوالے سے پورے برّصغیر میں، چوں کہ آں جناب کی بے نظیر ساکھ قائم ہوچکی ہے، اس لیے اگر اِس طرح کا ترجمہ آپ کے قلم سے شائع ہو، تو بے حد مقبول ہوگا، آں جناب کے علاوہ حلقہٴ دیو بند میں، مذکورہ ترجمے کے لیے میری نگاہ میں سرِ دست کوئی موزوں نام نہیں۔

حضرت مولاناؒ نے نہ صرف یہ کہ اِس خیال کی پر زور تائید کی؛ بل کہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے، اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا اور تاکید فرمائی، کہ تم وقتاً فوقتاً مجھے یاددہانی کراتے رہنا؛ تاکہ یہ مبارک و مسعود کام،

میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنے۔

افسوس ہے کہ آخری دو ایک سالوں کے دوران، وہ مسلسل بیماری کے حملے کی زد میں رہے اور پہلے سے چھیڑے ہوئے علمی کاموں کی تکمیل نے انھیں الجھائے رکھا، اِس لیے راقم کی تمنا اور ان کی اپنی خواہش کے باوجود، ترجمے کے کام کی بات، آغاز سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَ مَالَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ .

ادارۂ دَارالفکر کے ذریعے عربی کی خدمت

عربی زبان ہی کی خدمت کے لیے مولاناؒ نے ۱۹۵۹ء میں دیوبند میں ''دارالفکر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم فرمایا تھا، جہاں عربی زبان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا، مزید افادیت کے پیش نظر انگریزی کی کلاسیں بھی رکھی گئیں، وہیں سے انھوں نے ''القاسم'' رسالہ بھی نکالا، جو کئی سال تک جاری رہا۔ اس کے قیام سے پہلے، بہت سے اسلامی موضوعات پر آپ نے متعدد مفید رسالے لکھے، جن میں کچھ کے نام یہ ہیں (۱) آخرت کا سفر نامہ (۲) شرعی نماز (۳) انسانیت کا پیغام (۴) اچھا خاوند (۵) اچھی بیوی۔

دَارالموٴلفین کی تاسیس

۱۹۸۸ء کے اوائل میں مولاناؒ نے ''دارالموٴلفین'' کے نام سے ایک تصنیفی اور ثقافتی ادارے کی بنا رکھی۔ اس کا مقصد دارالعلوم کے ہونہار فضلا کو

تصنیف و تالیف کی تربیت دینا اور ساتھ ہی اکابرِ دیوبند کی تصنیفات کو، ایڈٹ کر کے عصرِ حاضر کے مذاق کے مطابق، دیدہ زیب طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر لانا تھا۔ وسائل کی کمی کے باوجود، قلیل عرصے میں آپ نے وہاں سے تقریباً بیس کتابیں شائع کیں اور متعدد کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؛ نیز متعدد فضلا نے دارالمؤلفین سے جڑ کر، اپنی تحریری صلاحیتیں اجاگر کیں اور اب ان کا قلم آب دار اور گوہر بار بن چکا ہے۔

عربی کا صحیح اور صاف ستھرا مذاق

کسی عربی لفظ کی صحیح اردو کیا ہوگی؟ اس میں مولاناؒ کو کمال حاصل تھا؛ اس لیے اردو سے عربی، عربی سے اردو میں، جتنا خوب صورت ترجمہ کر لیتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ شاید بہت کم لوگ اس کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ دراصل ان کو دونوں زبانوں کا صحیح مذاق تھا، دونوں میں گہرائی و گیرائی تھی اور ایک زبان داں جب تک دو تین زبانوں اور ثقافتوں سے واقف نہ ہو، کما حقہ کسی زبان کی خوبی اور خرابی کا ادراک نہیں کر سکتا۔ انھی کے طرح کے باکمال زبان داں کو، لغت نویسی کا حق تھا اور زبان و بیان کی خدمت کا بھی۔

سب سے قیمتی تحفہ، جس سے مولاناؒ نے ہمیں سرفراز کیا

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولاناؒ سے مربوط ہونے سے قبل، ہم لوگ ایک آنکھ سے دیکھتے تھے؛ اُن کی تربیت، اُن کی نادی، اُن کی ہمہ گیر تدریس نے

ہمیں یہ صلاحیت عطا کی کہ ہم دونوں آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ہم لوگ درحقیقت خام مال تھے، انھوں نے ہمیں کارآمد اور گراں قدر مصنوعات میں تبدیل کردیا۔ فَجَزَاهُ اللّٰهُ خَيْراً .

مولاناؒ سے ہماری نسل کو جو فائدہ پہنچا، اگر ہم اس کا دقّتِ نظر سے اور بالتفصیل جائزہ لیں، تو ایک ضخیم کتاب لکھنے کے لیے اپنے قلم اور ذہن کو تیار کرنا پڑے گا۔ سب سے قیمتی بات، جو ہم لوگوں نے ان سے سیکھی، وہ یہ تھی کہ حالات چاہے جیسے ہوں؛ مگر ہم قول وفعل میں سچائی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ ایک غلط کار کو پوری طاقت سے یہ کہنے کی جرأت کریں، کہ تم غلط کار ہو۔ ہم نے ان سے مصائب کے طوفان میں ثابت قدم رہنا سیکھا اور حالات کی مخالفت وموافقت: دونوں صورتوں میں ذوقِ عمل سے سرشار رہنے کا سبق لیا۔

مولاناؒ کی زندگی کے دو مثالی محبوب

پھر مولاناؒ نے ہم لوگوں کے دلوں کو دارالعلوم دیوبند کے لیے، جس لازوال محبت سے معمور کیا، اس کی تصویر کشی راقم السطور اپنے ناقص قلم اور کوتاہ زبان سے نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں ان کا حال کچھ اس طرح کا تھا۔

أَهِيمُ بِلَيْلَىٰ مَا حَيِيتُ فَإِنْ أُمُتْ
أُوَكِّلْ بِلَيْلَىٰ مَنْ يَهِيمُ بِهَا بَعْدِي (۱۳)

---

(۱۳) میں تادم حیات لیلیٰ کے لیے سرگرداں رہوں گا اور مرتے وقت اپنے بعد محبت کا دم بھرتے رہنے کے لیے، کسی اور کو لیلیٰ کے ساتھ لگا جاؤں گا۔

میں کہہ سکتا کہ زندگی میں ان کے دو ہی محبوب تھے: ایک عربی زبان، دوسرا دارالعلوم دیوبند۔ مولاناؒ کو طویل عرصے تک برتنے والا گواہی دے سکتا ہے کہ ان کی سرگرمیوں کا اصل محور یہی دونوں تھے۔ انھوں نے اِن کے عشق کی سوزش سے طلبہ کے دلوں میں آگ سی لگادی، ایک بے تابی و سیمابی کیفیت میں اس طرح مبتلا کر دیا، کہ وہ جہاں رہے، جس حال میں رہے، دارالعلوم کی یاد، اُن کو ستاتی اور تڑپاتی رہی —— کہ

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے، عشق
شاخِ گل میں جس طرح ، بادِ سحر گاہی کا نم

ایک بے مثال و باکمال استاذ، جہاں خود دل و دماغ میں سما جاتا ہے، وہیں اس ادارے اور رجال ساز کارخانے کی ناقابلِ بیان محبت بھی پیدا کر دیتا ہے، جس کو اس کے انتساب سے سعادت حاصل رہتی ہے —— اور عشق و محبت سے زیادہ گہر بار و ثمر آور درخت دنیا نے کیوں دیکھا ہوگا۔ اس کی بخشش اور کرم گستری کے طفیل نگارخانۂ حیات میں جو معجزات رونما ہوتے ہیں، ویران مے کدوں کے جس طرح نصیبے سنورتے ہیں، اجڑے ہوئے چمن میں جس طرح بہار آتی ہے اور مٹی کی بے جان تصویروں میں جس طرح زندگی کی رَو دوڑ جاتی ہے، اس سے کون واقف نہیں؟

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں، زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں، سوزِ دم بہ دم

طلبہ کے دلوں میں دارالعلوم کے تئیں افروزیٔ آتشِ عشق کی ایک تاب ناک مثال

دارالعلوم دیوبند کے بعد میں نے، مؤرخِ اسلام سید الملّت مولانا سیّد محمد میاں صاحب دیوبندی ثم الدہلویؒ (۱۴) (متوفی ۱۳۹۵ھ-۱۹۷۵ء) سے

---

(۱۴) حضرت الاستاذ مولانا سیّد محمد میاں صاحب دیوبندی دہلویؒ، شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی و معتمد ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علمائے ہند و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند؛ دیوبند کے مشہور خاندان سادات رضویہ سے تھے۔ ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء کو ضلع ''بلند شہر'' میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد بہ سلسلۂ ملازمت محکمۂ نہر تعینات تھے۔ ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ فارسی میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۳ھ میں فارغ ہوئے۔ ''آرہ شاہ آباد'' سے تدریس کا آغاز کیا، پھر مدرسہ شاہی مرادآباد میں، عرصے تک مدرس اور مفتی رہے، جمعیۃ العلماء میں ناظم اور ناظم اعلیٰ کے عہدوں پر فائز رہے، جمعیۃ کے عظیم ترین قائدین میں ان کا شمار ہے، وہ جنگ آزادی میں کئی مرتبہ قید و بند سے بھی گزرے۔

بہ یک وقت فقیہ، محدث، مؤرخ، مصنف: سبھی کچھ تھے۔ جمعیۃ کی تاریخ پر ان ہی کی مستند کتابیں اور تحریریں جمعیۃ کا اصل سرمایہ ہیں۔ اُن کی بعض کتابیں عالمی شہرت رکھتی ہیں جیسے ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' ''علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے'' اور ''تحریکِ شیخ الہند'' وغیرہ۔ ان کی تصنیفات میں سیرت محمد رسول اللہ، تاریخ الاسلام، عہد زریں، پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، عثمانِ ذی النورین کے شواہد تقدس، سیاسی و اقتصادی مسائل، مشکاۃ الآثار، شرح نورالایضاح، اور دینی تعلیم کا رسالہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسا منکسر المزاج عالم نہیں دیکھا، حتیٰ کہ میں طالب علمی کے دور میں اپنے ساتھیوں میں جب بھی اُن کا تذکرہ کرتا تو ''مولانا شریف'' کے نام سے انھیں یاد کرتا۔ زہد و قناعت، صلاح و تقویٰ، سادگی، خلوت نشینی میں سلف کی یادگار تھے۔ سحر خیزی اور اوراد و وظائف کے بہت پابند تھے۔

مجھے انھوں نے اپنی بے پایاں شفقتوں سے جس طرح گراں بار کیا، اس کے لیے سوائے اپنے خدا سے، اُن کے حق میں دعا کرنے کے، اور کیا کر سکتا ہوں؟ اُن کی خدمت میں، میں نے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزارا، اس پوری مدت میں وہ ہر ماہ پابندی سے میری مادی مدد کرتے رہے۔ اُن کی کوئی تازہ تصنیف شائع ہوتی، تو اس اہتمام سے ہدیہ فرماتے، گویا میں بھی کوئی اہلِ نظر اہلِ قلم ہوں۔

مجھے دین و دنیا کے کام کا بنانے کے لیے، جس اخلاص اور خاموشی سے انھوں نے میرے اوپر توجہ ←

استفادے کی غرض سے، ان کی خدمت میں ایک سال مدرسہ امینیہ دہلی میں گزارا اور ان کی شرافتِ نفس اور خوئے خُرد نوازی کی وجہ سے، جس طرح میں ان کی خصوصی شفقتوں سے بہرہ ور ہوا، وہ محض خدائے پاک کی دین تھی۔ انھوں نے اپنے فرزندِ حقیقی کی طرح میری کفالت کی اور نہ صرف یہ کہ میرے دکھ درد کے حوالے سے میری مسیحائی کی؛ بل کہ مجھے ''ذرے'' سے ''آفتاب'' بنانے کے لیے دل سوزی سے، اسی طرح انتھک کوشش کی، جس طرح ایک شفیق باپ اپنی بے صلاحیت اولاد کے لیے کیا کرتا ہے۔ اُن کی شفقتوں کا اندازہ، اِس سے کیا جاسکتا ہے، کہ ان ہی کی پیدا کردہ ایک تقریب کے نتیجے میں، جب میں حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ(۱۵) کی

← دی، اس کے لیے خدا انھیں بہت نوازے۔ قصہ طویل ہے مختصر یہ کہ میں انھی کے واسطے اور ان ہی کی پیدا کردہ تقریب سے: حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کی خدمت میں پہنچا، پھر ندوہ میں مدرس ہوا۔ ۱۳۹۵ھ-۱۹۷۵ء میں جب ندوہ کے پچاسی سالہ جشن کی تیاری جاری تھی کہ اچانک اُن کے انتقال پر ملال کی خبر آئی، تو حضرت مولانا علی میاں صاحب نے، حضرت الاستاذؒ کے بے انتہا تعلق کے پیشِ نظر، از خود میری رہائش گاہ پر تشریف لاکر، میری یہ کہہ کر تعزیت فرمائی کہ: بھئی! تم سے زیادہ یہاں اُن کا کوئی اہلِ تعلق نہیں اور جس طرح وہ تم سے محبت کرتے تھے اور میرے نام اپنے خطوط میں تمھارے سلسلے میں میری توجہ مسلسل مبذول کراتے تھے، اس کے پیشِ نظر، میں تم سے دلی تعزیت کرتا ہوں اور تمھارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

میرے پاس اُن کے بیس سے زائد خطوط محفوظ ہیں، جو انھوں نے مجھے میری دست گیری، راہ نمائی اور اشک شوئی کے لیے ندوہ کے زمانے میں بھیجے۔ وہ جب تک زندہ رہے، میری ہر طرح کی مدد اپنی اولاد کی طرح کرتے رہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَاجْعَلِ الْجَنَّةَ مَثْوَاهُ۔

(۱۵) (اضافہ بہ موقع طبع سوم) مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ، دنیا کے مشہور ترین مفکر، عربی اور اردو کے ادیب وخطیب، سیکڑوں کتابوں کے مصنف، داعی الی اللہ، عالمِ عربی اور ہندوستان کے اکثر اداروں اور یونیورسٹیوں کے رکن رکین، رابطۂ عالم اسلامی کے رکن مؤسس، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم، آل انڈیا مسلم ←

خدمت میں پہلی مرتبہ، اُن کے وطن رائے بریلی پہنچا، تو مولانا نے غالباً پہلی

← پرسنل لا بورڈ کے صدر، صحیح النسب سید، حضرت سید احمد شہید بریلوی کے عزیز قریب اور مولانا سید حکیم عبدالحی رائے بریلوی (۱۲۸۶-۱۳۴۱ھ/ ۱۸۶۹-۱۹۲۳ء) مؤلف ''نزہۃ الخواطر'' و ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' و ''گل رعنا'' کے فرزند خرد تھے۔

جمعہ ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو سورۂ کہف کی تلاوت کے دوران روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، شب شنبہ ۲۳ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ/ یکم جنوری ۲۰۰۰ء کو ''تکیہ کلاں'' رائے بریلی (ان کے آبائی وطن) میں ان کے والد اور دیگر بزرگوں کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔

ان کے انتقال سے عالم اسلام کے مسلمان عموماً اور ہندوستان کے مسلمان خصوصاً یتیم سے ہو گئے ہیں۔ ان کے ایسی جامع صفات شخصیت عرصے کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوئی تھی۔ بے پناہ علم و فضل کے ساتھ خاندانی نجابت و شرافت کا پیکر تھے۔ عالمی شہرت و عزت اور پوری دنیا میں مقبولیت کے باوجود، ایسا متواضع اور خاکسار عالم دور آخر میں شاید کسی نے دیکھا ہوگا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے، وہ اللہ تعالیٰ کے بعد آخری سہارا اور ہر خطرے کے وقت امیدوں کا مرکز تھے۔ صلاح و تقویٰ، فکری استقامت و توازن، عملی پختگی اور غیرت اسلامی میں، دنیا میں اس وقت ان کی نظیر نہ تھی۔ ان کی اردو اور عربی میں جولانت و حلاوت تھی، وہ دنیا کے ہم عصر کسی بڑے سے بڑے ادیب و خطیب کو نصیب نہیں۔ ایسا دردمند دل، ایسا پرخلوص انسان، ایسے علم و تواضع کی شخصیت، ملت کے مرض کی ایسی نبض شناسی کرنے والا، اب شاید بہت دنوں تک امت مسلمہ کو نصیب نہ ہو۔ وہ اقبال کے ''یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم'' کی صحیح تعبیر اور اس معصومانہ تخیل کی زندہ تصویر تھے۔

۶ر محرم ۱۳۳۳ = ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۴ء میں اپنے آبائی گاؤں ''تکیہ کلاں'' رائے بریلی میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ''ظہور حیدر'' تھا۔ نو برس کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ ساری تعلیم و تربیت بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (فاضل دارالعلوم دیوبند و ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی سرپرستی میں حاصل کی۔ عربی کی تعلیم شیخ خلیل بن محمد بن حسین بن محسن یمنی انصاری سے حاصل کی، نیز شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی سے۔ اسی اثنا میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی سے حدیث شریف پڑھی۔ تقریباً ایک سال دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے درس حدیث میں سماعت کی اور حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد لاہور کا سفر کیا اور مولانا احمد علیؒ سے تفسیر قرآن پاک پڑھا۔ ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر و ادب عربی کے استاذ مقرر ہوئے، اسی دوران ''الضیاء''، ''الندوۃ'' وغیرہ کی ادارت بھی ←

ہی ملاقات میں دریافت فرمایا، کہ کیا مولانا محمد میاں صاحب آپ کے رشتے دار ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! نہیں، وہ میرے مشفق استاذ ہیں۔ فرمایا کہ ''مگر اِس زمانے میں کسی استاذ کو اپنے شاگرد سے، اتنا تعلق خاطر رکھنے والا میں نے بہت کم دیکھا ہوگا۔ انھوں نے اِدھر کئی ماہ کے دوران ارسال کردہ، اپنے متعدد گرامی ناموں میں، غائبانہ آپ کا تذکرہ وتعارف اور عربی زبان سے آپ کی محبت کی طرف اشارہ فرمایا۔''

حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہات سے بہرہ ور ہونے میں، جہاں اُن کی ذرہ نوازی اور میری انتہائی خوش قسمتی کو دخل ہے، وہیں مخدومی مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی [۱۶] مفتی دارالعلوم

← کی۔ ۱۹۶۲ء میں بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظم ندوۃ العلماء کی وفات کے بعد، ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوے اور تادمِ حیات اس منصب پر فائز رہے اور اپنی شہرت ومقبولیت اور غیر معمولی علم وفکر سے ندوۃ العلماء کو ذرے سے آفتاب بنا کے مشہور عالم ادارہ بنا دیا، جو اس کی ماضی کی تاریخ میں اس کو کبھی میسر نہ آیا تھا۔

مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ، مولانا محمد الیاس دہلویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا احمد علی لاہوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی صحبت نے ان کے قلب کو صیقل کیا، عقل وخرد کو شہ پر دیا اور والدین کی دعاؤں نے سعادت مندی سے دامن بھر دیا تھا۔

ان کی سب سے مشہور تصنیف ''ماذا خسر العالم'' ہے جس کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' ہے۔ یہ کتاب پوری دنیا میں ان کی شناخت کا سب سے طاقت ور ذریعہ بنی اور آج تک ایسی لاجواب کتاب عالم اسلام میں نہیں لکھی گئی۔ ان کی ساری تصنیفات اردو عربی دونوں زبانوں میں ہیں، جب کہ اکثر تصنیفات انگریزی میں بھی دست یاب ہیں۔ اول الذکر کتاب دنیا کی اکثر زندہ زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۱۶) مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مفتی دارالعلوم دیوبند: جہاں دیدہ، نرم وگرم چشیدہ، صائب الرائے، بے تکلف، رحم دل، بات میں سادہ، معانی میں دقیق، اردو کے بے ساختہ اہل قلم، بیسیوں کتابوں کے مصنف، خط ایسا پاکیزہ، جیسے موتیوں کی لڑی۔ تاریخ ولادت ۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء ہے، ان کا ←

دیوبند (سابق مرتب کتب خانہ ومرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کی کرم فرمائیوں کا بھی خاصا حصہ ہے، جنھوں نے اپنے مکتوب گرامی کے ذریعے، حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ کی توجہ، میری طرف مبذول کرائی۔

لیکن سب کچھ کے باوجود دارالعلوم کے تئیں، حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحبؒ نے، جو آتشِ عشق میرے سینے میں فروزاں کردی تھی، وہ کسی طرح بجھائے نہ بجھتی تھی۔ میری جیب میں اتنی وسعت نہ تھی کہ ہفتے عشرے یا مہینے میں ایک آدھ بار دیوبند آکر دارالعلوم سے اپنی محبت کی پیاس بجھاتا: اس لیے میں اس کی یاد میں تڑپ کر اپنے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کشمیری گیٹ کو، پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے گزرتی ہوئی شاہ راہ سے● پیدل چلنے والوں کی آسانی کے لیے، ایک فلائی اُوور (FLY OVER) سے جوڑا گیا ہے، جو "کوڑیا پل" کے نام سے مشہور ہے، دن میں کئی کئی مرتبہ ہم

→ وطن "پورہ نوڈیہہ" ضلع دربھنگہ (بہار) ہے۔ ۱۹۴۴ء میں مفتاح العلوم مئو سے فارغ ہوئے، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی (محدث جلیل) (متوفی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) کے اخص تلامذہ میں ہیں۔ دینی، تاریخی اور سیرت وسوانح کے موضوعات پر بیس سے زائد گراں قدر کتابوں کے مصنف ہیں، تحقیقی مقالات ومضامین اس کے علاوہ ہیں۔ کہاں جاسکتا ہے کہ جن چند لوگوں کا میرے اوپر جو گراں قدر احسان ہے، ان میں سے ایک ہیں۔ راقم الحروف کے اردو کے مذاق کی تخلیق میں عجب نہیں کہ کچھ حصہ ان کا بھی ہو۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کی وساطت سے پاکستان سے آمدہ اردو کے ادبی رسالے، اپنے کمرے لے جاتا اور ان سے بہت فائدے اٹھاتا۔ ہم محبانِ ادب طلبہ، روزانہ دن یا رات میں ایک مرتبہ، ان کے پاس ضرور بیٹھتے اور شوقِ زبانِ اردو کو بالیدہ کرنے کے ساتھ ساتھ، عقل وخرد کو بھی پختہ کرتے۔

دارالعلوم سے جانے کے بعد مراسلت کے ذریعے ہمیشہ راہ نمائی کرتے رہے اور مادی ومعنوی ہر طرح کی دست گیری سے، زندگی کے کسی بھی مرحلے میں دریغ نہیں فرمایا۔ رسمی طور پر میرے استاذ نہ ہونے کے باوجود، استاذ سے زیادہ کچھ جزاہُ اللّٰہ خیرَ الجزاء۔

لوگ اس پل سے گزرتے، کہ جامع مسجد اور بلّی ماران تو جانا ہی پڑتا تھا: پہلی جگہ رات کا اور دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے اور دوسری جگہ حضرت الاستاذ مولانا محمد میاں دہلویؒ سے ملنے اور بعض دفعہ ''احاطہ کالے صاحب'' کے باہر کی مسجد میں، ان کی صحبتِ بابرکت سے استفادے کی غرض سے۔

پل پر سے گزرتے ہوے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کو دیکھتا، تو ''غازی آباد'' کی جانب جاتی ہوئی ریل گاڑیوں کو دیکھ کر، اکثر آب دیدہ ہو جاتا کہ یہ کتنی خوش قسمت ہے، کہ اس کو دیو بند جانے کا موقع ملا ہوا ہے۔ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے، سمجھتا کہ غازی آباد کی طرف جانے والی، سبھی ٹرینیں میرٹھ اور دیو بند و سہارن پور کو جاتی ہیں؛ کیوں کہ مجھے اس وقت یہ کہاں معلوم تھا، کہ غازی آباد سے بہت سی لائنیں مختلف سمتوں کو نکلی ہوئی ہیں:

یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا؟ گو دیدۂ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں

اب تو ماشاء اللہ، ادھر کئی سالوں سے مدرسہ امینیہ میں خورد و نوش کا انتظام، ہاسٹل کے اندر ہی کیا جا چکا ہے۔ میرے زمانے میں خوراک کے نقد روپے ملا کرتے تھے، دورۂ حدیث شریف اور افتا کی جماعتوں کو کچھ زیادہ اور اس سے نیچی جماعتوں کو اُن سے کم۔ میں ایک نادار طالب علم تھا، مصارف کے لیے گھر سے کوئی مدد شاید و باید ہی مل پاتی تھی: اپنے وظیفے میں سے ہر ماہ، چند روپے پس انداز کر لیتا اور جب دیو بند آمد و رفت کے مصارف اور دوستوں کے لیے تحفے خریدنے کے بہ قدر، رقم جمع ہو جاتی، تو

فوراً دیوبند کے لیے روانہ ہوجاتا، دوتین روز قیام کرکے اپنا غم غلط کرتا۔ دیوبندآتا، تو خدا شاہد ہے کہ بچپن کی عید کی سی خوشی ہوتی۔ دیوبند سے روانہ ہوتا، تو ایسا غم ہوتا، جیسے بچے کو اپنے کھلونے ٹوٹ جانے کا۔

دہلی سے دیوبند کے، ایک عاشقانہ سفر کی رُوداد

دہلی سے دیوبند کے، اس طرح کے کئی ''عاشقانہ'' سفر اُس زمانے میں ہوے۔ ایک سفر میں نے ۸/ربیع الاول ۱۳۹۱ھ مطابق یکم مئی ۱۹۷۱ء کو کیا تھا۔ میں نے سفر کی مفصل روداد ۸/۳/۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹/۵/۱۹۷۱ء کو اپنی ڈائری میں قلم بند کی تھی، جس میں دہلی سے دیوبند تک کے سفر کے دل چسپ اور یادگار واقعات، دیوبند میں ملنے ملانے کی مصروفیتوں، دوستوں کے ساتھ گزرے ہوے پُرلطف اوقات، دعوتوں، ٹی پارٹیوں، اساتذۂ گرامی کے اسباق میں حاضریوں، حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ سے ملاقاتوں اور ان کے کمرے (۱۶) پر یادگار دعوت کا، دل چسپ تذکرہ کیا گیا ہے۔ ڈائری کے مطابق حضرتؒ کی دعوت کے شرکا میں اُس وقت ''النادی الادبی'' کے

(۱۶) یہ حجرہ- جو اُس وقت سہ ماہی عربی رسالہ ''دعوۃ الحق'' (جس کے بانی اور مدیر حضرت الاستاذ ہی تھے) کا دفتر تھا اور جو دارالعلوم کے دارجدید کی عمارت کے مشرقی اور جنوبی حصے کے سنگم پر، معراج گیٹ سے تین چار کمروں کے بعد، بالائی منزل پر واقع ہے- خوش قسمتی سے یہ مبارک و مسعود حجرہ، حضرت الاستاذ ہی کی بخشش سے، ہنوز میرے پاس ہے۔ اس حجرے نے عربی زبان وادب کے تئیں حضرت الاستاذ کی تمام سرگرمیاں دیکھی ہیں اور اس کے بام ودر، اُن کے تخلیقی اور تربیتی مشاغل کی حسین یادوں سے آباد ہیں، کہ یہ تقریباً بیس سال تک ان کی تمام تگ ودو کا مرکز رہا ہے۔

معتمد اور اِس وقت دار العلوم کے ایک موقر استاذ: برادر مکرم مولانا عبد الخالق مدراسی (۱۷) اور نادی کے اہم اراکین: مولانا فضل احمد در بھنگوی (۱۸)، مولانا

---

(۱۷) مولانا عبد الخالق مدراسی، مدرس علیا دار العلوم دیو بند: فیاض وخندہ رو، فراخ چشم، دراز قد، خوش طالع، شرمیلے، نیچی نگاہ، شریفانہ ادا، شیریں گفتار، کثیر العلائق۔ جس سے تعلق خاطر ہو گیا، اُس پر جان ودل چھڑکنے سے باز نہ آئے؛ لیکن ان کا مسلک یہ ہے کہ قلب ونظر کے سفینے کی سمت کو تبدیل کرتے رہنا چاہیے، کہ اصلی آئینِ وفاداری یہی ہے۔

جیسا کہ کہا گیا ہے ۱۳۹۱ھ میں ''النادی'' کے معتمد تھے۔ مولاناؒ کے وہ خصوصی تربیت یافتہ و پرداختہ ہیں۔ ان ہی کی کوششوں سے، وہ دار العلوم میں مدرس ہوئے اور عرصۂ دراز تک، انھوں نے نہ صرف یہ کہ احسان شناسی کا حق ادا کیا؛ بل کہ استاذ وشاگرد کے تعلق کی درحقیقت وہ مثال تھے؛ لیکن دار العلوم کی رستاخیزی کے دوران، حالات کی ستم گری کے ہاتھوں، جہاں بہت سی قدریں زیروزبر ہوئیں، وہیں مولاناؒ کے ساتھ، ان کے تعلقات کے آبگینے میں بھی بال سا آ گیا؛ لیکن پتہ نہیں کہ کیوں ان کی شرافتِ نفسی مجھے یہ یقین کر لینے پر آمادہ کرتی ہے، کہ غالباً وہ اسے درست کر لینے کے لیے ''ضروری ساز وسامان'' کی فراہمی میں اتنا مصروفِ عمل رہے، کہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہ مل سکی اور مولاناؒ کا سبک سیر قافلۂ حیات اپنی آخری منزل کو جا لیا۔

مجھ سے بے حد تعلق رکھتے ہیں، خدا استقامت عطا فرمائے؛ لیکن بے وفا اتنے کہ صد سالہ اجلاس کے موقع سے ایک روز بہ اصرار، دوپہر کے کھانے کی دعوت کی۔ میں اپنی رہائش گاہ پر انتظار ہی کرتا رہ گیا، تا آں کہ شام ہو گئی۔ اب اس وعدے کو کم وبیش پندرہ سال ہو گئے اور ہم دونوں کی اپنی اپنی مصروفیتوں نے ہر ایک کو ایسا مشغول کر دیا، کہ اب نہ مجھے دعوت کھانے کی فرصت رہی اور نہ انھیں کھلانے کی، اس لیے میں اب شرمندۂ لذتِ شکوہ نہ رہا اور انھیں منت کشِ جوابِ شکوہ کی ضرورت نہ رہی۔ وَكُلُّ شَيْءٍ فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ.

امید نہیں: بل کہ یقین ہے کہ وہ حضرت الاستاذؒ کو دعائے صبح گاہی میں، فراموش نہ کرتے ہوں گے۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا اور خلقِ خدا دونوں کی نگاہ میں وہ پسندیدہ رہیں۔

(۱۸) مولانا فضل احمد در بھنگوی قاسمی: خوش پوشاک، سمجھدار اور متبسم۔ اصلاً مئوناتھ بھنجن کے رہنے والے ہیں؛ لیکن عرصۂ دراز سے ''کنکی بازار'' شہر در بھنگہ میں ان کے والد کپڑوں کی تجارت کے سلسلے میں آ بسے ہیں، کنکی بازار ہی میں ان کی اپنی کئی بلڈنگیں اور دکانیں ہیں، کپڑے کی ایک دکان پر خود ہی بیٹھتے ہیں۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد اپنے آبائی پیشہ تجارت کو ترجیح دی۔ جس زمانے کا ذکر ہے، اس میں ''النادی'' کے سرگرم کارکن تھے۔ مولاناؒ سے بہت تعلق رکھتے تھے، مشہور تھا کہ وہ مولاناؒ کی چال کی بھی نقل اتارنے کی ←

نسیم احمد نیپالی (۱۹)، مولانا مبین احمد رام پوری (۲۰) اور میرے خاص میز بان، تعلیم کے تمام مرحلوں کے ساتھی اور ہم قریہ: مولانا مجیب الرحمٰن قاسمی رائے پوری (۲۱) بھی تھے۔

← کوشش کرتے ہیں، ان کا کہنا تھا کہ ''مولاناؐ عربی میں چلتے ہیں'' لہٰذا ہم لوگوں کو بھی اسی طرح چلنا چاہیے۔

(۱۹) مولانا نسیم احمد قاسمی نیپالی: دراز قد، فراخ چشم، سفید پوش۔ مذکور الصدر مولانا فضل احمد کے دوست تھے، مشکل تھا کہ دونوں ایک ساتھ نظر نہ آئیں، یک جان و دو قالب کے واقعی مصداق۔ دارالعلوم سے جانے کے بعد مجھے ان کے سلسلے میں کچھ اتہ پتہ نہیں۔

(۲۰) مولانا مبین احمد صاحب قاسمی رام پوری: بیضوی چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، میانہ قد، سلیقہ مند، سراپا تبسم۔ ''ٹانڈہ بادلی''، ضلع رام پور وطن مالوف ہے؛ لیکن اب ''ہاپوڑ'' میں آبسے ہیں اور وہاں کے اقبال مند مدرسے ''خادم الاسلام'' میں اونچے درجے کے مدرس ہیں۔ حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ استاذ و سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۹۱ء) اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماںؒ کے مشترکہ خادم رہنے کی سعادت حاصل رہی؛ اس لیے اُن کی شائستگی وسلیقہ مندی دو آتشہ ہوگئی تھی۔ اُس وقت تو تیز وطرار بھی تھے؛ لیکن اب عالم باوقار و بردبار بن گئے ہیں، اونچا سا عمامہ گھنیری پیچوں والا سر پر ڈال کر، خاصے رعب دار مولانا نظر آتے ہیں، ایک بار اسی شکل میں سرزمین پاک مکہ معظمہ میں ''مدرسہ صولتیہ'' کے دروازے پر اچانک نظر آگئے، خدا نے خیر کیا کہ میرے اوپر "خرّ موسیٰ صعقا" کی سی کیفیت طاری ہونے سے قبل ہی، انھوں نے از خود مسکرا کر، اپنے ''جلال'' کو میرے لیے قابلِ تحمل بنا دیا۔ خدا زندہ، خوش رکھے۔

(۲۱) مولانا مجیب الرحمٰن قاسمی رائے پوری۔ میرے آبائی وطن موضع ''رائے پور''، ضلع مظفر پور۔ (حال سیتا مڑھی) بہار کے ایک کسان خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ میرے ہم عمر اور قاعدۂ بغدادی سے اعلیٰ تعلیم تک میرے ہم سبق رہے، خواہ گاؤں کا مکتب ہو، یا مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، یا دارالعلوم مئو، یا دارالعلوم دیوبند: ہر مدرسے میں ہم دونوں ہم حجرہ، ہم نوالہ، ہم مطالعہ، ہم مذاکرہ: کبھی کچھ رہے۔ دیوبند میں ہم دونوں نے ''صف ابتدائی'' حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی بنارسی استاذ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس و رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند سے پڑھی، جو اُس وقت دورۂ حدیث سے فارغ ہو کر دارالافتا کے طالب علم اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند (متوفی سہ شنبہ ۱۹/۴/۱۴۱۷ھ = ۲/۹/۱۹۹۶ء) کی خدمت میں رہا کرتے تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحبؒ نے صف ابتدائی پڑھانے کے لیے انھیں مکلف کر رکھا تھا۔ پھر ''صف ثانوی'' اور ''مقامات حریری'' میں ہم دونوں حضرت الاستاذؒ کے پاس ہم درس تھے۔ ہم دونوں کھیل کود، سیر و تفریح اور بچپن اور زمانۂ طالب علمی کی تمام دل ←

النادی الأدبی کا ایک یادگار ماہانہ اجتماع

ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ راقم الحروف کی خوش قسمتی سے ۱۰؍ربیع الاول ۱۳۹۱ھ شبِ جمعرات کو ''النادی'' کا ماہانہ اجتماع تھا، چناں چہ نمازِ عشا کے بعد میں نے بھی شرکت کی سعادت حاصل کی، تقریریں اور مقالے سننے کے بعد اندازہ ہوا، کہ النادی میں اب پہلی سی بات نہیں، کوتاہیاں درآئی ہیں اور دوستوں کے ولولے خاصے سرد ہوگئے ہیں؛ لیکن ایک طالب علم عبدالستار مرادآبادی[۲۲] کی تقریر خاصی خوش آئند تھی۔ پھر مولاناؒ نے اختتامی

← دلچسپیوں میں ہمیشہ ایک دوسرے کے، اس طرح شریک رہے کہ حقیقی برادران بھی آپس میں اس طرح گھلے ملے نہیں رہتے؛ لیکن تعلیم کے بعد جب قدرت کے فیصلے سے ہم دونوں جدائی پر مجبور ہوے کہ وہ ''مدرسہ فلاح المسلمین'' ''بھوارہ'' مدھوبنی (بہار) میں مدرس ہوگئے اور بعد میں اپنے ہی گاؤں میں ''مدرسہ رشیدیہ'' کے نام سے ایک مدرسے کے بانی وصدر مدرس بن گئے اور میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مدرس ہوگیا اور پھر مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں، تو مسلسل مراسلت ہی ہم دونوں کے ملنے کا واحد ذریعہ رہی؛ چناں چہ ان کے پچاسوں خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، جن کی سطر سطر خلوص کی عکاس ہیں۔ پتہ نہیں میرے خطوط بھی ان کے پاس محفوظ ہیں کہ نہیں —— لیکن ادھر عرصے سے چپ سادھے بیٹھے ہیں اور میں بھی ''سبک سر بن کے'' ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ ''ہم سے سرگراں کیوں ہو''۔

(۲۲) مولانا عبدالستار سلاّم قاسمی مرادآبادی: بڑا سا سر، دراز قد، دوہرہ بدن، بلند آواز، بذلہ سنج، ذہین، دیکھنے میں ''شیخ الحدیث'' یا ''مہتمم''

دہلی میں ترکمان گیٹ پر ایک بلند و بالا شاہی تاریخی مسجد میں امام و خطیب ہیں۔ مناظرانہ ذوق پیدائشی ہے، کسی سے عالمانہ نوک جھونک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ تقریر کی صلاحیت شاید خداداد ہے، لیکن تحریری صلاحیت حضرت الاستاذؒ کی تخلیق کردہ۔ عربی اردو دونوں میں اچھا لکھ اور بول لیتے ہیں۔ مجلس کو ضلع جگت سے زعفران زار بنائے رکھنے کی عادت ہے۔ ہندوستان میں شمال و جنوب کے کئی ایک مدرسوں میں پڑھا کر اپنا سکہ بٹھا آئے، پھر جمعیۃ العلماء ہند کے ''مرکز دعوت اسلام'' اور حضرت الاستاذؒ کے ''دارالمؤلفین'' میں اُن ہی کی زیرنگرانی مشغول رہ کر اپنی تحریری صلاحیتوں کو بالیدہ کیا۔ اس کے بعد ''مدرسہ عبدالرب'' دہلی ←

تقریر کی اور فرمایا:

''دارالعلوم فقط دارالعلوم نہیں ہے؛ بل کہ شخصیات اور ذہنوں کے ڈھالنے کی جگہ ہے اور یہی اس کی اصل خصوصیت ہے کہ یہ صرف تعلیم گاہ نہیں؛ بل کہ تربیت گاہ بھی ہے۔ یہاں کی تعلیم و تربیت کا خاصہ ہے کہ اس سے قلب و نظر کی دنیا بدل جاتی ہے اور بعض دفعہ یہاں کا فیض یافتہ انسان، اتنا کامل انسان بن جاتا ہے کہ وہ انسان گر اور معلم اخلاق بن کر آفاق پر چھا جاتا ہے۔ محض تعلیم گاہ اور دانش کدہ، عقل و خرد کو تو صیقل کر سکتا ہے؛ لیکن قلب کو منور، ضمیر کو روشن اور نفسِ انسانی کو حرارت خیز و جنوں آمیز نہیں کر سکتا اور انسان کی سیرت و کردار کو اسلامی تعلیمات اور انسانی آداب کے سانچے میں ڈھال کر، اعلیٰ قدروں اور ارفع صفات و امتیازات سے، اس کے دامن کو مالا مال کرنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ کو دیکھنا ہے تو تھانہ بھون جا کر دیکھیے اور مقبرۂ قاسمیہ میں دیکھیے کہ کیسی کیسی شخصیتیں آسودۂ خواب ہیں؟ جنھیں دارالعلوم نے اپنی آغوشِ شفقت میں پالا تھا اور جو ہُما کے شکاری، شاہیں کا جگر رکھنے والے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے حوصلے سے سرمست تھے، جنھوں نے اسلام سے وفاداری اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین

← میں بہ حیثیت مُہتمم کچھ عرصے کام کیا۔ ابھی دو تین سال پہلے کی بات ہے کہ ''قبلہ'' نے ایک بے تکلف مجلس میں فرمایا کہ ''ایک طالب علم اور ایک استاذ سے اگر دارالعلوم دیوبند قائم ہوسکتا ہے، تو کیا گیارہ طالب علموں اور تین اساتذہ سے دارالعلوم دہلی قائم نہیں ہوسکتا؟'' عرض کیا گیا کہ ''اتنی بڑی تعداد سے تو ''جامع ازہر'' بھی قائم ہوسکتی ہے!'' پتہ نہیں ہم لوگوں کے مشورے کو دخل ہے، یا ان کے ذاتی ''الہام'' کو، بہ ہر صورت کنات پیلس کے قریب بنگالی مارکیٹ کے علاقے میں دارالعلوم دہلی قائم ہے اور وہ اس کے سربراہ ہیں۔

پر جاں نثاری کی، ایسی تاب ناک مثالیں چھوڑی ہیں، جن کی نظیر سے
دورِ حاضر کا دامن یک سر خالی ہے۔''

مولانا کی تقریر حسبِ سابق ولولہ انگیز تھی؛ لیکن دو سال قبل اپنے زمانے سے موازنے کے بعد نشاطِ کار میں جو فرق محسوس ہوا، اس کی خلش رہی اور میں نے حضرتؒ سے وقت لے کر، جمعہ ۱۱ر ربیع الاول کو اُن کے کمرے پر، ان کے سامنے اس سلسلے میں اپنی قلبی کیفیات کے اظہار کے لیے حاضرِ خدمت ہوا۔ میں نے تفصیل سے عرض کیا کہ حضرت! مجھے ''النادی'' کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے، دوستوں میں پہلا سا جوشِ جنوں اور سرمستیٔ کار نہیں، میں نے اپنے خلجان کا بعض دوستوں سے اظہار کیا، تو انھوں نے کہا کہ اب نادی میں پہلا سا خلوص نہیں، وہاں ''سرمایہ داری'' کا عمل دخل ہے اور بعض غلط قسم کے عناصر اس میں در آئے ہیں۔

مولاناؒ کے کمرے میں ایک یادگار میٹنگ

مولانا نے فرمایا: تم ایسا کرو کہ چند اُن طلبہ کی میٹنگ بلاؤ، جو تمھارے زمانے میں نادی سے قریب رہے ہیں اور مجھ سے بھی بہت قریب تھے اور آج بھی میرے دل میں اُن کے لیے وہی جگہ ہے اور تم سے بڑی انسیت رکھتے ہیں؛ لیکن بہ ظاہر انھیں آج نادی سے کوئی خاص دل چسپی نہیں، مجھ سے بھی پہلا سا تعلق نہیں رکھتے، حالاں کہ ماضی میں یہ لوگ بہت سرگرم تھے۔

چوں کہ مولاناؒ کی یہ خواہش میرے دل کی آواز تھی؛ اس لیے مندرجۂ

ذیل حضرات کو مندرجۂ ذیل تحریر کے ذریعے مدعو کیا گیا اور برادرم مولانا عبد الحنان صاحب بےدلؔ مظفر پوری (۲۳) کو ان حضرات کو اطلاع دینے اور ان سے دستخط کروانے کی زحمت دی گئی:

''محترم حضرات! اگر آپ حضرات کو بارِ خاطر نہ ہو، تو آج بعد نمازِ مغرب، حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب مدظلہ العالی کی خدمتِ اقدس میں، حاضر ہونے کی زحمت گوارہ کریں۔ چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔

والسلام، صدیقِ قدیم ناچیز نور عالم مظفر پوری

۷/۵/۱۹۷۱ء

(۱) مولوی مجیب الرحمٰن صاحب مظفر پوری (۲۴)

(۲) مولوی محمد اسلام صاحب دمکوی (۲۵)

---

(۲۳) مولانا عبدالحنان صاحب بےؔدل مظفر پوری: موضع ''ایکڈنڈی''، ضلع مظفر پور (حال سیتامڑھی) کے رہنے والے ہیں، طالب علمی میں ہمیشہ پڑھنے سے زیادہ خدمتِ خلق اور مداراتِ یاراں سے دل چسپی رہی۔ پڑھنے لکھنے میں عرق ریزی کو کارِ فضول سمجھ کر، اکثر نظر انداز کر دیتے، ہم لوگوں کو ہر وقت محوِ ''مشغلہ'' دیکھ کر کچھ اس طرح منھ بناتے، جیسے زاہد پاک باز رندِ سیہ کار سے۔ خوش حال گھرانے کے چشم و چراغ ہیں: اس لیے سیر چشمی ورثے میں ملی ہے۔ مجھ سے ہمیشہ بے حساب محبت فرماتے رہے۔ اتفاق سے ان کی رہائش گاہ، دارالعلوم میں، میری رہائش گاہ سے ملی ہوئی تھی، اس لیے ہر وقت ''دست یاب'' رہتے، اب مدرسہ ''دارالملت'' ''رام پور سگھری بل بھدر پور'' (مظفر پور) میں عُلیا کے مدرس ہیں۔ چوں کہ محبت کا سارا ''نصاب'' ماضی میں صرف کر چکے تھے: اس لیے باوجودے کہ ان کا مدرسہ میرے گاؤں سے چند قدم کے فاصلے پر ہے، کبھی دور سے بھی سلام نہیں کرتے۔

(۲۴) ان کا تعارف حاشیہ نمبر ۲۱ پر گزر چکا ہے۔

(۲۵) مولانا محمد اسلام صاحب قاسمی دمکوی ''دمکا'' (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں۔ دارالعلوم دیو بند میں کئی ←

(۳) مولوی محمد اسلم صاحب بستوی(۲۶)

(۴) مولوی نثار احمد صاحب بستوی(۲۷)

← کتابوں میں میرے ہم سبق رہے۔نرم خو اُس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں۔حسن خط اور حسن اخلاق دونوں کے مالک ہیں۔حضرت الاستاذؒ کے کاروانِ ادب اور ان کی ''النادی'' کے اس وقت سرگرم ممبر تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے کچھ عرصے بعد ''دعوۃ الحق'' کی جگہ پر جب ''الداعی'' نکلنا شروع ہوا،تو برادرم مولانا بدرالحسن کے ساتھ،انھوں نے کئی سال تک اس میں کام کیا،نئے انتظامیہ کے قیام کے بعد وہ ''وقف دارالعلوم'' سے وابستہ ہوگئے،اس وقت بھی وہ اسی میں بہ حیثیت مدرس عربی کام کررہے ہیں۔

(۲۶) مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی بستوی: دارالعلوم میں میرے ہم سبق تھے اور صف عربی نیز النادی کی سرگرمیوں میں بھی ساتھ رہے۔وہ مدرسہ حسینیہ تاؤلی ضلع مظفر نگر سے پڑھ کر آئے تھے اور میں دارالعلوم مئو سے۔نودرے میں میں نے شرح جامی کی تکرار (مذاکرہ) شروع کی،تو انھوں نے بھی چند ساتھیوں کو لے کر اپنا'' مے کدہ'' الگ بنانا چاہا؛لیکن جلد ہی تمام ''مے خوار'' اُن سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے حلقے سے جڑ گئے اور ناچار وہ خود بھی،پھر بہت جلد وہ میرے مخلص دوستوں کی فہرست میں آگئے۔دارالعلوم کی مسجد سے مطالعہ کرکے جب میں ایک دو بجے شب کو''احاطہ باغ'' سے ہوتا ہوا،اس کے عقب اور''رفیع منزل'' کے بیچ کی گلی سے گزر کر،دارِ جدید میں ان کے کمرے نمبر۴ کے پاس سے،دارِ جدید میں داخل ہوتا،تو اکثر وہ،مولوی عبدالہادی بستوی،مولوی نثار احمد بستوی،مولوی اقبال احمد بستوی وغیرہ شکر،گھی اور نان کھاتے ہوئے ملتے، زبردستی مجھے بھی شریک بزم کرلیتے۔بہ ہرصورت،یہ حضرات،خصوصاً مولوی محمد اسلم شدہ شدہ مجھ سے کافی گھل مل گئے،حتی کہ اکثر اوقات میرے کمرے ۳/۳۰ دار جدید بالائی منزل میں گزارتے اور لکھنے پڑھنے کی دل چسپیوں میں شریک رہتے،''النادی'' کی مجلسوں اور مولاناؒ کی صحبت میں یہ تعلقات اور نکھر گئے۔ دارالعلوم سے جانے کے بعد مولانا اسلم عرصے تک مراسلت کے ذریعے میری خیر خیریت معلوم کرکے،خوش ہوتے رہے۔''ندوہ'' میں میری تدریس کے آخری سالوں میں انھوں نے ''تکمیل الطب کالج''،لکھنؤ میں داخلہ لیا،اس کے بعد سے اتہ پتہ نہیں کہ حکیم ہوکر،وہ مریضوں کا علاج کررہے ہیں یا خود اپنا۔بہ ہرکیف وہ جہاں ہوں،خدا انھیں خوش رکھے۔

(۲۷) مولانا نثار احمد قاسمی بستوی: چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی روشن آنکھیں،خندہ رو،دبلا پتلا جسم، ذہین،موہنی صورت،پڑھنے لکھنے میں محنتی اور وقت کی قدر کرنے والے۔وہ ضلع بستی کے ایک گاؤں ''گلہریا'' کے رہنے والے ہیں۔صف ثانوی اور غالباً ''مقامات'' میں مولاناؒ کے ہاں میرے ہم سبق تھے، ''النادی'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے،میری بزمِ احباب کے نمایاں ممبر رہے۔دارالعلوم سے فراغت کے ←

(۵) مولوی عبدالحنان صاحب بےؔدل مظفرپوری[۲۸]

(۶) مولوی نہال الدین صاحب گیاوی[۲۹]

(۷) مولوی امان اللہ صاحب دربھنگوی[۳۰]

حسب پروگرام، جب یہ حضرات حاضرِ خدمت ہوئے، تو مولاناؒ نے

← بعد راجستھان کے کسی مدرسے میں تدریس کا سکہ جمائے رہے، اپنے وطن بستی سے وہاں آتے جاتے کبھی کبھار لکھنؤ اتر کر ''ندوہ'' میں مجھ سے ملنے آتے رہے۔ اب عرصے سے مولانا باقر حسین صاحب قاسمی بستوی کے تازہ دم مدرسے ''دارالعلوم الاسلامیہ'' بستی میں اپنی محنت، لگن اور خلوص سے طلب اور ذمے داران: دونوں کی نظروں میں محبوب ہیں، وفقه الله للمزيد .

(۲۸) ان کا تعارف حاشیہ نمبر ۲۳ پر دیکھیے۔

(۲۹، ۳۰) یہ دونوں حضرات بھی صف عربی میں مولاناؒ کے ہاں میرے ہم درس تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ یہ دونوں کس غار میں کھو گئے؟ کسی مصلحت کی وجہ سے مجھے اپنا اتا پتہ بتانے سے دونوں ہی اب تک گریزاں ہیں۔

(اضافہ بہ موقع طبع سوم) کتاب کے دوسرے ایڈیشن کو پڑھ کر برادر مکرم مولانا امان اللہ صاحب دربھنگوی نے میرے نام اپنے مکتوب مؤرخہ ۲۲ رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۹۸ء، میں جہاں کتاب پر اپنے حسین تاثرات کا اظہار کیا، وہیں تفصیل سے اپنا تعارف کرانے سے پہلے ''کس غار میں کھو گئے؟'' والے میرے جملے پر، اظہار ناگواری کر کے اپنے صاف دل ہونے کا ثبوت بھی دیا۔

اپنے تعارف میں جو کچھ ارشاد فرمایا، اس کا خلاصہ بھی شاید قاری کے لیے اکتاہٹ کا ذریعہ بنے: اس لیے خلاصے درخلاصے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

وطن مالوف ''نظرا''، ضلع دربھنگہ (حال ضلع مدھوبنی) بہار ہے۔ مدرسہ ''بشارت العلوم'' کھرایاں پتھرا، ضلع دربھنگہ، بہار میں قرآن پاک حفظ کیا، رانچی کے مدرسہ حسینیہ اور مدرسہ تجوید القرآن ''سمڈیگا'' سے قراءت حفص کی سند لی اور متوسطات سے پہلے تک کا عربی نصاب پڑھا۔ اس کے بعد ام المدارس: دارالعلوم دیوبند میں متوسط اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں افتا بھی کیا۔ اس کے بعد تین سال ''دارالعلوم رحمانیہ'' حیدرآباد میں تدریسی خدمات انجام دیں، اب عرصہ ۲۳-۲۴ سال سے مدرسہ اسلامیہ مدینۃ العلوم قصبہ ''مریال گوڑہ''، ضلع ''نل گنڈہ'' آندھرا پردیش میں، تدریسی و انتظامی ذمے داریوں سے، ہمت و حوصلے کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ اللہ پاک توفیق کے ساتھ تادیر سلامت رکھے۔

ان لوگوں سے فرمایا کہ

''برادرانِ عزیز! مولوی نور عالم کو نادی کے حوالے سے، آپ لوگوں کی بے اعتنائی کا احساس ہوا ہے؛ اس لیے انھوں نے آپ لوگوں کو یہاں جمع کیا ہے کہ اپنی بے توجہی کے اسباب بتائیں؛ تاکہ ان کا ازالہ کیا جاسکے۔ اِن کو بعض عزیزوں کی زبانی کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں، جن سے اِن کا دل دکھا اور انھوں نے مجھ سے آکر بیان کیا۔ ماشاء اللہ یہ آپ حضرات کے مخلص دوست اور میرے عزیز شاگرد ہیں، اِن کو دارالعلوم سے، النادی سے اور مجھ سے جو تعلق ہے، وہ آپ عزیزوں سے مخفی نہیں۔''

مولاناؒ نے ہم طلبہ کو جو جرأتِ گفتار دی تھی، اس کی بنا پر سبھوں نے اپنے اپنے شکوک وشبہات، واضح طور پر بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بیان کیے۔ اکثر طلبہ نے کہا کہ: بعض مال دار طلبہ ''النادی'' میں اس وقت سرگرم ہیں اور اُن کو اپنے سرمایے کی وجہ سے چوں کہ غرور ہے؛ اس لیے وہ رفقائے نادی کے ساتھ اکثر تنگ ظرفی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور خود، کم کوش وعافیت طلب ہونے کے باوجود، ساری کوتاہیوں کو احباب کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

مولاناؒ نے ان لوگوں کو مکمل طور پر مطمئن فرمایا اور وجوہات کے ازالے کا وعدہ کیا۔ چند ہفتوں بعد مجھے دہلی میں دوستوں کی زبانی اور خطوط سے معلوم ہوا کہ ''النادی'' کا سابقہ زمانہ اپنی تمام رعنائیوں، زیبائیوں اور سرگرمیوں کے ساتھ عود کر آیا ہے:

مجھ سے ادا ہوا ہے جگرؔ! جستجو کا حق
ہر ذرے کو گواہ ، کیے جا رہا ہوں میں

اس کے بعد سے مجھے الناد ی کے متعدد رفقا، خصوصاً برادران: مولانا عبد المعبود[۳۱] اور مولانا مجیب الرحمٰن کے خطوط اور دہلی آنے جانے والے احباب کے ذریعے (جن کے دہلی آنے جانے کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا تھا) تمام سرگرمیوں کی تفصیلات و جزئیات کے جاننے کا، بے انتہا شوق رہا کرتا تھا۔ تقریباً ہر ہفتے کی رپورٹ کا، اِس طرح انتظار رہتا، جیسے نامۂ حبیب کا اور ساتھیوں کی کارگزاریوں کو جان کر ایسی خوشی ہوتی، جیسے مومن کو اپنے نیک ارادوں سے۔

---

(۳۱) مولانا عبد المعبود صاحب قاسمی رائے پوری: میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں ہم درس و ہم مسکن رہے، بذلہ سنجی، ظرافت اور ذہانت میں مجھ سے ممتاز ہیں؛ لیکن تعلیم و تعلم کے حوالے سے ذوقِ طلب اور شوقِ سفر میں، خدا کی توفیق سے، میں ہمیشہ اُن سے ممتاز رہا۔ دنیا میں میرے مخلصوں کی محتاط فہرست میں ان کا نام سرِ فہرست ہے، کسی ذاتی بحران کے حل کے لیے سب سے پہلے ان ہی کا نام میرے ذہن میں آتا ہے اور سب سے پہلے میں انھی سے مشورے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اگر وہ وقت پر میسر نہیں ہوتے، تبھی کسی اور مخلص سے رجوع کرتا ہوں۔ اچھے مقرر اور منتظم ہیں، ایک باوقار مدرسے کے ہونہار صدر مدرس ہیں، جو ''نور الاسلام'' کے نام سے موضع ''چھتون، باہی''، ضلع دربھنگہ میں واقع ہے۔ انسان اور زندگی کے حوالے سے، اپنے ہم عمروں میں زیادہ سمجھدار واقع ہوے ہیں۔ ایک خاص بات یہ کہ پان کو غذا کی طرح کھاتے اور دوا کی طرح حاصل کرتے ہیں۔

(اضافہ بہ موقع طبع سوم) افسوس ہے کہ جمعہ ۱۱ر ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۴ر جولائی ۲۰۰۰ء کو دماغ کی رگ پھٹ جانے سے، وہ تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں، شہر دربھنگہ، بہار میں ہم سبھوں کو سوگ وار کر کے، اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ نمازِ جنازہ اور تدفین، ان کے گاؤں ''رائے پور''، ضلع سیتا مڑھی بہار میں ۱۲ر۴ر۱۴۲۱ھ کو ہوئی۔ اللہ ہر طرح مغفرت فرمائے اور مجھے اچانک بغیر کسی سابقہ اطلاع کے، داغِ مفارقت دے جانے کی، ان کی غلطی کو ضرور معاف کرے۔

حاصلِ عمر ، نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش ، کہ کارے کردم

میں نے ڈائری کے آخر میں لکھا ہے کہ ۱۲؍ربیع الاول کو گیارہ بجے اسٹیشن پر فلاں، فلاں حضرات مجھے رخصت کرنے آئے، جن میں مولوی عبدالخالق صاحب مدراسی (۳۲)، مولوی عبد المعبود مظفر پوری، مولوی مجیب الرحمٰن صاحب مظفر پوری (۳۳)، مولوی عبد الرزاق صاحب رانچوی (۳۴) اور مولوی طیب صاحب مظفر پوری (۳۵)، قابلِ ذکر ہیں۔

ڈائری کے ان اوراق کے آخر میں یہ الفاظ ہیں، جن سے دارالعلوم کے ساتھ، میرے اُس عشقِ مسلسل کی عکاسی ہوتی ہے، جو حضرت الاستاذؒ نے میرے جیسے نوجوانوں کے دلوں میں برپا کیا تھا:

"گاڑی پونے بارہ بجے نہ آ کر پونے ایک بجے آئی، میں گاڑی پر سوار ہوا، تو تمام احباب آب دیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر گاڑی نے رفتار پکڑی اور چیختی چلاتی ہوئی دہلی کی سمت بھاگنے لگی؛ تا آں کہ میں اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں دیر تک یہ سوچتا رہا کہ کبھی میں یہیں تھا اور میزبان تھا اور اب یہاں مہمان بن کر آتا ہوں۔

---

(۳۲) ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر: ۱۷

(۳۳) ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر: ۲۱

(۳۵،۳۴) دارالعلوم سے فراغت کے بعد آخر الذکر، یعنی مولوی طیب صاحب مظفر پوری، دہلی میں عرصے تک کسی اسکول میں پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کہ وہ کس راہ میں کھو گئے؟ اور اول الذکر کا مجھے کچھ اتا پتا نہیں۔

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں، سن لو
ہر تغیر سے صدا آتی ہے: فافہم فافہم۔

۱۳۹۱/۳/۱۸ھ = ۱۹۷۱/۵/۱۹ء (بہ روز جمعہ)

اپنے خوشہ چینوں کی علمی وفکری ترقی کے لیے پیہم توجہ اور فکرمندی

ہم لوگ، مولاناؒ سے اپنی عمر کی دوسری دہائی میں ہی مربوط ہو گئے، اس وقت ہمارے دلوں کی تختیاں بالکل صاف تھیں۔ ابھی زمانے کے ہاتھوں ان پر کوئی ایسی پیچیدہ تحریر نہیں لکھی جا سکی تھی، جس کے بعد کسی دوسرے نقشِ جمیل کو ثبت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دلوں کی ان تختیوں پر زندگی کی شیرینی و سادگی، دوستوں کی اخوت ومحبت، اساتذہ کی مہربانیوں، والدین کے پیار، قدرت کے جمال، کائنات کی دل کشی، چاندنی راتوں کی طرب انگیزی ودل ربائی اور پر بہار دنوں کی کرنوں کی دیدہ زیبی ونقشہ گری کے ماسوا اور کچھ نہ تھا؛ اس لیے مولاناؒ کے پڑھائے اور سمجھائے ہوئے، یہ افکار وخیالات وہاں ہمیشہ کے لیے مرتسم ہو گئے:

أَتَانِیْ هَوَاهَا قَبْلَ اَنْ اَعْرِفَ الْهَوٰی
فَصَادَفَ قَلْبًا خَالِيًا فَتَمَكَّنَا (۳۶)

ذرا غور تو کیجیے کہ نو جوانوں کو اس طرح کے استاذ کی، کس درجہ ضرورت

---

(۳۶) چوں کہ میں اس (محبوبہ) کی محبت میں، محبت کے معنی ومفہوم کو عملی طور پر برتنے سے قبل گرفتار ہوا؛ اس لیے محبت کو خالی جگہ ملی، چناں چہ وہ جاگزیں اور لازوال ہو گئی۔

ہے، جونو جوانوں اور طالب علموں کے تعلق سے، اپنی ذمے داری کا اِس قدر ادراک رکھتا ہو اور اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، اپنی انتھک کوششیں صرف کرتا ہو اور قدرت نے اس کو وہ صلاحیت بھی دی ہو کہ جس کی وجہ سے وہ عہدہ برآ ہونے میں کام یاب بھی ہو سکتا ہو؟

پھر مولاناؒ، اس سلسلے میں جس طرح اپنے آپ کو تھکاتے اور گھلاتے، وہ بھی اپنی نظیر آپ ہے اور یہی نہیں کہ زمانۂ طالب علمی میں، طلبہ سازی پر محنت صرف کرتے اور دارالعلوم سے رسمی تعلق کے ختم ہونے کے بعد انھیں نظر انداز کر دیتے، جیسا کہ اکثر اساتذہ کا حال ہوا کرتا ہے؛ بل کہ وہ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد بھی ہمیشہ مشورے دیتے، حوصلہ افزائی کرتے، راہیں دکھاتے اور اپنے خوشہ چینوں کی علمی وفکری ترقی کے لیے زندگی کے ہر مرحلے میں، ہر طرح کے جتن کرتے۔ اس سلسلے کے اپنی آپ بیتی کے تواتنے واقعات ہیں کہ انھیں قیدِ تحریر میں لانا، میرے لیے طولانی اور ناظرین کے لیے اکتاہٹ اور گرانی کا باعث ہوگا؛ لیکن ایک دو واقعے کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا:

حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دہلویؒ کی خدمت میں رہنے کے زمانے میں، ان کے کسی مضمون کا میں نے اردو سے عربی میں ترجمہ کیا، چوں کہ یہ میری پہلی کاوش تھی؛ اس لیے مجھے بڑی عرق ریزی کرنی پڑی، میں پہلے اردو عبارت کو کئی کئی بار پڑھتا، اردو الفاظ اور تعبیرات کا صحیح مفہوم متعین کرتا، بار بار ''فیروز اللغات'' سے رجوع کرتا، اس کے بعد الفاظ و

تعبیرات کی عربی، حضرت الاستاذؒ کی ''القاموس الجدید'' (اردو سے عربی) سے نکالتا۔ چوں کہ حضرتؒ نے ایک لفظ کے کئی کئی معنی نمبر وار دے رکھے ہیں اور میں اس وقت عربی کے سلسلے میں بے بضاعتی کی، اس منزل میں تھا کہ یہ تک فرق نہیں کر پاتا تھا کہ ایک معنی دوسرے سے مختلف ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیوں؟، اس لیے میرا ترجمہ ''غلطی ہائے مضامین'' سے عبارت بن کر رہ گیا، جس کا احساس اس وقت کیوں کر ہو سکتا تھا؟۔

بہ ہر صورت میں نے کئی ہفتے کی محنت کے بعد، ترجمہ مکمل کیا اور پتہ نہیں کیوں، سر پہ یہ سودا سوار ہوا کہ اِسے مولاناؒ کی خدمت میں بھیج کر ''دعوۃ الحق'' میں شائع کرنے کی درخواست کرنی چاہیے، کہ یقیناً انھیں اس ''گراں قدر'' کوشش سے خوشی ہوگی۔

توقع کے مطابق حضرتؒ نے اسے ''دعوۃ الحق'' میں شائع فرمایا؛ لیکن اصل مسودے سے، میں نے ملا کر جو دیکھا، تو پچھتّر فی صد الفاظ و تعبیرات بدلی ہوئی تھیں۔ اُس وقت اپنی خامیوں اور غلطیوں کو جان کر جو شرمندگی ہوئی، اُس کو اب کس طرح بیان کیا جائے؟ ہر چند کہ کسی عربی رسالے میں پہلی مرتبہ، اپنے نام سے کسی مضمون کا ترجمہ چھپا ہوا دیکھ کر، طبعی طور پر، غیر معمولی خوشی ہوئی، جو تازہ واردانِ بساطِ عمل کو عموماً ہوا کرتی ہے۔

لیکن حضرتؒ نے اپنے شفقت نامے میں، جس طرح حوصلہ افزائی کی، وہ ان کی شرافتِ نفس، پدرانہ شفقت اور مربیانہ اِخلاص کا آئینہ دار ہے۔ گرامی نامے پر ۱۵/۶/۱۳۹۱ھ کی تاریخ مرقوم ہے، جو مجھے مدرسہ

امینیہ کے پتے پر ارسال کیا گیا تھا۔

"برادر عزیز: مولوی نور عالم صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک ہفتے سے زائد ہوا، آپ کا مرسلہ تعریب کردہ مضمون ملا تھا؛ لیکن ادھر کچھ ایسے عوارض پیش آتے رہے کہ خط نہ لکھ سکا، آج بھی مزید تاخیر کے خوف سے محض بہ طور رسید، یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

ترجمہ ماشاء اللہ توقع سے کہیں زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے۔ معمولی اصلاح کی ضرورت ہے، وہ ان شاء اللہ کروں گا۔ اگر اسی طرح لگے رہے، تو عمدہ ترجمہ کرنے کی قدرت وصلاحیت پیدا ہو سکے گی۔

امید ہے کہ ہر طرح بہ خیریت ہوں گے۔

والسلام، مخلص: وحید الزماں، ۱۵/۶/۱۳۹۱ھ

دار العلوم ندوۃ العلماء میں، تدریسی خدمت کے زمانے میں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۳۷) کے حکم کے بہ موجب ان کی کتاب "عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" کا میں نے عربی میں ترجمہ کیا۔ جب وہ ندوہ کے پریس سے چھپی، تو میں نے اس کا ایک نسخہ حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں بھیجا، کہ انھیں اپنی معلمانہ ومربیانہ محنت کی بارآوری کے نمونے سے خوشی ہوگی۔ یہ زمانہ دار العلوم دیوبند میں اجلاسِ صد سالہ کی تیاری کا تھا۔ حضرتؒ بے حد مشغول تھے اور اُن کی "روشنیِ طبع" کی وجہ سے، اُن پر ذمے داریوں کا بہت سارا بوجھ ڈال دیا گیا تھا؛ لیکن انھوں نے وقت نکال کر حوصلہ افزائی

---

(۳۷) دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۵۔

سے دریغ نہیں کیا اور مفصل گرامی نامے کے ذریعے میری ہمت کو مہمیز فرمایا۔
ان ہی دنوں عربی زبان کے پیدائشی اور بے نظیر ادیب و فرشتہ صفت انسان: ''مولانا محمد الحسنیؒ'' (۳۸) کی وفات حسرت آیات کا جاں کاہ حادثہ پیش آیا تھا اور ان کے عزیزوں، قریبوں بالخصوص مولانا علی میاں صاحب ندوی کے بعد، ہم ایسے اسیرانِ عقیدت و محبت کے دل، جس طرح کباب ہوئے تھے، اس

---

(۳۸) مولانا محمد الحسنی، ایڈیٹر البعث الاسلامی دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ (متوفی جون ۱۹۷۹ء = شعبان ۱۳۹۹ھ): سرخ و سپید رنگ، میانہ قد، بیضوی چہرہ، کشادہ چشم، کشادہ متقل وفکر، سر اور داڑھی کے بال سیاہ، جن میں سپیدی رینگنے لگی تھی، گھنی اور خوش نما داڑھی، سر پہ اکثر کلاہ سیاہ، خوب صورت سی شروانی میں ملبوس، رفتار میں توازن، گفتار میں بلا کی شیرینی، متبسم لب، فرشتہ شکل، پیکر مکارم اخلاق، دیکھنے والا معصومیت کی قسم کھائے اور کبھی حانث نہ ہو، قلم کے ایسے دھنی کہ اس سے تلوار، آتش، شمع، مرہم: کبھی چیزوں کا کام لیتے۔ روئے زمین پر ان کا کوئی دشمن نہیں تھا، ہاں وہ خدا کے دشمنوں کے جانی دشمن ضرور تھے: جنھیں کبھی قلم کی تلوار سے تہ تیغ کرتے، کبھی آتشیں تحریروں سے بھسم کرتے، کبھی اپنی نگارشات سے (جن میں آب کی روانی، دریا کی طغیانی، کہساروں کی شوکت، فولاد کی قوت، آبشار کا شور، طوفان کا زور، دل کا سوز، جگر کا خون: سبھی کچھ شامل ہوتا) قلبِ مسلم کی شمع روشن کرتے اور اس کے زخم دل پر مرہم رکھتے۔

عربی میں ایسا قلم، جس پر اکثر صاحب بصیرت اہل زبان صاحب قلم کو رشک آتا اور اردو میں ایسی تحریر کہ کہنہ مشق اور مشاہیر ادبا بھی پڑھ کر سر دھننے لگتے۔ باقاعدہ تعلیم کہیں حاصل نہیں کی: لیکن بارہ تیرہ سال کی عمر سے صرف ونحو کی بالکلیہ ناشناسائی کے باوجود، وہ جس طرح کی عربی لکھتے تھے، اس کی مثال سے برصغیر کی تاریخ تہی دامن ہے۔ یہ عربی کا اعجاز تھا، یا ان کے عظیم ترین والد ڈاکٹر مولانا سید عبد العلی صاحب فاضل دار العلوم دیوبند و ندوۃ العلما لکھنؤ (متوفی ۳/ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ = ۲۱/ مارچ ۱۹۶۱ء) کے انوکھے طریقۂ تعلیم کی کرامت، یا ان کے عظیم چچا مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی غیر معمولی تعلیم و تربیت کا فیضان تھا، جو بھی ہو، وہ عربی زبان کے انوکھے، البیلے انشا پرداز اور قدرتِ الٰہی کا شاہکار تھے۔ صرف چوالیس سال کی عمر میں، اس جہان فانی سے رخت سفر باندھ لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنے سوز نہاں، درد دل اور ساری دنیا میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ زبوں حالی و گراں خوابی اور باطل کی تیز گامی و زور آوری کا گراں بار غم، برداشت نہ کر سکے اور ہماری مایوسانہ کیفیت کا، اپنے خدا سے شکوہ کرنے کے لیے، ہمیں بہ عجلت داغ مفارقت دے گئے۔ اللّٰھم انزل علیہ شآبیب رحمتک۔

کو کچھ خدائے علام الغیوب ہی جانتا ہے۔ حضرتؒ نے بھی اپنے گرامی نامے میں، ان کی ناگہانی موت پر اظہارِ رنج و ملال کیا، نیز اپنی صحت کی خرابی وغیرہ کا تذکرہ بھی فرمایا:

''عزیز گرامی قدر نور عالم صاحب! زیدت مودتکم واز دھرت معالمکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مودت نامہ اور ساتھ ہی مرسلہ کتاب ''التفسیر السیاسی للإسلام'' ہم دست ہوئی تھی۔ فوری جواب اس لیے نہ دے سکا کہ چار ماہ سے سلسلۂ اسفار و مصروفیات، اس طرح جاری ہے، کہ تمام کام غیر مربوط اور منقطع ہو گئے ہیں۔

ترجمہ ماشاء اللہ بڑا ہی رواں دواں ہے، اس ترقیِ معیار کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مزید ترقیات سے نوازے اور درجات بلند کرے۔ آمین

حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس نہ تو پہلے کچھ تھا اور نہ اب ہے: اس لیے فائدہ پہنچانے کا کیا سوال؟ البتہ مخلص احباب نے جن کی چند ہی مثالیں ہیں، اپنے حسنِ ظن اور بے پناہ تعلق و محبت کی بنا پر، ایک رائے قائم کر لی ہے، اللہ تعالیٰ اس کا بھی اجر عطا فرمائے۔

دار العلوم کے اجلاسِ صد سالہ کا کام شروع ہو چکا ہے۔ میرے سپرد بہت سے کام ہیں، جو وقت اور محنت طلب ہیں، مثلاً تزئین و اصلاح عمارات کا کام، پنڈال کا کام، عالمِ اسلام سے رابطے کا کام علمی نمائش کی تیاری اور اس کی مکمل ذمے داری۔

اس میں آپ بھی اپنے مشورے ضرور دیں اور جو تعاون ممکن ہو، اس سے مطلع کریں۔

اب میری صحت خراب رہتی ہے، سابق کی طرح نہ کام ہوتا ہے اور نہ وہ ولولہ اور جوش ہے، طبیعت اور ذہن آرام کی طرف مائل ہے۔ معاشی طور پر تو اللہ کے فضل سے اب مطمئن اور بے فکر ہوں؛ لیکن ذمے داریاں اور کام پریشان کیے رہتے ہیں، جن سے چھٹکارا بہ ظاہر مشکل ہے۔ بقیہ حالات ٹھیک ہیں۔

''التفسیر السیاسی'' کو بالاقساط ''الکفاح'' میں شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔

مرحوم محمد الحسنی صاحب کی وفات بڑا ہی المناک حادثہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ پرسانِ حال سے سلام مسنون عرض ہے۔''

والسلام، مخلص: وحید الزماں - ۱۷ رشعبان ۱۳۹۹ھ

دارالعلوم کا اجلاس صد سالہ اور مولاناؒ کا ناقابلِ فراموش کارنامہ

۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند نے، اپنے وقت کے لاثانی مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) کی سرپرستی میں، لاجواب اجلاسِ صد سالہ منعقد کیا، جس میں ہندو بیرونِ ہند سے، تقریباً تیس لاکھ سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔

اتنے بڑے غیر معمولی اجلاس کی تیاری کے لیے، دارالعلوم نے بڑے پیمانے پر انتظام کیا اور اجلاس کو بہ حسن وخوبی معیارِ مطلوب پر منعقد کرنے کی خاطر، اکیس کمیٹیاں تشکیل دیں۔ مولاناؒ کی متنوع صلاحیت اور غیر معمولی لیاقت کے پیش نظر، انھیں ان میں سے بیش تر کمیٹیوں کا کنوینر نامزد کیا گیا۔

ساتھ ہی دارالعلوم کی کئی ایکڑ کے رقبے پر پھیلی ہوئی متعدد منزلہ گنجان عمارتوں کی تزئین وترمیم اور نئی عمارتوں کی تعمیر کا دشوار گزار کام بھی سپرد کیا گیا۔ مولاناؒ نے صرف آٹھ ماہ کے عرصۂ قلیل میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے، کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ انھوں نے قدیم عمارتوں میں ایسی حسین ومتوازن پیوندکاری کی کہ بڑے بڑے انجینیر بھی دنگ رہ گئے اور جو نئی تعمیرات کیں، وہ عصریت وجدیدیت اور قدیم اسلامی طرزِ تعمیر کا پروقار امتزاج ہیں۔ تعمیرات کی، ان سرگرمیوں سے مولاناؒ کی ایک نئی شخصیت دریافت ہوئی، جو اب تک ان کے قریب ترین لوگوں سے بھی غالباً مخفی تھی، کہ وہ بہترین آرکیٹیکٹ، انجینیر اور ''شاہ جہانی تعمیراتی ذوق'' کے حامل ہیں۔ مولاناؒ نے جو کام اس تنگ عرصے میں کیا، وہ کم وکیف: دونوں اعتبار سے سارے منتسبینِ دارالعلوم کے لیے خصوصاً اور اُن فضلا کے لیے بالاخص، باعث حیرت ہیں، جنھوں نے مولاناؒ کے تزئینی، ترمیمی اور تعمیری عمل سے قبل دارالعلوم کی عمارتوں کی ''بے ساختگی'' دیکھ رکھی ہیں۔

مولاناؒ، اُن دنوں بعض دفعہ پوری پوری رات بیدار رہتے اور کبھی کبھی رات کے سناٹے میں، اذانِ فجر سے دو ایک گھنٹہ قبل بیدار ہو جاتے۔ قلم،

کاغذ، اسکیل اور پنسل وغیرہ لے کر اس جگہ پہنچ جاتے، جہاں کوئی اہم تعمیر جاری ہوتی، وہاں چاروں طرف کئی کئی بار گھومتے، اس جگہ کی پیمائش کرتے، ذہن میں پھر ایک خاکہ مرتب کرتے، پھر ایک طرف کو بیٹھ کر، وقت کے وقت زیرِ تعمیر عمارت کا ایسا نقشہ تیار کرتے، جو آس پاس کی عمارتوں سے ہم آہنگ بھی ہو اور ممتاز بھی۔

صبح سویرے اُن کے پاس سینکڑوں کاری گر اور ملازمین جمع ہو جاتے اور ہر ایک کو متعلقہ کام کی ہدایت دیتے، پھر ذمے دار ملازمین میں سے کسی کو اینٹ، کسی کو سیمنٹ، کسی کو رنگ، کسی کو ریت اور دیگر تعمیراتی مٹیریل لانے کے لیے بھیج دیتے۔

اس زمانے میں بعض دفعہ، ایک ایک ہزار مزدور اور کاری گر، شب و روز کام کرتے۔ مولاناؒ اُن سب کی نگرانی چستی اور پھرتی سے کرتے، ہر ایک کا حساب کتاب رکھتے، ہر ایک کی ضرورت پوری کرتے، اس کے لیے مطلوبہ سہولتیں فراہم کرتے اور معماروں کی، ایسی باریک بینی سے نگرانی کرتے، کہ اچھے سے اچھے کاری گر کے ہوش ٹھکانے لگ جاتے۔

اس قربانی و جگر کاوی کے بعد مولاناؒ نے اجلاسِ صد سالہ میں، دارالعلوم کو دلہن بنا کر، لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

اجلاسِ صد سالہ کے اختتام کے بعد دفترِ اجلاس کی طرف سے ''مختصر روداد اجلاسِ صد سالہ'' کے عنوان سے، اجلاس کی کارروائیوں کی جو مختصر رپورٹ، اُس وقت شائع ہوئی تھی، اُس میں مولاناؒ کی اس سلسلے کی خدمات کا

مندرجۂ ذیل لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے:

''مولانا وحید الزماں صاحب نے اس سلسلے میں شب و روز اس قدر سخت محنت کی، کہ اُن کی صحت جواب دے گئی، پھر بھی وہ بیس بائیس گھنٹے روزانہ کام کرتے رہے اور کاموں کی نگرانی فرماتے رہے، سیکڑوں مستری و مزدور تعمیرات کے، اِس اہم کام میں لگے رہے، جس کے نتیجے میں بہت سی شان دار عمارات بن کر تیار ہوئیں۔ دارالعلوم کی عظیم الشان مسجد کی بالائی منزل، جدید ڈھنگ سے تعمیر ہوئی، اس مسجد کا ایک وسیع و شان دار اور بلند گیٹ تعمیر ہوا، جو اپنی دل آویزی اور دل کشی کی وجہ سے، لوگوں کی توجہ اور مسرت کا باعث بنا ہوا ہے۔ کتب خانے کی عمارت میں وسیع و عریض گیلریوں کی تعمیر، دارالعلوم کے صدر گیٹ کی جدید تعمیر، دارالاقامے میں بہت سے نئے کمروں کی تیاری اور کئی ایک جدید درس گاہوں کا اضافہ بھی، قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے۔ اسی طرح دارالتفسیر کے تاریخی گنبد کی بلندی میں اضافہ، نئے برجوں کی تیاری اور قدیم تعمیر شدہ عمارات و احاطوں میں، مناسب تبدیلیاں اور اضافے وغیرہ: سبھی کام قابلِ قدر و لائقِ تحسین قرار دیے گئے ہیں۔''

(مختصر روداد اجلاسِ صد سالہ دارالعلوم دیوبند، ص: ۱۰۱-۱۰۲)

اجلاسِ صد سالہ میں میری حاضری اور مولاناؒ کے عنایات والطاف

تین روزہ اجلاسِ صد سالہ کے افتتاح سے ایک روز قبل ۲۰؍ مارچ

۱۹۸۰ء= ۲رجمادی الاخری ۱۴۰۰ھ جمعرات کو میں دہرہ دون ۔ بمبئی ایکسپریس سے، قریباً ساڑھے بارہ بجے دہلی سے دیوبند پہنچا۔ خیال تھا کہ دیوبند اسٹیشن سے دارالعلوم پہنچنے اور کسی بے تکلف شناسا کے یہاں رحلِ سفر اتارنے کے معاً بعد، حضرت الاستاذؒ سے ملاقات کروں گا؛ تاکہ اس مثالی اور ''عرفاتی'' بھیڑ(۳۹) میں سینگ سمانے کے لیے ذرا سی کوئی معقول جگہ مل جائے؛ لیکن اسٹیشن پر ناقابلِ بیان بھیڑ تھی، اس وجہ سے ہمیں ایک گھنٹے انتظار کے بعد ہی، سواری مل سکی اور راستے میں اس طرح کندھے سے کندھا چھل رہا تھا کہ باوجود اس کے کہ رکشے والا طویل راستے سے چکر کاٹ کر آیا، ہم ڈھائی بجے کے قریب ہی، دارالعلوم پہنچ سکے۔

اُس وقت حاضری مناسب معلوم نہ ہوئی، غالباً عصر بعد حاضرِ خدمت ہوا، تو وہ دولھے کی طرح سیکڑوں کے مجمع میں گھرے ہوئے تھے، جن میں مہمان، ملازمین، مزدور، معمار، اجلاس کے بعض منتظمین: سبھی طرح کے لوگ تھے۔ میں نے جیسے ہی سلام کیا، خوشی سے باغ باغ ہوگئے، فرمایا: سامان کہاں ہے؟ میں نے کہا: حضرت! میں نے سامان وامان اپنے ایک ہم قریہ طالب علم کے پاس ڈال دیا ہے۔ فرمایا کہ مغرب بعد آپ سامان کے ساتھ میرے قریب کے اِس اوپر والے کمرے میں آجائیں، میں نے صرف

---

(۳۹) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ - اوراب کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے وقت رحمۃ اللہ علیہ- نے اسی اجلاس کی تیسری نشست (منعقدہ ۲۲/مارچ بہ روز شنبہ بہ وقت ۹/بجے صبح تا ڈیڑھ بجے دن) میں ایک یادگار اور تاریخی تقریر میں بجا طور پر فرمایا تھا کہ میں نے اتنا بڑا پرسکون وپرشوق ومبارک مجمع دنیا میں صرف دو جگہ دیکھا ہے: ایک میدانِ عرفات میں اور دوسرا یہاں۔

آپ جیسے چند اہلِ تعلق کے لیے اُسے محفوظ رکھا ہے اور یہ مولوی طیب صاحب مظفر نگری[۴۰] ہیں، یہ آپ کے قیام کے تمام عرصے میں، میزبانی کے فرائض انجام دیں گے۔ میں حسب الحکم مغرب بعد مذکورہ کمرے میں آ گیا اور الحمد للہ اِس طوفانی بھیڑ میں ہفت روزہ قیام کے دوران، جو آرام ملا اور جس طرح حضرتؒ نے مشاغل کی بے پناہی کے باوجود، عنایات والطاف مبذول رکھے، اُس کی روداد دل چسپ بھی ہے اور تفصیل طلب بھی۔ میں ناظرینِ کرام کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے، اسے قلم انداز کرتا ہوں۔

عشا کی نماز کے بعد اپنی اقامت گاہ سے اتر کر، دوسری منزل پر حضرتؒ کے کمرے میں آیا، کہ شاید اب بھیڑ ختم ہو چکی ہو؛ لیکن میں مئوناتھ بھنجن کے بعض فضلائے گرامی، جن میں میرے مشفق استاذ حضرت مولانا نذیر احمد صاحب نعمانی[۴۱] مدظلہ اور میرے کرم فرما حضرت مولانا ضیاء الحسن

---

(۴۰) مولانا محمد طیب قاسمی بن محمد اسحاق صاحب انصاری: سانولا رنگ، کشادہ چشم، میانہ قد، متبسم چہرہ، خوش مزاج اور ملنسار۔ ''تیوڑہ''، ضلع مظفر نگر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوے۔ طالب علمی میں اور اس کے بعد بھی عرصے تک مولاناؒ کی خدمت میں رہے، جس کی وجہ سے تہذیب وشائستگی ان کا امتیاز بن گئی۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۳ء کے پورے عرصے میں مولاناؒ کے ذاتی کتب خانے (کتب خانہ حسینیہ) سے، بہ حیثیت شریک ومنیجر وابستہ رہے اور کتب خانے کی ترقی میں اچھا رول ادا کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مولاناؒ سے اپنا کتب خانہ الگ قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، جس کے لیے انھوں نے اِنھیں بہ خوشی اجازت دے دی، چناں چہ اس وقت شہر دیوبند میں ''سفید مسجد'' کے نزدیک ''مکتبہ طیبہ'' کے نام سے ایک مستقل کتب خانے کے مالک ومنیجر ہیں۔

(۴۱) مولانا نذیر احمد صاحب قاسمی مئوی بن مولانا حکیم محمد فاروق صاحب مئوی: مئو شہر کے باشندے ہیں، دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں خاک سار نے متوسطات کی کئی کتابیں، خصوصاً فنِ صرف ونحو کی، ان سے پڑھیں، جو کچھ پڑھا، اب تک یاد ہے۔ خوش شکل، فراخ چشم، فراخ دل، خوش اوقات، نستعلیق، مخلص، رحم دل اور ←

صاحب قاسمی(۴۲) رحمۃ اللہ علیہ استاذِ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ شامل تھے، کے ساتھ حاضر ہوا، تو ان کے پاس مزدوروں، معماروں کی بھیڑ لگی ہوئی

← ''مصیبت میں غیروں کے کام آنے والے'' اپنے تمام اساتذۂ گرامی میں جن کی ذات سے سب سے زیادہ متاثر ہوا، ان میں مولانا نذیر احمد صاحب کا نام، حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ کے معاً بعد ہے۔ اُن سے جب بھی ملا، دیکھا، برتا، باپ کی شفقت بے جا طور پر یاد آ گئی۔ دار العلوم مئو میں مجھے مدرسی قبول کرنے کے لیے بے حد اصرار کرتے رہے اور بال بچوں کے ساتھ مئو آنے کی دعوت دیتے رہنے سے ہنوز نہیں تھکتے۔ دین وملت کے کاموں میں خرچ کرنے اور دوسروں سے کرانے میں، غالباً پورے شہر مئو میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ خدا کے فضل سے اب شہر کے بڑے تاجروں میں ہیں، گویا خدا نے دین ودنیا دونوں کی اچھائیوں سے دامن بھر لینے کی سعادت سے خوب خوب نوازا ہے۔ دار العلوم دیوبند کے ایسے عاشق ہیں، جیسے ایک صاحبِ بصیرت فاضلِ باکمال کو ہونا چاہیے، ساتھ ہی وہ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی اسی قدر عاشق تھے اور ان کی سرگرمیوں کے زندگی بھر ثناخواں رہے۔ مدّ اللّٰہ عمرہ مع الصحۃ والتوفیق۔

(۴۲) مولانا ضیاء الحسن صاحب قاسمی مئوی کا تعلق ''کیاری ٹولہ'' مئو سے تھا۔ ان کے علم میں گہرائی وگیرائی تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عرصے تک حدیث کے استاذ رہے اور وہیں شکر کے موذی مرض کی وجہ سے ۲؍جنوری ۱۹۸۹ء (۴؍رجب ۱۴۱۰ھ) کو تقریباً پچاس سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مئویؒ متوفی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹۹۱ء کی صحبت بابرکت میں ایک عرصہ، بعض کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں، بیروت میں گزارا اور عالم عربی کے حالات سے قریب سے واقفیت حاصل کی۔ عربی زبان سے باقاعدہ اشتغال نہ ہونے کے باوجود، نہ صرف یہ کہ اس کو سمجھتے تھے؛ بل کہ اس کا خاصا نداق رکھتے تھے، مجھے اس بات کا اندازہ اس سے ہوا کہ وہ ''الداعی'' پابندی سے اور دقت نظر سے، ایک ایک حرف پڑھتے اور لسانی وعلمی فروگذاشتوں کی نشاندہی کر کے خط لکھتے۔ اس سلسلے کے ان کے متعدد خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، جو یادگار بھی ہیں اور قیمتی سرمایہ بھی۔

حلیم وبردبار، باوقار، مانوس کر لینے والے اور ہو جانے والے آدمی تھے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں میرے لیے راحتِ عزیزاں تھے۔ بازار سے جب کوئی چیز انھیں لینی ہوتی یا مجھے، ایک ساتھ جاتے اور بہت سی دکانوں میں کسی ایک چیز کو بار بار دیکھنے، بھاؤ تاؤ کرنے اور گھنٹوں پاؤں پیدل چلنے کے باوجود، ان کے چہرے پر کسی طرح کی اکتاہٹ نہ ہوتی۔ ان میں سچے مؤمن کی سادگی، تواضع اور انکسار تھا۔ میں نے انھیں کبھی ناراض ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا سینہ کرم گستری کا مخزن ہے۔

مئو کا جب بھی کوئی مہمان آتا، یا اعظمی طلبہ کوئی تقریب برپا کرتے، تو مجھے بہ اصرار بلانا نہ بھولتے۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتے: کہ تم مئو ہی آ جاؤ اور وہیں بس جاؤ، میں تو تمھیں بالکلیہ وہیں کا سمجھتا ہوں۔ ←

تھی۔ وہ ان کو دن بھر کا حساب چکا رہے تھے اور ساتھ ہی جرح قدح بھی، کہ تم نے فلاں جگہ کواڑ پر پینٹ کا رنگ شوخ کیوں کر دیا؟ اور فلاں جگہ دیوار پر نیلا رنگ کرنے کو تمھیں کس نے بتا دیا تھا؟ اور ہاں دیکھو! تمھیں فلاں جگہ کی دیوار توڑ کر اجلاس کے بعد دوبارہ چننی ہوگی، اس میں فلاں فلاں کمی رہ گئی ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد، وہ اِس ہفت خواں سے فارغ ہوئے؛ لیکن ان کے چہرے سے، جس طرح تکان کے آثار عیاں تھے، اس کے پیشِ نظر ہم لوگوں نے اجازت لینی چاہی، تو انھوں نے بہ اصرار بٹھالیا اور ماحضر سے فارغ کرنے کے بعد ہی، ہم لوگوں کو دیر گئے رات کو رخصت مل سکی۔

عصر کے بعد سے ایک بجے رات تک کے عرصے میں، ہم لوگوں نے انھیں جس طرح مختلف الطبائع مشاغل میں مسلسل مصروف دیکھا، اِس کو اُن کی کرامت کہیں، یا دارالعلوم کا اعجاز، یا اکابرِ دارالعلوم کے نفس گرم کی تاثیر؟۔ مولاناؒ جوشِ عمل سے سرشار اور ایک ''فرہادی کیفیت'' میں مبتلا محسوس ہوے؛ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کئی ماہ تک شب و روز کے جہدِ مسلسل کی وجہ سے، ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل نڈھال ہوگئے اور اجلاس کی کارروائیوں میں، جن میں ان کا اصلی جوہر صحیح طور پر نمایاں ہوتا، شریک نہ ہوسکے۔ ۲۵ر

← دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس میں مئو کے بہت سارے علما و رفقا کی جلو میں مجھے بھی ساتھ لیے لیے پھرتے رہے۔ ان کی وجہ سے اتنا اچھا اور پر لطف وقت گزرا کہ اس کی لذت اب تک یاد ہے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

حضرت الاستاذؒ کے زمانۂ طالب علمی میں ''مدنی دارالمطالعہ'' کی طرف سے دیواری رسالہ ''آزاد'' نکلتا تھا، جس کی ادارت کے فرائض حضرت الاستاذؒ انجام دیتے تھے اور مولانا ضیاء الحسنؒ (جو اُس وقت خود بھی دارالعلوم میں زیرِ تعلیم تھے) اس میں ان کے خصوصی معاون تھے۔

مارچ کو مجھے بہ راہِ دہلی واپس ہونا تھا، ۲۴ کو میں حاضر ہوا، تو وہ شہر میں اپنے گھر میں، بسترِ علالت پر دراز تھے اور اپنے آپ کو عمل کی بھٹی میں مکمل طور پر جھوک دینے کی قیمت، کچھ ادا کر چکے تھے اور کچھ ادا کرنی باقی رہ گئی تھی!

ع باقی ہے ابھی رنگ، مرے خونِ جگر میں

کیمپ دار العلوم اور مولاناؒ کے کارہائے شیشہ و آہن

اجلاسِ صد سالہ کے بعد ایسا لگتا ہے کہ جیسے بد قسمتی سے دار العلوم کو نظرِ بد سی لگ گئی اور طویل رستاخیزی کے بعد ۱۴۰۱ھ-۱۹۸۱ء میں پولیس ایکشن کے بعد دار العلوم کو بند کر کے طلبہ کو نکال دیا گیا۔ اُس وقت حضرت مولاناؒ نے بعض بہی خواہوں، جن میں سرفہرست حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ [۴۳]

---

(۴۳) (اضافہ بہ موقع طبع سوم) مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ: مشہور ملی و دینی قائد و رہ نما، جمعیۃ علمائے ہند کے صدر، دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن رکین اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خلفِ اکبر ہیں۔

ولادت ۶ رذی قعدہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۷ راپریل ۱۹۲۸ء بہ روز جمعہ دیوبند میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت میں والدہ ماجدہ کا بڑا حصہ رہا، لیکن ابھی آپ کی عمر ۹ سال کی تھی کہ والدہ صاحبہ کا ۱۳۵۵ھ میں انتقال ہو گیا۔ پھر آپ نے ابتدائی تعلیم کے مراحل شیخ الاسلام کے خصوصی خادم مولانا قاری اصغر علی سہس پوری کے زیرِ نگرانی طے کیے۔ ۱۳۶۵ھ-۱۹۴۵ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد کچھ عرصے مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ ۲۸ رشوال ۱۳۷۰ھ = ۵ رجولائی ۱۹۵۱ء کو دار العلوم میں بہ حیثیت مدرس تقرر ہوا۔ ۲۴ رذی قعدہ ۱۳۷۲ھ = ۷ رجولائی ۱۹۵۳ء کو استقلال منظور ہوا۔ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء تک آپ مسلسل تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر ملی و قومی خدمات کے جذبے اور تقاضے کی وجہ سے، تعلیمی خدمات کا سلسلہ موقوف کر دینا پڑا۔ جون ۱۹۶۳ء (صفر ۱۳۸۳ھ) میں جمعیۃ علما کے ناظم عمومی اور ۱۱ راگست ۱۹۷۳ء (شعبان ۱۳۹۲ھ) میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۲ رنومبر ۱۹۸۶ء (۲۸ رربیع الاول ۱۴۰۷ھ) کو آپ کو نائب امیر الہند اور ۹ رمئی ۱۹۹۲ء (۶ رذی الحجہ ۱۴۱۲ھ) کو آپ کو امیر الہند منتخب کیا گیا۔ متعدد مرتبہ آپ ممبر پارلیامنٹ رہے۔ دار العلوم کے قضیے میں شوریٰ اور دار العلوم کے دستوری کردار کی بحالی کے لیے آپ نے بڑا رول ادا کیا۔ کیمپ کے بعد دار العلوم کی شوریٰ کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ کی زندگی ملی و قومی ←

تھے، کی مدد سے ''کیمپ دار العلوم'' قائم کیا اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کی ٹھانی۔ اس زمانے میں، جس طرح مولاناؒ نے ''کارہائے شیشۂ و آہن'' انجام دیے، جس طرح طلبہ کو نہ صرف مطمئن رکھنے کی کوشش کی؛ بل کہ اپنی سحر طراز شخصیت سے اُن کو ''دنوں کی تپش'' اور ''شبوں کی گدازی'' انگیز کرنے پر آمادہ کیا اور ''گردشِ ایام'' کو سہنے اور اسے اپنی نئی زندگی کی خوش آئند شروعات کی علامت بنا لینے کے لیے، اُن کے اندیشۂ ناپختہ کار کو، جس طرح جنوں آمیز کیا، وہ بہ ذاتِ خود ایک تاریخی کارنامہ ہے اور اُن کی حیاتِ نشاط انگیز و حوصلہ خیز کا ایک روشن باب بھی۔

وہ طلبہ کے معاملات سے نمٹتے، حالات کی نزاکت کی وجہ سے پیدا شدہ، طلبہ کی سیمابی کیفیات کا حل ڈھونڈتے، اخبار نویسوں کے نت نئے سوالات کا جواب دیتے، پولیس افسران کی بلا ضرورت کی دل چسپیوں کا مداوا کرتے، باہر سے آنے والے وفود سے ملاقاتیں کرتے، اہلِ شہر سے روابط رکھتے، اُن سے تعاون لیتے اور بعض دفعہ تعاون کی قیمت بھی چکاتے۔

میرے ایک ہونہار عزیز مولوی حسین احمد قاسمی سیتا مڑھی(۴۴) ''حال

→ خدمات کے سلسلے میں جہدِ مسلسل اور سرگرمی پیہم سے عبارت ہے، کہا جا سکتا ہے کہ ملی قیادت کے حوالے سے سرگرمیِ کار اور فعالیت میں کوئی مسلم قائد آپ کو نہیں چھو سکتا۔

(۴۴) مولوی حسین احمد قاسمی رائے پوری (سیتا مڑھی) میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔ ان کا خمیر دور بینی، سنجیدگی اور پاک نفسی سے اٹھا ہے۔ وہ بچپن سے صوم و صلوٰۃ کے پابند اور سحر خیزی کے عادی رہے۔ مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ اور حالیہ حالات سے خوب واقفیت رکھتے اور مسلمانوں کی موجودہ تباہی سے، کم سنی کے باوجود اذیت محسوس کرتے ہیں۔ اقبالؔ، حالیؔ، اکبرؔ الہ آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کو خوب پڑھا تھا اور ان نادرہ ہائے روزگار مفکروں اور اسلامی شعرا کے خیالات کا، اُن کے اسلامی شعور کی ←

متعلّم جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ'' (ریاض) اُن دنو کیمپ دارالعلوم کے طالب علم تھے، مجھے جہاں اخبارات وجرائد (جن کے صفحات اُس وقت اس گرم موضوع سے بھرے رہا کرتے تھے) سے دارالعلوم کے ہنگامے اور کیمپ کے حالات سے آگاہی ہوتی، وہیں مذکور الصدر عزیز کے پیہم اور تفصیلی خطوط سے بھی، جن میں سے اکثر میرے پاس محفوظ ہیں۔ اُن سے جہاں دیگر خدامِ کیمپ اور اساتذۂ گرامی کی بے بہا سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا، وہیں مولاناؒ کے اولوالعزمانہ وفاتحانہ کارناموں کی تفصیلات کی جان کاری بھی حاصل ہوتی۔ مولاناؒ نے طلبہ میں اپنی صدائے دل نواز سے جو'' آثارِ جنوں'' پیدا کر دیے تھے، وہ اُن خطوط کی سطر سطر سے مترشح ہوتے۔

ایک خط میں عزیز موصوف نے لکھا کہ:

'' کیمپ دارالعلوم کی پوری فضا علمی بنی ہوئی ہے، درس وتدریس

← تشکیل میں نمایاں کردار رہا ہے۔ بزرگوں اور صلحا کی صحبت سے پیدائشی مناسبت ہے۔ دیوبند میں اکثر حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق صدر مفتی دارالعلوم کی خدمت میں رہتے۔ اس سے پہلے بھی جس مدرسے میں رہے، وہاں کے خوش اوقات مدرسین سے ضرور وابستہ رہے، جس کی وجہ سے اُمورِ دین کے ساتھ ساتھ، امورِ دنیا میں بھی ان کی سلیقہ مندی کا جوہر اور نکھر گیا۔

مولاناؒ سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، یہاں دیوبند کے زمانے میں ان کی محبت میں ہر وقت پر جوش رہتے اور ان کے کسی بھی درد کو محض اپنا درد سمجھتے۔

مجھ پر سوسو جان سے فدا رہتے ہیں۔ وہ جب تک دیوبند میں طالب علم رہے، زندگی کے بارگراں کا مجھے احساس کم رہا۔ میرے غم کو ایسا تقسیم کر لینے والا آدمی مجھے کم ہی ملا ہوگا۔ سفر میں تو مادرِ مہربان کی طرح نظر آتے ہیں۔

(اضافہ بہ موقع طبع سوم) تعلیم کے بعد انھوں نے کئی سال سعودی عرب میں گزارے، اب کئی سال سے دہلی میں مقیم ہیں، جہاں اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔

پابندی سے جاری ہیں.... جیسے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ ضمیروں اور خوابیدہ صلاحیتوں کی بیداری کا کسی نے انجکشن لگا دیا ہے، یہ انجکشن لگانے والا کون ہے؟ یہ وحید الزماں ہیں، عارفِ آئینِ قدرت، وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید وبیم، حامیٔ امن و امان اور مردِ میداں ... طلبہ کے سامنے ہر وقت پروگراموں کا ایک طویل دفتر، اپنی تقریروں میں پیش کرتے رہتے ہیں، جن میں طلبہ ہمہ تن مصرف رہا کرتے ہیں۔''

نئے انتظامیہ کے تحت دار العلوم کھلنے کے بعد، قافلۂ عمل کو تیز رو کرنے میں مولاناؒ کا حصہ

پھر ۱۴۰۲ھ-۱۹۸۲ء میں نئے انتظامیہ کے تحت جب دار العلوم دوبارہ کھلا، تو انھوں نے تعلیم و تعلّم اور انتظام و انصرام کو، از سرِ نو استوار اور قافلۂ عمل کو تیز روی سے محوِ سفر کرنے کے لیے، اپنے رفقا کے تعاون سے سو سو جتن کیے۔

مذکور الصدر عزیز کے خطوط ہی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کیمپ اور اس سے قبل کی رستا خیزی و روح گدازی — جیسا کہ خدشہ تھا — رنگ لائی اور مولاناؒ شدید طور پر علیل ہو گئے۔ علاج کے لیے کچھ دنوں دہلی میں گزار کر دیوبند تشریف لے آئے؛ لیکن ہجومِ کار اور پرسشِ احوال کے لیے آنے والوں کی کثرت کی وجہ سے مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج ضلع جون پور تشریف لے گئے؛ لیکن اس وقت چوں کہ شدت سے، ان کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اس لیے منتظمین نے، ان سے جلد دار العلوم واپس آ جانے کی درخواست کی۔

۱۲ار جب ۱۴۰۲ھ کو روانہ کردہ ایک خط میں عزیزِ موصوف نے لکھا کہ:

''حضرت مولانا وحید الزماں صاحب مدظلہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی، مسلسل علاج کے بعد کچھ افاقہ ہوا تھا، تو دہلی سے یہاں دیو بند آ گئے تھے؛ لیکن لوگوں کی آمد ورفت کی کثرت کی وجہ سے، پھر یہاں سے چلے گئے اور بیس روز سے مدرسہ بدر الاسلام، شاہ گنج، جون پور میں آرام فرما رہے ہیں، چوں کہ ان کے بغیر کنٹرول نہیں ہو رہا ہے اور یہاں سے شہریوں کی جانب سے اور طلبہ و اہتمام کی طرف سے کئی کیلی گرام جا چکے ہیں: اس لیے دو تین روز میں تشریف لا رہے ہیں۔''

بہ ہر حال انھوں نے تشریف لانے کے بعد یہاں اپنی مجتہدانہ بصیرتِ فکر و عمل اور نوائے دل نواز سے آتشِ گل کو حسب توقع، تیز تر کیا اور طلبۂ عزیز کو اپنی دلبرانہ و ساحرانہ تقریروں سے پھر گرما و تڑپا دیا۔

لائق افراد کی فراہمی کے لیے، اُن کی فکرمندی و بے تابی کی ایک مثال

مختلف شعبوں کے لیے لائق افراد کی فراہمی، اُس وقت غالباً سب سے بڑا مسئلہ رہی ہوگی، اِس کے لیے بھی انھوں نے جس محنت اور بے تابی و فکر مندی سے کام کیا، اس کا اندازہ، اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مے خانۂ وحیدی کے میرے ندیمِ دیرینہ مولانا بدر الحسن صاحب قاسمی (۴۵) دار العلوم میں

(۴۵) مولانا بدر الحسن صاحب قاسمی موضع ''ریوڑھا'' ضلع دربھنگہ (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں ''مقامات حریری'' میں، جو ہماری طالب علمی کے زمانے میں مولاناؒ ہی کے زیرِ تدریس تھی، میرے ہم سبق تھے، اتفاق سے ان کا کمرہ بھی دار جدید میں میرے کمرے سے متصل تھا: اس لیے ہر وقت ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ دار العلوم ←

نئے انتظامیہ کی استواری کے بعد بہ حیثیت مدرس اور مدیر ''الداعی'' اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کے لیے رضامند نہ ہوئے، تو حضرتؒ نے کئی مجلسوں میں، جن میں مولوی حسین احمد قاسمی بھی موجود ہوتے، اُن کی جگہ پُر کرنے کے لیے، اِس ناچیز کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ میں بے تابانہ اظہارِ طلب فرمایا:

''مولانا نور عالم کو چاہیے کہ وہ ہمارے بلانے پر فوراً آجائیں اور ہمارا تعاون کریں، ہمارے ساتھ رہ کر ہمارا ہاتھ بٹائیں۔''

اور مولوی حسین احمد کو حکم فرمایا:

'' میں انھیں ''الداعی'' کی ادارت اور تدریس کے لیے بلانا چاہتا ہوں، تم انھیں خط لکھ دو کہ وہ تیار رہیں اور میرا خط ملتے ہی مجھ پر رحم کرکے یہاں آجائیں۔''

(خط مولوی حسین احمد قاسمی مورخہ ۱۴۰۲/۸/۲۱ھ)

میں نے عزیز موصوف کو لکھا کہ حضرتؒ کا حکم سر آنکھوں پر، آپ کے جذبات کی بھی میں قدر کرتا ہوں؛ لیکن حضرتؒ یا کسی ذمے دار کا تحریری حکم

← میں چند ہم وطن اور ہم ذوق طلبہ کی، ہم لوگوں کی جو جماعت تھی، اس کے ایک اہم رکن مولانا بدر بھی تھے۔ اس جماعت کے سرخیل مولانا محمد رضوان القاسمی دربھنگوی (حال حیدرآبادی، بانی و ناظم مدرسہ سبیل السلام حیدرآباد، ادیب، خطیب، عالم، فقیہ، ظریف تھے) اور اس کے روحِ رواں مولانا قاری حافظ شبیر احمد دربھنگوی سابق استاذ مدرسہ دینیہ غازی پور و حال مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھرواره، ضلع دربھنگہ (بہار) تھے، جو اپنے اردو ادب کے صاف ستھرے مذاق میں، تمام طلبۂ دارالعلوم میں اُس وقت استاذ کا درجہ رکھتے تھے۔ مولانا بدر زمانۂ طالبِ علمی میں بھی کثرتِ مطالعہ اور خوش مزاجی میں مشہور تھے۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں مدرس ادب عربی اور مدیر الداعی کے عہدے پر فائز رہے۔ عربی زبان کے حوالے سے، حضرتؒ کے گنے چنے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ دارالعلوم کے حالات جب خراب ہوئے، تو وہ کویت چلے گئے، وہاں وزارتِ اوقاف میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔ اپنی پرکشش شخصیت اور حسنِ اخلاق و کردار کی بنا پر وہاں بھی ہر دل عزیز ہیں۔

نامہ آئے، تو میں غور کروں گا۔

مادرِ علمی میں خدمتِ تدریس وادارت کے لیے، میرے نام مولاناؒ کا تحریری حکم نامہ

چناں چہ ۱۴ر رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ ۔ ۷ر جون ۱۹۸۲ء کا تحریر کردہ حضرتؒ کا حکم نامہ ان الفاظ کے ساتھ ملا:

''برادر عزیز القدر مولوی نور عالم صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ میں ابھی دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے ''موریشش'' جاؤں گا۔ اس وقت بلا تمہید یہ کہنا ہے کہ اِس وقت دارالعلوم کو آپ جیسے ہونہار اور مخلص افراد کی ضرورت ہے۔ الداعی اور تدریس کے لیے آپ کا انتخاب کیا گیا ہے، اگر آپ کے لیے کوئی خاص مانع نہ ہو، تو کوشش کر کے دارالعلوم آجانے کا فیصلہ کرلیں اور ماہِ شوال میں آجائیں تو بہتر ہے۔

میری واپسی عید تک ہو سکے گی، امید ہے کہ اُس وقت تک آپ کا جواب اثبات اور قبول ومنظوری کی صورت میں آچکا ہوگا۔

اس خط کی روانگی کے لیے عزیزم حسین احمد کو مکلّف بنا رہا ہوں۔

خیریت کا خواہاں، مخلص: وحید الزماں – ۱۴ر رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ

اس کے جواب میں ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ/ ۱۵ جون ۱۹۸۲ء کو میں نے حضرتؒ کو لکھا کہ آپ کی طرف سے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے لیے،

خدمت کی پیش کش ہر طرح باعثِ سعادت ہے اور ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل بھی کہ ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء میں دار العلوم سے میری روانگی کے وقت آپ نے اپنے ایک عنایت نامے میں فرمایا تھا کہ ''میرا دل کہتا ہے کہ تم جلد یا بہ دیر دار العلوم آؤ گے۔ لہٰذا ''هٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا''۔

مولاناؒ چوں کہ ہنوز سفر پر تھے اور ضروری خطوط وغیرہ کے جوابات کے لیے مولانا نسیم احمد صاحب قاسمی بارہ بنکوی[۴۶] (حال استاذ دار العلوم دیوبند) کو مکلّف کر گئے تھے؛ اس لیے میرے مذکورہ خط کا مولاناؒ کی طرف سے، اُنھی نے ۲۸؍ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ کو جواب دیا کہ حضرت تادمِ تحریر سفر سے واپس نہیں آئے؛ لیکن چوں کہ دار العلوم کو آپ کی ضرورت ہے؛ اس لیے آپ حضرت کے حکم کے مطابق شوال میں ضرور آ جائیں۔

اُس وقت دار العلوم عبوری دور سے گزر رہا تھا، اس کی غیر یقینی صورتِ حال کی اطلاع، مجھے اِس تسلسل سے اخبارات اور خطوط کے ذریعہ مل رہی تھی، کہ دار العلوم سے دیرینہ ''عشقِ بے پروا'' کے باوصف، میں یہاں آنے کے

---

(۴۶) مولانا نسیم احمد صاحب قاسمی بارہ بنکوی: میانہ قد، گندمی رنگ، متواضع اور خوش اخلاق۔ ان کا وطن ''رام نگر''، ضلع بارہ بنکی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں دار العلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں فارغ ہوئے ۱۹۷۹ء میں تکمیل ادب اور ۱۹۸۰ء میں تخصص ادب میں اعلیٰ درجے کی کام یابی حاصل کی۔ ۱۹۸۱ء میں افتا کیا۔ ۱۹۸۲ء میں کیمپ دار العلوم میں حضرت الاستاذؒ کے حکم کے بہ موجب روزانہ چار گھنٹے پڑھایا کرتے تھے۔ نئے انتظامیہ کے قیام کے بعد ۱۹۸۲ء میں دار العلوم میں مدرس ہوئے۔ اِس وقت دار العلوم میں جلالین شریف وغیرہ کتابیں ان کے زیر تدریس ہیں۔ پڑھنے پڑھانے میں محنتی ہیں۔ عربی ادب کا بھی مذاق ہے۔ پاکیزہ خط اور پاکیزہ اخلاق ہیں۔ اپنی صلاحیت نیز بردباری اور نیکی وخوش اخلاقی کی وجہ سے، لوگوں کی نگاہ میں محبوب ہیں؛ ان کے ایسے لوگ خدا کی نگاہ میں بھی محبوب ہوتے ہیں۔

لیے، اپنے آپ کو آمادہ کرنے کے حوالے سے، اتنا متردد رہا کہ رمضان کا پورا آخری عشرہ، اِسی ادھیڑ بن میں گزر گیا کہ دارالعلوم آئیں یا نہ آئیں۔

استخاروں اور مشوروں سے بھی متر ددانہ کیفیت ختم نہ ہوئی؛ لیکن گھر کے سارے افراد، علاقے کے قاسمی حضرات، جن میں میرے دوست مولانا صابر حسین قاسمی(۴۷) سرفہرست تھے اور وطن کے تمام اہل الرائے مخلصوں، بالخصوص میرے مشفق ومحسن حافظ ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب(۴۸) کی رائے ہوئی، کہ مجھے بغیر

---

(۴۷) مولانا صابر حسین قاسمی مظفر پوری: معصوم سی صورت، پیکرِ خلوص ودل نوازی، ایک شانِ بے نیازی یا شانِ خود اعتمادی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں سے وہ مجھ سے جدا ہیں اور کس جگہ سے میں ان سے الگ ہوں۔ دکھ درد کو ہمیشہ بہ قدرِ ظرف تقسیم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور پتہ نہیں کتنی بار، وہ بازوئے برادر سے زیادہ کچھ ثابت ہوئے۔ ''نیا گاؤں'' ''ٹولہ'' ''اُسری'' اورائی۔ مظفر پور کے ایک کسان خاندان کے ہونہار فرد ہیں۔ یہ گاؤں میری نانھیال ''ہرپور بیشی''، اورائی، مظفر پور (جو سرِ دست میرا رہائشی وطن بھی ہے) کا اٹوٹ حصہ سمجھا جاتا ہے۔ شادی وغمی میں ہم دونوں کے گھرانے، عرصے سے ایک دوسرے کے شریک ہیں اور بعض دفعہ دونوں کے درمیان، خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔

اِس وقت مدرسہ ''دارالملت'' رام پور سگھری بلن بھدز پور میں کارِ تدریس میں ہمت وحوصلے کے ساتھ مشغول ہیں۔

(۴۸) حافظ ڈاکٹر عزیز الرحمٰن صاحب:

ع زباں پہ بارِ خدایا، یہ کس کا نام آیا

صوم وصلوٰۃ کے پابند، عالمِ اسلام کے حالات سے باخبر، امت مسلمہ کی محرومی ومجبوری پر خون کے آنسو بہانے والے اور مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے کسی بھی تازہ ستم پر تڑپ اٹھنے والے۔

میرے محسن، میرے ہم قریہ، شفقتِ پدر اور خلوص مادر؛ پہلی ملاقات اب ذہن میں دھندلائی جارہی ہے؛ لیکن اتنا یاد آتا ہے کہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں ۱۳۸۱ھ میں داخل ہونے کے بعد چھٹی گزارنے شاید مجھے پہلے تو اپنی دادھیال ''رائے پور''، ضلع مظفر پور، بہار (حال ضلع سیتامڑھی) آنا پڑا ہوگا، پھر اپنی نانھیال ''بیشی''، ضلع مظفر پور، بہار۔ ''اورائی'' جہاں ہمارا بلاک (Block) بھی ہے اور تھانہ اور بازار بھی، آنا جانا ہوتا ہی تھا۔ حافظ صاحب ہمیشہ سے ''اورائی'' کثرت سے اور اول وقت میں جانے اور پورا دن ←

تر ددکے اِس خدمت کوقبول کر لینا چاہیے۔

بہ ہر صورت تردّد کے باوجود، حضرت الاستاذؒ سے تعلقِ خاطر اور دارالعلوم سے لازوال الفت نے مجبور کیا کہ میں ۲۲ر شوال ۱۴۰۲ھ = ۱۵ر جولائی ۱۹۸۲ء کو دیوبند آجاؤں۔ حضرت کی ابھی سفر سے واپسی نہ ہوسکی تھی، وہ آئندہ ذی الحجہ کے اوائل ہی میں سفر سے تشریف لا سکے؛ لیکن انھوں نے بیرونِ ملک سے ہی ایک طالب علم مولوی عبدالشہید پورنوی(۴۹) اور دیگر اپنے

← وہاں گزارنے کے اب تک عادی ہیں۔ صغیر صاحب ''مقصود پور'' والے کے ہوٹل میں شاید چائے لینے کو بیٹھے ہوں، میں سامنے سے گزرا، انھوں نے آواز دی۔ خاندانی طور پر تو جانتے ہی تھے، پوچھا کیا پڑھتے ہو اور کہاں؟ میں نے فعل ماضی کی گردان کی طرح جلدی جلدی ساری باتیں کہہ ڈالیں، وہ دن اور آج کا دن ایسی شفقت وخلوص کا معاملہ زندگی بھر فرماتے رہے، کہ حالات کے بہت سارے نشیب وفراز کے باوجود، اس میں فرق نہ آنے دیا۔

زندگی کے بعض دل دوز مواقع پر حافظ عزیز صاحب نے، جس طرح میرے زخم پر مرہم رکھا، اس کو لطفِ الٰہی کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد سے ہی وہ میرے لیے سربراہِ خاندان کی حیثیت اختیار کر گئے۔ میں ساری خط وکتابت انھی کے نام سے کرتا اور خاندانی وعلاقائی حالات انھی سے معلوم کرتا ہوں۔ کسی بھی نازک معاملے میں کئی ایک سے مشورے کے بعد، جب تک ان سے مشورہ نہیں کر لیتا، اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ وہ کسی بات پر صاد کر دیتے ہیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک بندۂ خدا کا ''الہام'' ہے، ان شاء اللہ اب میرے لیے خیر اسی میں پوشیدہ ہے۔ حضرت الاستاذؒ کے حادثۂ وفات پر میرے گاؤں میں سب سے زیادہ وہی غم گین نظر آئے؛ اس لیے کہ وہ انھیں، میرے واسطے سے، کام ومقام کے ساتھ خوب جانتے تھے۔ کئی روز تک افسردہ رہے اور بار بار ان کو اور ان کے کارناموں کو گلوگیر آواز میں ذکر کرتے رہے۔ خدا صحت کے ساتھ عمرِ دراز بخشے۔

(۴۹) مولوی عبدالشہید پورنوی: جیسا کہ نام کے لاحقے سے مترشح ہے، وہ بہار کے ضلع پورنیہ- جواب کئی ضلعوں میں تقسیم ہوگیا ہے- کے کسی علاقے کے تھے۔ ہنس مکھ، خوش مزاج، خوش پوشاک، خوش اطوار، فراخ دل، فراخ چشم؛ چستی وسلیقے مندی کا حسین مجموعہ۔ ہر کام کو اس طرح انجام دیتے، جیسے اس کے علاوہ طرز پر اس کو انجام دینا ممکن نہ ہو۔ حضرت الاستاذ کی تربیت کا ایک خوش نما مظہر۔ ان پر جس وقت اور جس حال ←

اہلِ تعلق، عربی زبان وادب کے شائق تلامذہ: مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قاسمی بیگوسرائے[50] (حال مقیم ریاض) اور مولوی حسین احمد قاسمی[51] وغیرہم کو تاکید کردی تھی، کہ مجھے ان ہی کے کمرے میں ٹھہرایا جائے۔

← میں نگاہ پڑتی، امید کی شمعیں دل میں روشن ہو جاتیں، بے حساب محبت کرتے اور بعض دفعہ اپنوں سے زیادہ اپنائیت کا احساس دلا دیتے۔

میں جس وقت شوال ۱۴۰۲ھ میں استاذ کی حیثیت سے دارالعلوم وارد ہوا، اس وقت وہ حضرتؒ کے گویا خدام خاص میں تھے، مولاناؒ کے کمرے سے ملحق اوپر کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ مولاناؒ کے مذکورہ سفر کے دوران، ان کے کمرے کے کلید بردار اور مکمل ذمے دار تھے؛ اس لیے حتی المقدور مہمان نوازی و دل داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

جب میں نے بہ حیثیت مدیر ''الداعی'' محوِ سفر ہونے کے لیے، اس کا دفتر - جو ہنگامے کے دوران ختم ہو گیا تھا - از سرِ نو ترتیب دینا شروع کیا؛ تو ارادے کو عمل کی حیثیت دینے اور متعلقہ شعبہ جاتِ دارالعلوم سے ہر طرح کی ضرورتوں کو بہ حسن و خوبی اور بہ عجلت تمام پوری کرنے کے لیے؛ جس تن دہی، ہنر مندی، لیاقت اور ''استاذی'' کا ثبوت دیا، اس کا نقشِ جمیل اب تک خانۂ خیال میں تازہ ہے۔

ایک سال کے بعد ہی وہ دارالعلوم سے جو گئے، تو نہ آنا تھا نہ آئے۔ وہ جہاں ہوں اللہ ہمیشہ شاد کام رکھے۔

(۵۰) مولانا حفظ الرحمٰن قاسمی۔ بیگوسرائے (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں، اس وقت ریاض، سعودی عرب میں برسرِ ملازمت ہیں۔ حضرتؒ کے ان مخصوص تلامذہ میں ہیں، جو دارالعلوم سے رسمی فراغت کے بعد بھی عرصے تک، ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔ دارالعلوم میں تکمیل ادب بھی کیا اور تخصصِ ادب بھی۔ مولاناؒ کے دارالمؤلفین کے لیے بھی، ان کی نگرانی میں کئی ایک تحریری کام کیے۔

سنجیدہ، متین ہونے کے ساتھ ساتھ، پر جوش نوجوان ہیں، دارالعلوم میں ہنگاموں کے دوران حضرتؒ کے لیے سینہ سپر رہے اور کسی بھی ''آفتِ ناگہانی'' کے مقابلے کے لیے، سب سے آگے نظر آتے۔

اردو، عربی میں استعداد کے ساتھ ساتھ، بعد میں جامعہ ملیہ دہلی سے بی۔ اے بھی کر لیا تھا۔

خدمت گزاری کے جذبے سے ان کا خمیر اٹھا ہے۔ دارالعلوم میں حضرت الاستاذؒ کے تحریری حکم نامے کے بہ موجب، جب راقم الحروف حاضر ہوا، تو انھوں نے سفر سے اُن کی واپسی تک جس طرح میری خدمت کی، ہر وقت ساتھ رہے، دل بہلایا اور سہولتیں بہم پہنچائیں، اس کی وجہ سے، میرا دل ان کے لیے شکر و سپاس کے جذبے سے سرشار ہے۔

(۵۱) ان کا تعارف حاشیہ نمبر ۴۴ پر گزر چکا ہے۔

اس کے بعد کے حالات و واقعات بھی تفصیل طلب ہیں؛ لیکن میرے اس وقت کے موضوع سے خارج ہیں۔

مجھے تو یہ بتانا تھا کہ طویل ہنگامے کے فوراً بعد کا یہ وقت، جو "کارواں سے ٹوٹنے" اور "حرم سے بدگمانی" کا نازک وقت رہا ہوگا، اُس میں رفتارِ عمل کو نہ صرف اپنی قدرتی حالت پر لانے؛ بل کہ اُس کو مہمیز کرنے کے لیے، مولاناؒ نے کس طرح کوہ کنی کی۔ یقیناً انھوں نے دارالعلوم کے دیگر تعلیمی و انتظامی شعبوں کے لیے بھی کارگزار افراد کو جٹانے کے لیے یہی کچھ کیا ہوگا۔

دارالعلوم کے نئے دور میں، مولاناؒ کے تابندہ کارنامے

مارچ ۱۹۸۲ء میں نئے انتظامیہ کے تحت دارالعلوم کھلنے کے بعد ۱۹۸۳ء کے آغاز میں، مولاناؒ کا انتخاب ناظمِ مجلسِ تعلیمی کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ تعلیمات، اہتمام کے بعد دارالعلوم کا سب سے اہم شعبہ ہے اور غالباً دارالعلوم کی ترقی وتنزل کے معیار کی تعیین میں، جتنا اس کو دخل ہے کسی اور شعبے کو نہیں، خصوصاً اُس نازک وقت میں جب کہ دارالعلوم موت وحیات کی کش مکش سے ابھی جاں بر ہی ہوسکا تھا، اُس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھی ہوئی تھی۔ مولاناؒ کا جیسا کہ مزاج تھا کہ جب وہ کسی کام کی ذمے داری اپنے سر لے لیتے، تو اس کے لیے تن من دھن: سبھی کچھ لگا دیتے اور "یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید" کے مخلصانہ و وفا شعارانہ منصوبے پر عمل پیرا ہو جاتے۔ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے میں بھی، انھوں نے اسی

جوش و جذبے اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کیا اور اس وقت کے حالات کے عدم استحکام کے باوجود، اپنے رفقا کے تعاون سے، اس شعبے کے شجرِ طوبیٰ کو برگ و بار سے بوجھل بنا دیا۔ بہت سی اصلاحات کیں، خامیاں دور ہوئیں، روٹینی نظام میں فرق پڑا، اساتذہ میں ذوق و شوق پیدا ہوا، طلبہ میں لذتِ عمل کا شعور بیدار ہوا اور کاروانِ تعلیم تازہ دم نظر آنے لگا۔

لیکن ۱۹۸۵ء میں مجلسِ شوریٰ نے انھیں معاون مہتمم کے عہدے پر فائز کر دیا، کہ اُس وقت انتظامی امور میں برق رفتاری اور حسن کاری کی ضرورت تھی۔ مولاناؒ کے حسنِ انتظام، سبک پروازی، رعنائی تخیل اور ملکۂ تخلیق سے دارالعلوم کے اس سب سے بڑے شعبے میں نئے نئے نقش و نگار ابھر آئے اور تھوڑے ہی دنوں میں دفتری کارکردگی میں، سبک سیری پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ، بہت سی نئی تعمیرات کا بدیع و بلند نقش، دارالعلوم کے حرمِ محترم کے آئینۂ شفاف پر، اِس طرح جگمگانے لگا، جیسے خود اُن کا عزمِ مومنانہ، ان کی قوتِ عمل کے آئینے میں۔ اس طرح وہ ایک بار پھر دارالعلوم کے افق پر اس طرح چھا گئے، جیسے ہماری طالب علمی کے زمانے میں:

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ، ناز تھا
وہ آگئے، تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

بہت تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے، دفترِ اہتما سے ملحق جانبِ مشرق کی گیلری توڑ کر، موجودہ دفتر اہتمام سے کچھ بڑا ہال تیار کر دیا اور اس کی بائیں جانب سے جانبین میں دو زینے احاطۂ دفتر میں، اِس طرح اتار دیے کہ

احاطۂ دفتر کا حسن دوبالا ہو گیا اور زیرِ کتب خانہ، دفتر برقیات کے بیچ سے احاطۂ کتب خانہ میں آمد و رفت کا، ایک کشادہ راستہ نکال دیا، جس سے گاڑی کے ذریعے احاطۂ دارِ جدید ہو کر، دارالعلوم میں آنے جانے کی سہولت پیدا ہو گئی؛ ورنہ دارِ جدید میں آنے کے لیے، صدر دروازے سے نکل کر بیرونِ دارالعلوم چکر کاٹ کر طویل راستے سے، مدنی یا معراج گیٹ سے آنا پڑتا تھا۔ نیز رواقِ خالد کی بالائی منزل، دارالتربیت کی عمارت، جامعہ طبیہ کے میدان میں چہار دیواری کا کام، سہارن پور روڈ سے ملحق ایک خوش نما و بلند دروازہ اور اساتذہ کے لیے کئی عدد عائلی مسکن کی تعمیر روبہ عمل آئی۔ اس کے علاوہ طلبہ کی رہائش گاہوں اور درس گاہوں میں متعدد جگہ ترمیمات و اصلاحات کر کے گنجائش پیدا کی گئی، یا سہولتوں میں اضافہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں انھیں اپنے گرامی قدر رفقائے کار یعنی اساتذہ و ملازمین اور ذمے دارانِ دارالعلوم، بالخصوص دارالعلوم کے نیک طینت اور بے لوث مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ (۵۲) کا جو تعاون و اعتماد اور ان کی جو تمنائیں اور دعائیں، ان

---

(۵۲) (اضافہ بہ موقع طبع سوم) حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند:

آپ شہر بجنور کے ایک بڑے زمین دار اور ذی وجاہت و شرافت و علم دوست صدیقی خاندان میں ۱۹۱۴ء (۱۳۳۲ھ) میں پیدا ہوے۔ آپ کے والد جناب مولانا مشیت اللہ بن قدرت اللہ دولت و ثروت کے باوجود، بڑے صالح اور نیک آدمی تھے، علامہ کشمیریؒ سے بڑی دوستی تھی اور وہ ان کے ہاں بجنور بہ کثرت تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز قیام کرتے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن نے ابتدائی تعلیم شرح وقایہ تک اپنے شہر بجنور کے مدرسہ رحیمیہ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء (۱۳۴۷ھ) میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوے اور ۱۹۳۲ء (۱۳۵۱ھ) میں فارغ ہوے۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مدنیؒ، حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی، علامہ بلیاویؒ، مولانا میاں اصغر حسینؒ، مولانا ←

کے شاملِ حال رہیں، انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء میں وہ معاون مہتمم کے منصب سے، تدریس

← غلام رسول خاں ہزاروی، مولانا نبی حسن، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم الپاکستانی تھے۔ فراغت کے بعد علالت کی وجہ سے آپ نے دو تین سال گھر پر گزارے، پھر دارالافتا دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگل پوریؒ اور دیگر صاحب فتوی وتقوی علما سے فتوی نویسی کے نصاب کی تکمیل کی۔

حضرت مدنیؒ کے دست گرفتہ ہیں۔ والد صاحب سے چوں کہ بڑی زمین وجائے داد ورثے میں ملی؛ اس لیے اس کے انتظام وانصرام کی وجہ سے وہ باقاعدہ تدریسی خدمات انجام نہ دے سکے: لیکن ہمیشہ ملی و قومی اور دعوتی واجتماعی کاموں میں سرگرم رہے۔ دارالعلوم دیوبند سے کئی پشتوں سے تعلق رہا؛ اس لیے اس کی خدمت میں دامے درمے قدمے سخنے ہمیشہ وہ اوران کا خاندان آگے آگے رہا۔

اسی وجہ سے اکابر نے آپ کو ۱۹۶۲ء (۱۳۸۳ھ) میں شوری کا رکن منتخب کیا۔ آپ نے اپنے صلاح وتقوی، سنجیدگی ومتانت، کم گوئی، صلابت رائے، دارالعلوم سے بے پناہ محبت کی وجہ سے، ہمیشہ شوری میں شرکت کی، اپنی رائے گرامی سے ارکان کو متاثر کیا اور سارے اکابر کے ہر دل عزیز رہے؛ اسی لیے اجلاس صد سالہ کے بعد جب دارالعلوم کے حالات خراب ہوے اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ نے شوری سے اپنے لیے مددگار کی درخواست کی، تو رجب ۱۴۰۱ھ/ اگست ۱۹۸۱ء میں ارکانِ شوری نے بالاتفاق آپ کو مددگار مہتمم منتخب کیا۔

نومبر ۱۹۸۱ء میں جب کیمپ دارالعلوم قائم ہوا، تو اس کے دوران آپ کو ارکان شوری نے متفقہ طور پر دارالعلوم کا مہتمم منتخب کیا۔ آپ کی انتظامی صلاحیت، دین داری، دیانت داری، سبھوں کو ساتھ لے کر چلنے کی لیاقت، سادگی اور دارالعلوم ایسے عظیم ترین ادارے کے وسیع معاشرے میں مختلف الطبائع انسانوں سے کام لینے کی قدرت، منصب کی بڑائی کے احساس سے مکمل طور پر عاری ہونے اور خاموشی کے ساتھ شب و روز کی محنت کی وجہ سے، دارالعلوم نے ہمہ جہت ترقی کی، خلفشار کے بعد اس کو اتنا استحکام نصیب ہوا، جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دارالعلوم کی خدمت کے لیے اپنی صحت اور آرام، کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ اس خدمت کو اپنے لیے، یقینی ذریعہ نجات اور ترقی درجات گردانتے ہیں اور ساری خدمات حسبتاً للہ انجام دیتے ہیں۔ دارالعلوم سے کسی طرح کا کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے، حتی کہ تن خواہ بھی نہیں لیتے، دارالعلوم میں قیام کے دوران خورد ونوش اور رہائش کے مصارف اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ کسی طرح کی شہرت اور چرچہ بھی پسند نہیں کرتے۔ گم نامی، عزلت پسندی اور ہمہ وقت خدمت آپ کی شناخت ہے۔

اللہ صحت وعافیت کے ساتھ عمرِ دراز سے نوازے۔

کی ذمے داریوں پر، واپس آگئے اور طلبہ کو ان کے تدریسی جوہرِ گراں مایہ سے دوبارہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

دار العلوم سے رسمی تعلق کا اختتام اور قلبی تعلق کا دوام

تا آں کہ مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۱-۲۲ شعبان ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹-۲۰ مارچ ۱۹۰۰ء نے ان کی بیماری کے حوالے سے، تدریسی ذمے داریوں سے بھی، انھیں سبک دوش کر دیا۔ تجویز کا متن حسبِ ذیل تھا:

''حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی جانب سے بار بار پیش آنے والی صورتِ حال زیر بحث آئی۔ مجلسِ شوریٰ ان کی بیماری اور اس کی بنا پر مشتعل اور بے قابو ہو جانے کی معذوری کے پیشِ نظر، ان کو تدریسی ذمے داریوں سے سبک دوش کر کے، مبلغ سات سو روپے ماہ وار وظیفہ دیا جانا منظور کرتی ہے۔''

اس تجویز سے انھیں ۱۴ر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ مطابق ۱۱ر اپریل ۱۹۹۰ء کو مطلع کر دیا گیا اور اس طرح دار العلوم سے، ان کی تاریخی وابستگی کا گو رسمی طور پر خاتمہ تو ہو گیا؛ لیکن ان کی عملی وفاداری میں تادمِ زندگی ذرہ برابر فرق نہ آیا، کہ اس کی محبت ہی ان کا سرمایۂ زندگی تھی۔ اسی کے لیے انھوں نے اپنے عافیت وسکون، اپنی صحت وتوانائی، رعنائیِ شباب، عزمِ جواں، خونِ تازہ، تفِ نالہ، جوشِ نوا، اندیشۂ خرد اور بے باکیِ جنوں: سبھی کچھ بے دریغ اور فیاضی سے صرف کیا تھا۔

اب غمِ دو جہاں بھی راحت ہے
اے غمِ عاشقی ! جزاک اللہ

سنت اللہ یہ ہے کہ یہ کارخانۂ عالم کسی کی رفت و بود سے متاثر نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو فخر کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وصال سے ہوناتھا، تو پھران کی امت کے بڑے سے بڑے انسان کی موت وحیات سے رفتارِ زندگی میں کوئی فرق کیوں آنے لگا؟۔

غالب نے اپنے متعلق کہاتھا:

غالبؔ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

لہٰذا کارہائے حیات میں نشیب وفراز چاہے آئے؛ لیکن کام کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہتا ہے اور ایک ''سردار'' کے اٹھ جانے پر دوسرا ''سردار'' اس کی جگہ لے لیتا ہے اور اپنے پیش رو کے قول وفعل کی تکمیل، یا اس میں اضافے اور اپنی توفیق سے بعض دفعہ اس میں نئے شگوفے بھی کھلاتا ہے:

إِذَا خَـلَا مِنَّا سَيِّـدٌ قَامَ سَيِّدٌ
قَؤُوْلٌ لِمَا قَالَ الكِرَامُ فَعُوْلٌ(۵۳)

لیکن ایک ایسا انسان، جو اپنے جنوں کی کافرادائیوں اور جرأتِ باغیانہ سے (جگر کے الفاظ میں) ''بدل دے مقدر، پلٹ دے زمانہ'' کا مصداق

(۵۳) جب ہمارا کوئی سربراہ گزر جاتا ہے، تو ہم میں سے کوئی دوسرا سربراہ اس کی جگہ لے لیتا ہے، جو ہمارے نیک خصلت پیش رو سرداروں کے قول وفعل کی سختی سے پابندی کرتا ہے۔

رہا ہو، اس کی یاد، دلوں سے ہزار کوشش کے باجود، محو نہیں ہوتی ـــــــ کہ بہ قول علامہ حالی:

ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

مولاناؒ نے جس میدان میں قدم رکھا، بہت جلد اس میں اپنی انفرادیت منوالی، کہ اُن کی روشن دماغی اُس میں ایک ایسی نئی طرح ڈال دیتی کہ لوگ عش عش کرنے لگتے۔ ان کی فکرِ رسا کی تابانی سے کہنہ سال گوشوں پر بھی ایک نئی آب تاب پیدا ہو جاتی۔ پھر اُن کے شوقِ سفر، ذوقِ جستجو اور حوصلۂ عمل کا کاروانِ تازہ دم، ہر وقت محوِ سفر؛ بل کہ آمادۂ صحرا نوردی رہتا اور اُن کا ذہنِ رفعت آشنا، کہنا چاہیے کہ اُنھیں اِس جہانِ مرغ و ماہی کے کسی بھی تنگ نائے سے گزر کر، صید افگنیِ کواکب پر آمادہ کرتا رہتا۔ نیز مقصد کی حرارت، عزائم کی ہلچل اور جنونِ ارجمند کی فسوں کاریِ پیہم، بعض دفعہ صدائے جرس اور شورِ کارواں کا شرمندۂ احسان ہونے سے انھیں بے نیاز کر دیتی، کہ وہ اپنی سبک خرامی کے طفیل، منزل تک پیش قدمی کر کے سب سے پہلے رحلِ اقامت اتار لینے کی سعادت حاصل کر لیتے۔

میرے نام حضرت مولاناؒ کے کچھ اور خطوط

گذشتہ صفحات میں حضرت مولاناؒ کے میرے نام متعدد مکتوبات ناظرینِ کرام کے ملاحظے سے گزرے ہوں گے۔ افسوس ہے کہ سات آٹھ

گرامی نامے، جن میں متعدد عربی زبان میں بھی تھے اور جو انھوں نے مجھے میرے گھر کے پتے پر، دارالعلوم میں میری طالب علمی کے زمانے میں لکھے تھے، سالِ گذشتہ کمروں کی صفائی کے دوران، حفاظتِ مزید کی خاطر، کہیں رکھ دیے گئے، جو تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں ملے۔ ذیل کے خطوط انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریس کے عرصے میں وقتاً فوقتاً مجھے لکھے، جن میں سے اکثر میرے عریضوں کے جواب میں ہیں، ایک آدھ مکتوب دارالعلوم میں میرے عہدِ تدریس کے اولین مہینوں میں، بیرونِ ملک کے میرے اسفار کے دوران، انھوں نے مجھے ارسال فرمائے۔

جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے، جب انھوں نے ایک پندرہ روزہ جریدہ ''الکفاح'' نکالنا شروع کیا، تو اپنے تیار کردہ عربی کا ذوق رکھنے والے بعض نو آموز فضلائے دیو بند کو اپنے ساتھ کرلیا تھا۔ ''الکفاح'' کی تقریباً پوری زندگی میں انھوں نے ایسا ہی کیا؛ تاکہ نوجوانوں کو عربی لکھنے کی اچھی مشق ہو جائے اور عربی رسالے میں اپنی نگارشات کو چھپا ہوا دیکھ کے، ان کا حوصلہ بلند ہو اور آئندہ دین وملت کی کما حقہ خدمت کے معیار کے مطابق، صلاحیت بہم پہنچا سکیں۔

لیکن بعض دفعہ انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے، مجھ ایسے شاگردوں کو بھی جریدے کے صفحات پر نظر آنے کا شرف بخشیں؛ چناں چہ ان کی خواہش پر ''بِکُلِّ صَرَاحۃ'' کے عنوان سے عرصے تک، یہ خاک سار مستقل کالم لکھتا رہا، پھر حضرتؒ کا ایک مرتبہ حکم ہوا کہ رمضان اور دیگر چھٹیوں کے

مواقع پر میں جز وقتی طور پر دیوبند آجایا کروں اور مضامین ومواد کی ترتیب و تیاری میں باقاعدہ مدد کروں، چناں چہ ۱۵/رجب ۱۳۹۴ھ کا لکھا ہوا الطاف نامہ حسبِ ذیل ہے:

''برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دو خط ملے اور دونوں مضامین بھی مل گئے، شریکِ اشاعت کردیے گئے۔ میں ایک عشرے کے لیے سورت (گجرات) کے سفر پر چلا گیا تھا، گذشتہ شمارہ میری نظرِ ثانی اور تصحیح کے بغیر طبع ہوگیا، اغلاط کا مجھے بھی افسوس ہے۔

آج کل مصروفیت، اسباق کی زیادہ ہے، بیس روز تک ان شاء اللہ فارغ ہوجاؤں گا۔ ''دعوۃ الحق'' کا مسودہ بھی معرضِ التواء میں ہے، فوری طور پر، اسے بھی قابلِ طباعت بنانا ہے۔

اخباروں کا کام یک سوئی چاہتا ہے اور وہ مجھے قطعاً میسر نہیں۔ آپ آجائیں تو پھر ان شاء اللہ سب کام ٹھیک ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ۔

کب تک آنے کا ارادہ ہے مطلع کریں۔''

والسلام، مخلص: وحید الزماں، ۱۵/رب ۱۳۹۴ھ

ایک دوسرے مکتوب میں اسی سلسلے میں تاکید فرماتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

''برادر عزیز! رعاک اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خط ملا، ''بِکُلِّ صَرَاحَۃٍ'' سابقہ زیادہ طویل تھا؛ اس لیے اس کی دو قسطیں کردی گئی تھیں۔ اس دفعہ ان

شاء اللہ ایک ہی قسط میں شائع کروں گا۔فخر الدین (۵۴) کی منظوری، مصر جانے کی آ گئی ہے۔ ابو العاص (۵۵) کا قیام شعبان کے اخیر تک ہے؛ اس لیے آخرِ شعبان میں آپ ضرور آ جائیں۔ پھر وہاں جانے کا ارادہ ہو تو پروگرام بنالیا جائے۔ یہاں کا کام شروع کر کے پھر آپ جا سکتے ہیں۔

اور سب حالات درست ہیں۔''

والسلام، مخلص: وحید الزماں، یکم شعبان ۱۳۹۴ھ

ایک ، مرتبہ لکھنؤ آنے کا پروگرام بنا، تو ہم لوگ بہت خوش ہوے کہ انھیں ندوہ میں بلائیں گے، طلبہ کو ان کے حوصلہ افزا خیالات اور ان کی برجستہ و شستہ تقریر سے، استفادے کا موقع ملے گا؛ لیکن ان کا پروگرام ضروری اسباب کی بنا پر ملتوی ہو گیا، میں نے اظہارِ حسرت کے لیے عریضہ

---

(۵۴) میرے کرم فرما مولانا فخر الدین قاسمی ازہری: حضرت الاستاذؒ کے اخص تلامذہ میں ہیں ''بم ہَور'' ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ہیں، اُس وقت ''الکفاح'' کی تحریری و انتظامی ذمے داریوں میں مولانا کا ہاتھ بٹاتے تھے، مولانا ہی کی شفقتوں کے طفیل ''جامع ازہر'' مصر سے بھی سیراب ہو آئے۔ اس وقت سال ہا سال سے ریاض، (سعودی عرب) میں ماشاء اللہ بال بچوں کے ساتھ مقیم ہیں، ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے شعبے میں اہم عہدے پر کام کر رہے ہیں اور کسی بڑی مسجد میں امام اور خطیب بھی ہیں۔

(۵۵) مولانا ابو العاص قاسمی وحیدی کا تعلق ''دت رنگوا''، ضلع بستی، (حال ضلع سدھارتھ نگر) سے ہے، جیسا کہ حضرت مولاناؒ کے خط سے مترشح ہے، حضرتؒ ان سے بھی اس وقت ''الکفاح'' میں کام لیتے تھے۔ باصلاحیت اور ذہین آدمی ہیں۔ صحابہ کے تعلق سے بدنام زمانہ جماعت کی طرف رجحان رکھنے کے سلسلے میں اُس وقت طلبہ میں مطعون تھے۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد، انھوں نے اپنی جماعت اہل حدیث کے کئی مدرسوں میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اس وقت وہ جماعت اہل حدیث کے بڑے اور مشہور علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنی جماعت کے ساتھ وفاداری کے باوجود، حضرت الاستاذؒ کے اُسی طرح قائل ہیں، جیسا کہ ایک اہل نظر شاگرد کو اپنے باکمال استاذ کا ہونا چاہیے، چناں چہ وحید الزماں کی طرف نسبت کر کے، اب تک ''وحیدی'' لکھتے ہیں۔ سنا ہے کہ بہ یک وقت کئی عدد رسالوں کے مدیر بھی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

لکھا، تو جواب عنایت ہوا کہ:

''برادر عزیز نور عالم صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خط مل گیا، حسبِ عادت جواب تاخیر سے دے رہا ہوں، لکھنؤ آنے کا پروگرام ملتوی ہو گیا اور آپ سے ملاقات کا بھی موقع نہ مل سکا۔ ''الکفاح'' آپ کے نام برابر بھیجا جا رہا ہے، نہ معلوم پہنچا کہ نہیں؟۔ اب ایک ماہ سے تعطل میں ہے۔ سنسر والے مضامین کے انگریزی ترجمے مانگتے ہیں اور ہم تیار نہیں ہیں، شاید ابھی کچھ اور بھی تاخیر ہو۔ میری طرف سے سب حضرات کو سلام پہنچا دیں۔ بہ شرطِ سہولت۔

یہاں سب خیریت ہے۔

والسلام، مخلص: وحیدالزماں، ۲۰ر۷/۱۳۹۴ھ

ضلع سہارن پور کے اپنے ایک خصوصی شاگرد، مولوی عبدالواجد کو، ان کی خواہش پر تعلیم کے لیے ندوہ بھیجا، تو مجھے مندرجہ ذیل عنایت نامے میں، ان کا خیال رکھنے کی تاکید فرمائی:

''برادرِ عزیز القدر مولانا نور عالم صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ بہ خیر و عافیت ہوں گے۔ حاملِ رقعہ عبدالواجد آپ کے یہاں برائے تعلیم حاضر ہو رہے ہیں۔ یہ اپنا ہی بچہ ہے، آپ اسے اپنا ہی سمجھیے۔ ماشاءاللہ پڑھنے کا شوق اور علم سے دل چسپی ہے، محنت کی عادت ہے۔ آپ کی توجہ رہے گی، تو ان شاءاللہ یہ نئے ماحول میں اپنی دل چسپیوں میں مزید اضافہ کر سکے گا اور اس کے ذریعے آپ کی

خیریت بھی معلوم ہوتی رہے گی۔

میں بفضلہٖ تعالیٰ بہ خیریت ہوں۔''

والسلام، مخلص: وحید الزماں، ۱۶؍شوال ۱۳۹۴ھ

حضرت مولاناؒ کی جواں سال صاحب زادی کا انتقال ہوا، تو عرصے تک اتنے غم زدہ رہے، کہ کسی کام میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ اس کی خبر طلبہ اور محبین کی زبانی شدہ شدہ مجھ تک ندوہ پہنچی، تو میں نے حضرتؒ کو ایک تعزیتی عریضہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھا، جس میں میں نے وہ جملہ لکھا، جو میں تعزیتی خطوط میں خصوصاً اہلِ تعلق کے نام ضرور دہرایا کرتا ہوں، کہ غم واندوہ کے ایسے مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی واُمّی کے وصال کا غم یاد کر لینا چاہیے، کہ اس سے غم غلط ہونے میں فوری مدد ملتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ تسکینِ خاطر کے لیے، اس سے زود اثر کوئی نسخہ نہیں؛ کہ حق تعالیٰ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری انسانیت کے لیے سراپا رحمت، اس کے ہر درد کی دوا اور اس کے تمام دکھوں کا مداوا بنا کر بھیجا تھا۔

اس کے جواب میں ۳۰؍ربیع الاول ۱۳۹۸ھ کو مندرجہ ذیل والا نامہ سے سرفراز فرمایا:

''برادرِ عزیز! زیدت مودتکم ومعارفکم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا تعزیتی خط مل گیا، اس کے ہم دردانہ اور مخلصانہ کلمات نے کافی تسلی بخشی اور قلب کو سکون حاصل ہوا۔ خدا کے فیصلے اور منشا پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ اور کیا کیا جا سکتا

ہے؟ وہی ہر طرح کی نعمتیں اور آسانیاں بھی عطا کرتا ہے اور کبھی کبھی بندوں کی آزمائش کے لیے اور عبرت کے لیے ایسے حوادث سے دوچار کر دیتا ہے، انا للّٰہِ وَ انا الیہ رٰجعُون .

متوفاۃ اپنی عمر کے پندرہ سال پورے کر چکی تھی، اتفاق سے جملہ افرادِ خانہ کے بالمقابل بلند حوصلہ، صاف گو اور ہنس مکھ تھی، گھر میں رونق اسی سے تھی؛ مگر خدا کو منظور یہی تھا، ٹھیک ہے اس میں یقیناً کوئی بڑی حکمت ہوگی اور ہمارے لیے اسی میں نفع ہوگا۔

اس کی والدہ پر غیر معمولی اثر ہے۔ رنج اور قلبی اذیت ایک فطری امر ہے، اس پر تو غالباً مؤاخذہ بھی نہیں، بس آپ جیسے مخلصین دعائے صبر کرتے رہیں۔

جواب میں کافی تاخیر ہوگئی، خطوط بہ کثرت آرہے ہیں، اِدھر حال تک مہمان داری ہوتی رہی، طبیعت ابھی تک کسی کام میں نہیں لگ رہی تھی، بہ ہر حال اب سب ہی کام شروع کر دیے ہیں۔

عبد الواجد کی زبانی اور اس کے خطوط سے آپ کی، اس کے ساتھ ہم دردیوں کا علم ہوتا رہا۔ یہ اپنا ہی بچہ ہے اور ما شاء اللہ باصلاحیت بھی ہے اور سعادت مند بھی، آپ کے ساتھ اس کا ربط مستحکم ہی رہنا چاہیے۔ بقیہ حالات ٹھیک ہیں۔''

والسلام، مخلص: وحید الزماں، ۳۰؍ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

ندوہ کی زندگی میں، دار العلوم اور حضرت الاستاذؒ، دونوں کا وہاں کی

مجالس اور درس گاہوں میں، میں نے اس قدر تذکرہ کیا کہ بعض طلبہ، ندوہ سے دارالعلوم دیکھنے آئے، تو وہ حضرت مولاناؒ کو کسی سے پوچھے بغیر پہچان گئے، کہ میں نے ان کی رفتار و گفتار اور کردار کی جو شناخت بتائی تھی، وہ ان کے علاوہ کسی اور پر منطبق نہ ہوتی تھی۔ مولاناؒ نے اپنے کئی ایک خط میں اپنے ساتھ ناچیز کے عقیدت و تعلق کو سراہا اور بہت دعائیں دیں۔ ان خطوط میں سے ایک مکتوب ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:-

''عزیزِ محترم مولانا نور عالم صاحب! نوّرکم اللہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ واردین، خصوصا عزیزم عبدالواجد سے آپ کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں تک اس بے وفا کے ساتھ آپ کی غایت درجہ محبت و تعلق کا معاملہ ہے، تو وہ ظاہر و باہر ہے اور میں اسے خوب جانتا ہوں، پھر ان سب سے اس تعلق کی جب تفصیل معلوم ہوتی ہے، تو وہ میرے لیے تاکید و تکرار کے درجے میں ہوتی ہے۔

میرے لیے یہ مخلصانہ تعلق ایک نظیر ہے، جسے میں بہ طور مثال پیش کرنے پر فخر کرتا ہوں اور خود نادم ہوتا ہوں کہ ایک طرف میرے ایک عزیز بھائی کا مجھ سے اس قدر گہرا تعلق ہے اور میں اس کا کوئی بھی حق ادا نہیں کرپاتا، بس خدا شاہد ہے کہ دل میں اس کی بڑی قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور زیادہ عزت و رفعت اور علم و دین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

ملاقات کو دل چاہتا ہے، امسال کسی وقت آنے کی ضرور کوشش کروں گا، اگر منظورِ خدا ہوا تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔ پرسانِ حال سے سلام مسنون عرض ہے۔ ماہِ ذی الحجہ میں اپنی لڑکی کی شادی کرنے کا ارادہ ہے، دعا کریں کہ اس فریضے سے بہ خیر وخوبی فراغت حاصل ہو۔ دیو بند ہی میں کرنی ہے۔

والسلام، مخلص: وحید الزماں، ۱۵ر شوال ۱۳۹۴ھ

ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ - اگست ۱۹۸۲ء میں دار العلوم میں تدریسی و ادارتی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد جمادی الاولی ۱۴۰۳ھ - فروری ۱۹۸۳ء میں، میرا پہلی مرتبہ عالمِ عربی کا سفر ہوا اور جامعۃ الملک سعود میں، عربی زبان وادب کی تدریس کے سلسلے کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ اس موقع سے کافی عرصے تک ریاض میں قیام رہا۔ بہت سے دیرینہ اور خلوص کیش و وفا شعار دوستوں سے عرصۂ دراز کے بعد بار بار ملنے اور ان کی کرم گستری سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا، جن میں سر فہرست برادرم مولانا عبد الباری شمس الحق قاسمی مظفر پوری[۵۶]، مولانا عبد السلام قاسمی میرٹھی[۵۷]،

(۵۶) مولانا عبد الباری قاسمی ازہری بن جناب شمس الحق صاحب: موضع ''تہائی مداری پور''، ضلع مظفر پور (بہار) کے باشندے ہیں۔ خوش خصال وخندہ جبیں ہیں، اپنے رفقا میں ہمیشہ محبوب رہے۔ ایامِ طالب علمی میں مجھ سے بے حد تعلق رکھتے تھے، پھر دار العلوم دیو بند میں میرے واسطے سے حضرت الاستاذ کی جناب میں باریاب ہوئے اور ان کے خصوصی الطاف سے بہرہ ور رہے۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد حضرتؒ ہی کی کوششوں سے، انھیں جامع ازہر قاہرہ جانے کا موقع ملا، جہاں انھوں نے اپنی صلاحیت دو بالا کی۔ اب عرصے سے بہ سلسلۂ ملازمت، ریاض میں اہل وعیال کے ساتھ مقیم ہیں۔ اس ناچیز کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کا پاس کرنے میں، تمام دوستوں کی بہ نسبت ان کو اولیت حاصل ہے۔ سعودی عرب کے اسفار میں ←

مولانا فخر الدین قاسمی اعظمی[۵۸] اور مولانا عبدالوحید قاسمی حیدر آبادی[۵۹]،

← ہمیشہ فیاضانہ میزبانی سے شرم سار کرتے ہیں۔ ''الداعی'' کو اپنی نگارشات سے ادھر کچھ سالوں سے پیہم نوازتے رہتے ہیں۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

(۵۷) مولانا عبدالسلام قاسمی میرٹھی بن جناب محمد الیاس خاں، کا آبائی وطن میرٹھ کا ایک قصبہ ''ویٹ'' ہے، جواب ضلع غازی آباد میں ہے؛ لیکن اب انھوں نے دہلی میں رہائش اختیار کرلی ہے۔ دارالعلوم میں، ''مقامات حریری'' میں میرے ہم درس تھے، حضرت الاستاذ سے انھیں بھی ہمیشہ والہانہ تعلق رہا۔ ایام طالب علمی میں بھی خوش لباسی و نستعلیقیت سے انھیں بڑی مناسبت تھی، جوان کی وجاہت جسمانی کو زیب دیتی تھی، بعد میں اس کے ساتھ وقار و تمکنت کا بھی اضافہ ہوگیا۔ خوش اخلاقی و ملنساری اور مہمان نوازی ان کا امتیازی وصف ہے۔ عرصۂ دراز سے ریاض میں بہ سلسلۂ ملازمت مع اہل خانہ مقیم ہیں، وہاں بھی مجمع الاحباب ہیں۔ قاسمی حضرات کے تو خاص طور پر نقطۂ اتصال و روابط بنے رہتے ہیں۔ اب ادھر کچھ عرصے سے علیل رہنے لگے ہیں، خدائے پاک انھیں صحت و عافیت کے ساتھ عمر درازی کی دولت سے نوازے۔

(اضافہ بہ وقت طبع سوم) کچھ تو صحت کی ناہمواری نیز مادر علمی کی خدمت کے جذبے کے تحت، ریاض سے واپس آکے، اواخر ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ/ اپریل ۱۹۹۶ء سے دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ کمپیوٹر کے ذمے دار کی حیثیت سے تادم تحریر مصروف کار ہیں۔ اللہ پاک ہمیشہ انھیں اپنی توفیق سے نوازتا رہے۔

(۵۸) مولانا فخر الدین صاحب کا تعارف حاشیہ نمبر ۵۴ پر گزر چکا ہے۔

(۵۹) مولانا عبدالوحید قاسمی حیدر آبادی۔ حیدر آباد کے رہنے والے ہیں، ہماری طالب علمی کے زمانے میں دارالعلوم میں ''النادی الادبی'' کے معتمد تھے۔ میں نے زمانہ طالب علمی میں کسی نوجوان کو علم و فضل، حلم و بردباری، سنجیدگی و خندہ روئی اور مومن کی شانِ انسیت کے ساتھ ساتھ، ایسا فہیم و ذہین کم ہی پایا ہوگا۔ ان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ بغیر مسکراہٹ کے کوئی لفظ اپنی زبان سے نکال سکیں، انھیں دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر انتقام لینے یا اپنے لیے انصاف طلب کرنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہے۔

دارالعلوم کے بعد انھوں نے ایک معتد بہ عرصہ دہلی میں گزارا۔ مجھے ان کے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں، بلی ماران میں ''احاطہ کالے صاحب'' کے مدخل پر واقع ایک مکتب میں جز وقتی تدریس کی ذمے داری لے رکھی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علمائے ہند کے مرکزی دفتر نئی دہلی کی مسجد (مسجد عبدالنبی) میں امامت کرتے تھے۔ یہ اس لیے تاکہ دہلی میں رکنے رکانے کی سہولت حاصل رہے اور ''جامعہ ملیہ'' میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے قدیم و جدید دونوں علوم میں ٹھوس بنیادوں پر محنت کی، ان کی صلاحیت جلد ہی اتنی آب دار ہوگئی کہ وہ جامعہ میں استاذ چن لیے گئے۔ پھر ان کا حوصلۂ طلب انھیں جامعۃ الملک سعود ریاض لے گیا، وہاں وہ جامعہ کے مرکز المعلومات (شعبۂ کمپیوٹر) کے اہم ترین ذمے دار بن گئے اور غالباً میرے ←

تھے۔ بعض قاسمی حضرات جو ماضی میں مولاناؒ سے قریب رہ چکے تھے؛ لیکن ریاض کے قیام کے دوران، ان میں نہ صرف یہ کہ مولاناؒ کے تئیں اور ان کے حوالے سے اپنے سلسلے میں، میں نے کوئی گرم جوشی محسوس نہیں کی؛ بل کہ خاصی سرد مہری کا احساس ہوا۔ میں نے حضرت الاستاذؒ کو وہاں کے قیام کی مفصل روداد لکھی اور اول الذکر حضرات کی گرم جوشیوں اور ثانی الذکر حضرات کی سرد مہریوں کا بھی سرسری سا تذکرہ مناسب سمجھا، تو حضرتؒ نے ۷/مئی ۱۹۸۳ء کو جواباً مندرجۂ ذیل شفقت نامہ ارسال فرمایا:

''عزیز مکرم مولانا نور عالم صاحب! نورکم اللہ و سلمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تفصیلی خط ملا، خیریت و حالات معلوم ہوئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان شاء اللہ اوائلِ شعبان میں ملاقات ہوگی۔

میں نے دارالعلوم میں جاکر اپنا کام شروع کردیا تھا، لیکن تدریس کا کام صفر ہی کے درجے میں رہا۔ پھر طبیعت خراب ہوگئی ہے۔

← متعارف قاسمی حضرات میں، ان ہی کی ماہانہ یافت سب سے معقول ہے — خاص بات یہ کہ سیم و زر اور آسائشِ حیات کی فراوانی نے، نہ تو ان کے ذوقِ علم و شوقِ طلب کو اب تک متاثر کیا ہے (چناں چہ وہ اب پھر کسی موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری میں مصروف ہیں) اور نہ ان کی خوئے انسانیت میں کوئی فرق آنے دیا ہے، جب کہ عالم عربی میں مقیم بیش تر ہندوستانیوں کا، ایک طرف وہاں کے موجودہ مخصوص طرز کے مادی حالات اور دوسری طرف اپنے غیر معمولی منافسانہ جذبات اور حرص و ہوس کی بڑھتی ہوئی نہ بجھنے والی پیاس کی بنا پر، یہی جوہر گراں مایہ، غالباً سب سے زیادہ متاثر ہوا کرتا ہے۔ اللھم ألھمہ الاستقامۃ۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولاناؒ کے معتقدین کی فہرست میں، ان کا نام بھی ہمیشہ اولیں سطروں میں رہا ہے۔ دیگر رفقا کی طرح یہ بھی ریاض میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔

امتحاناتِ سالانہ کا ناظم بھی مجھ ہی کو بنا دیا گیا ہے، اس کی تیاری کر کے دہلی بہ غرض علاج آ گیا تھا، یہاں ٹیسٹ کرایا، تو کوئی مرض نہیں معلوم ہوا، شکر بھی کنٹرول میں ہے، ادھر تکلیف عجیب قسم کی ہے، کسی کام کا نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ یہ سحر ہے اب اس کا علاج کروا رہا ہوں۔ ۱۱؍مئی کو دو چار روز کے لیے دیوبند جاؤں گا، پھر ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے دہلی آنا ہے اور شاید ابھی بہ دستور اسی طرح آمد و رفت رہے گی۔

''الداعی'' ماشاء اللہ شائع ہو رہا ہے۔ عتیق اللہ[۶۰] دل چسپی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ بھال کا موقع نہیں ملتا، سرسری طور پر دیکھ لیتا ہوں۔

بقیہ سب حالات بہ دستور ہیں۔ قاسمی برادری کے بعض افراد کے طرز عمل سے افسوس ہوا، وفا اور تعلق کی بہ حالی اور استواری ایک جوہر شرافت ہے، جو تمام افراد میں نہیں ہوتا، جن میں یہ جوہر ہوتا ہے، وہی مخلص اور شریف کہلاتے ہیں اور خدا کے فضل سے ایسے افراد کبھی

---

(۶۰) مولوی عتیق اللہ قاسمی ضلع سہرسہ (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں، تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ، ۱۴۰۳ھ میں، دارالعلوم میں، تکمیل ادب کی جماعت میں، میرے زیر تدریس رہے تھے۔ محنتی طالب علم تھے، عربی زبان کے حصول کا بہت شوق تھا۔ میں نے ریاض میں اپنی طویل اقامت کے دوران حضرت الاستاذؒ کے مشورے سے انھیں ''الداعی'' کی پروف ریڈنگ کے لیے مامور کر دیا تھا، خط میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ بعد میں حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی سابق ناظم سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و سابق ایڈیٹر رسالہ ''برہان'' (ترجمان ندوۃ المصنفین دہلی) رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء) کی نگرانی میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' دارالعلوم دیوبند میں بھی، انھوں نے تحریر و ترجمے کا کام کیا، ادھر کئی سالوں سے ''دمام'' (سعودی عرب) میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم ہیں۔

خائب وخاسر بھی نہیں ہوتے....‘‘

والسلام، مخلص: وحید الزماں، ۷؍مئی ۱۹۸۳ء

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

مولاناؒ لباس و پوشاک کے تعلق سے خاصے نستعلیق اور نفاست پسند تھے، ان کے نزدیک کسی بھی مسئلے میں بے قاعدگی نہایت ناپسندیدہ تھی، چاہے عام مجلس ہو یا بزمِ احباب، یا بزمِ مشورہ، یا بزمِ خورد ونوش۔ حد یہ ہے کہ فرش اور بستر کی سلوٹیں ان کو کسی آن گوارا نہ تھیں۔ طلبہ کا بے جا تکلف اور اساتذہ کے لیے نمائشی طور پر کھڑا ہونا، ان کو نہایت درجہ ناگوار تھا۔ وہ ہمیشہ فرماتے: تعظیم درحقیقت دل میں ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے کام کو نہایت قرینے سے انجام دیتے، ہر کام کو ڈھنگ سے انجام دینا ان کی فطرت اور مجبوری تھی، حتی کہ اسکیل کے ذریعے کاغذ پر لکیر دینے کا طریقہ بھی، ہم لوگ ان سے سیکھا کرتے اور یہ بھی کہ چائے کی پیالی تھوڑے سے پانی سے اس کی کم یابی کی صورت میں، کس طرح بہت عمدہ طریقے سے دُھلی جاسکتی ہے۔ کمرے میں جھاڑو کس طرح دینی چاہیے، اس کی اچھی طرح صفائی کس طرح ممکن ہے، اس کے سامان کس طرح مرتب کیے جاسکتے ہیں؟۔

مولاناؒ کا کمرہ، جس میں ان کی رہائش ہوتی یا مہمانوں سے ملتے، یا لکھنے پڑھنے کے لیے مخصوص ہوتا، اس درجہ مرتب، منظّم اور ٹھکانے کا ہوتا کہ ہر آنے جانے والا، خصوصاً نووارد، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ کسی بڑے

خرچ سے اور گراں بہا اسباب و تکلّفات سے کمرے کو سجا کر اس کا حسن دوبالا نہ کرتے ؛ بل کہ کمرے میں ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر اس قرینے سے چنی ہوتی، کہ معمولی چیز بھی غیر معمولی طور پر بھلی لگتی اور نشست گاہ کی مجموعی وضع، انسان کو دعوتِ نظارہ دیتی رہتی۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ماحول میں عموماً میز کرسی اور صوفے وغیرہ کے استعمال، کا رواج نہیں ؛ اس لیے رہائشی کمرہ ہو یا دیوان خانہ Drawing Room نشست فرش پر ہی ہوا کرتی ہے۔ فرش پر عموماً ٹاٹ یا اس جیسی کوئی چیز ڈال دی جاتی ہے، اس پر ہلکا گدا، یا دری اور اس کے اوپر چاندنی یا رنگین میل خوری چادر بچھا دی جاتی ہے اور حسبِ استطاعت متعدد تکیے اور گاؤ تکیے سے، ملاقاتی کمرے کو سجا دیا جاتا ہے۔

مولاناؒ کے ہاں مذکورہ اسباب کو میں نے، جس سلیقے سے ہمیشہ چنا ہوا پایا، خواہ یک بارگی اور پیشگی اطلاع کے بغیر جانا ہوا ہو، یاد نہیں آتا کہ اس کی مثال میں نے کہیں اور دیکھی ہو۔ چاندنی پر کسی زاویے میں کوئی شکن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی، وہ چاندنی بچھاتے وقت شکنوں کو دونوں ہتھیلیوں کے ذریعے چاندنی پر طولاً و عرضاً سہلا کر درست کرتے اور فرماتے کہ فرش کی شکنیں اس کے بغیر مکمل طور پر دور نہیں ہوتیں اور چاندنی، دری یا گدے سے صحیح طور پر نہیں چپکتی؛ لہٰذا برقی پنکھے کی ہوا اور انسانی قدموں سے، اس پر لہریں نمودار ہو جاتی ہیں۔

ملاقاتیوں اور مہمانوں سے مولاناؒ نہایت باادب طریقے سے پیش

آتے۔ وہ تکیے اور گاؤ تکیے مہمانوں کو پیش کر دیتے، بہ اصرار انھیں مسند نشیں بنا دیتے اور خود کسی کونے میں بغیر ٹیک کے بیٹھ جاتے۔ ہم ایسے خُردوں کو اس سے بڑی الجھن ہوتی؛ لیکن وہ کسی طرح اس کے لیے تیار نہ ہوتے کہ مہمانوں کے ساتھ خود بھی تکیہ لگا کر بیٹھ جائیں، اگر مہمان اس کے لیے اصرار کرتے، تو فرماتے دیکھیے! یہ میرا گھر ہے، یہاں میں کسی طرح بھی رہ سکتا ہوں، آپ مہمان ہیں؛ اس لیے آپ کے لیے یہی وضعِ نشست موزوں ہے۔

ہم ایسے ''بدویوں'' کے لیے سب سے بڑا امتحان، ان کی مجلس میں چائے نوش کرنا ہوتا، اس لیے کہ ان کے ہاں چائے نوشی میں ہونٹ سے چسکی لینے کی آواز کان لگانے کے باوجود بھی، نہیں سنی جاسکتی تھی اور ہم لوگ اس کے کچھ ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ بلا آواز، چائے کے گھونٹ کو ہونٹ اور زبان کی راہ سے، براہِ راست حلق میں اتارنے کی شکل میں، سارے منھ کو آبلہ زدہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے کوشش اور ان کی ہر ادا کی نقل اتارنے کے جذبے کے باوجود، میں اس شائستہ ادا کو اپنانے کی سعادت سے ہم کنار نہ ہو سکا۔

اس سے زیادہ آزمائش خورد و نوش کے دستر خوان پر ہوتی، کہ ان کے ہاں منھ میں نوالہ ڈالنے کے لیے منھ کو وا کرنے اور نوالے کی موزوں مقدار لینے میں، ایسا نازک انسانی اصول کار فرما ہوتا اور نوالے کو چباتے وقت منھ سے کسی طرح کی آواز نہ آنے دینے اور جبڑوں کو بے ہنگم طریقے سے گردش دینے سے محتاط رہنے کے، ایسے زریں قاعدوں پر عمل ہوتا، کہ انسان اور بہائم کے مابین گہرے فرق کا بہ خوبی ادراک ان کے دستر خوان پر ضرور ہو جاتا۔

دسترخوان چننے کے لیے ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ چاندنی پر ایک اور چھوٹی چادر بچھادی جاتی اور اس پر دسترخوان۔ فرماتے کہ تمام تر احتیاط کے باوجود کھانے کے ذرات، دسترخوان کے دائرے کے باہر ضرور گر جاتے ہیں اور ذرا سی بے احتیاطی سے فرش کے خراب ہو جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے؛ اس لیے اگر ایک اور نسبتاً چھوٹی چادر بچھادی جائے، تو یہ سب کچھ اسی پر ہوتا ہے اور اس کو دھونا آسان ہوتا ہے، جب کہ فرش کی بڑی سی چادر کی صفائی کا عمل دشوار گزار ہوتا ہے۔ ان کے دسترخوان پر پلیٹیں، چمچے، ڈونگے اور کٹورے وغیرہ پانی سے بھیگے ہوئے قطعاً نہ ہوتے، فرماتے کہ پانی لگے ہوئے برتن سے کراہت ہوتی ہے؛ اس لیے اسے صاف کپڑوں سے پونچھ کرلانا چاہیے، یا دھوپ میں سوکھا ہوا ہونا چاہیے۔

چائے دانی، کپ، چمچے، چینی دانی اور دودھ دانی وغیرہ کی صفائی دیدنی ہوتی۔ ہم ایسے لوگوں نے، جو پورب کے ناقابلِ تصور پھوہڑ پن کے نمونے والے، دیہات سے دارالعلوم آئے تھے، محض چائے بھی اچھی اور صاف کیوں پی ہوگی، چہ جائے کہ ابلی ہوئی اور دم کی چائے کے لطیف فرق کا شعور ہوتا اور ایک پتی سے دوسری پتی کیوں کر زیادہ نفیس، گراں قدر اور فرحت بخش ہوتی ہے، جس کا ایک گھونٹ مکمل مضمون کی آمد، پورے گھنٹے درس دینے یا دراز نفس تقریر کرنے اور بعض دفعہ کسی گہرے غم کے ازالے میں کس درجہ مددگار رہا کرتا ہے، اس کا شعور کیوں کر ہوسکتا تھا۔ مولاناؒ فرماتے کہ اچھی چائے کی جاں فزا خوش بو، پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی ناک کی راہ

سے مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے، جب کہ اچھی سے اچھی پتی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پڑ کے، پانی کو مناسب وقت تک جوش دینے یا نہ دینے، چائے دانی کو گرم پانی سے قرینے سے دھونے یا نہ دھونے اور چمچیوں اور پیالیوں کو صحیح طور پر گرم پانی سے گزارنے یا نہ گزارنے کی وجہ سے، بدل جایا کرتی ہے اور کسی بے شعور کے ہاتھ میں پڑ کر تو ساری خصوصیات ہی کھو بیٹھتی ہے؛ بل کہ بعض دفعہ خود اپنے ہاتھ سے بھی دم کرنے میں، بے احتیاطیوں کی بنا پر فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مجلس میں ملاقاتیوں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوتی، چائے دم ہی کی پلاتے، بعض دفعہ راقم الحروف نے، ان سے عرض کیا کہ حضرت! ایسے موقع پر ابلی ہوئی چائے میں شاید زیادہ آسانی ہو، تو فرمایا: ہمارے ہاں چائے کو، دال کی طرح ابالنے کے فن سے کوئی بھی واقف نہیں، سارے خرد و کلاں دم ہی کی چائے لیتے ہیں۔

مولاناؒ، وقت اور وعدے کے بھی بے حد پابند تھے، ہم لوگوں کو طالبِ علمی کے زمانے سے اُن کی پابندیِ اوقات کا خوب تجربہ تھا؛ لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں اشارہ کیا گیا، کہ اِدھر دو تین سالوں کے دوران اُن کی صحبت میں، مغربی یوپی کے کئی ایک سفر کیے گئے۔ سفر سے ایک دو روز قبل ہی دیوبند سے بہ ذریعۂ کار، روانگی کا وقت، منزل پر قیام کی مدت اور واپسی کی میعاد طے ہو جاتی، کبھی ایسا نہ ہوا کہ طے شدہ اوقات کی پابندی نہ کی گئی ہو۔ ایک روز ہم لوگوں کو مرزا پور، رائے پور اور سہارن پور کے سفر پر جانا تھا، وقت صبح سات بجے کا طے تھا، موسم جولائی کا آخر تھا، اتفاق سے رات ہی سے ترشح شروع ہو گیا

اور صبح کو موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ میں نے سوچا کہ یقیناً حضرتؒ آج تو سفر نہیں کریں گے؛ لیکن بارش کی شدت کی وجہ سے کسی کو بھیج کر، ان کا عندیہ معلوم کرنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ میں صبح کی چائے لینے کے بعد سفر کی مکمل تیاری کے ساتھ، یہی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ان کا فرستادہ آیا اور ان کا یہ پیغام لایا کہ حضرت نے فرمایا ہے کہ سفر حسبِ معمول ہوگا، البتہ روانگی کے وقت میں آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوگی؛ اس لیے آپ ٹھیک ساڑھے سات بجے مولانا کے مکان پر پہنچ جائیں۔ اِس نئے مقرر کردہ وقت سے دس منٹ پہلے، میں چھتری لے کے گھر سے نکل ہی رہا تھا، کہ اسی زور کی بارش میں، پھر اُسی قاصد نے آ کر کہا کہ آپ یہیں رہیں، مولانا نے فرمایا ہے کہ اب میں گاڑی لے کر خود یہیں آ رہا ہوں، تاکہ آپ کو اس تیز بارش میں پیدل چلنا نہ پڑے۔ اِس ایک واقعے سے پابندیِ وقت کے ساتھ ساتھ، ان کی بلند انسانی صفت اور ہر ایک کی تکلیف وراحت کا خیال رکھنے میں، غیر معمولی باریک بینی سے، اُن کے کام لینے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سفر کے دوران گاڑی میں بیٹھنے میں، ہماری طرف سے لاشعوری طور پر صادر شدہ، ذرا سا تکلف کا بھی اُنھیں احساس ہوتا، تو اصرار کرتے کہ آپ کھل کر بیٹھیے، آرام سے بیٹھیے اور اپنی نشست کے دائرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے کہ دیکھیے! مجھے تو صرف اتنی سی جگہ کافی ہے۔ ان کے برادران نے بتایا کہ زندگی کے آخری لمحوں تک کسی بھی اہلِ تعلق کے آرام وراحت کا حسبِ سابق خیال کرتے اور اپنے اہل خانہ کو اس سلسلے میں بستر مرگ پر بھی تاکید فرماتے رہے، حتی کہ ڈرائیور کے متعلق بھی یہ

ہدایت دیتے رہے کہ دیکھو! یہ دن میں بہت تھک جایا کرتے ہیں؛ اس لیے عشا بعد، فوراً ان کے کھانے کا انتظام کیا جائے، تاکہ جلد سو سکیں۔

مولاناؒ ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنے کے عادی تھے، یہاں تک کہ موم بتی اور دیا سلائی کو بھی؛ چناں چہ وہ اندھیرے میں بھی انھیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ ان کے روزانہ کے چھوٹے بڑے مصارف ریکارڈ رہتے، یہاں تک کہ وہ پانچ نئے پیسے بھی، جو انھوں نے اپنے خاندان کے کسی بچے کو دیے ہوئے ہوں اور اس نے پڑوس کی دوکان سے "چیز" خریدی ہو۔

آدابِ مجلس کی رعایت میں بے نظیر تھے، ادبی و ثقافتی یا انتظامی مجلسوں میں زیرِ غور مسائل کے تمام پہلوؤں اور گوشوں تک ان کا ذہن جس سرعت سے منتقل ہو جاتا تھا، اس کی مثال شاید و باید ہی پیش کی جاسکتی ہے۔ وہ مجلسوں میں قوتِ دلائل، حسنِ گفتار اور منطقیانہ و مربوط گفتگو سے چھا جاتے تھے۔ ان کی مدلل گفتگو کا جواب، بعض دفعہ اچھے اچھوں سے نہیں بن پڑتا تھا۔ نوجوانوں کو اپنے گفتار و کردار سے اپنے اشارے پر چلانے والا ایسا معلم، میں نے اپنی زندگی میں کیوں دیکھا ہوگا؟ ان کی صرف ایک تقریر بعض دفعہ طلبہ میں گویا "طارق بن زیاد" کی افواج کا سا اعتماد اور "خالد بن ولید" کی تلوار کی سی قوتِ عمل جگا دینے کے لیے کافی ہوا کرتی تھی۔ میں نے دارالعلوم میں یا کسی اور مدرسے اور تعلیم کدے میں، طلبہ کی نہ صرف عقل و خرد؛ بل کہ ان کے جذبات و خیالات پر، اپنی بے نظیر ساحرانہ شخصیت اور لاثانی قادر الکلامی کے ذریعے، اس درجہ گرفت رکھنے والا اور اپنے افکار و

خیالات سے ہم آہنگ بنا لینے والا، کوئی استاذ دیکھا نہ سنا۔

وہ طلبہ کے معاملات میں سختی و نرمی کو، اپنی اپنی جگہ، صحیح وقت پر اور صحیح تناسب کے ساتھ، بروئے کار لانے میں طاق تھے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت ان کی خصلت تھی۔ تمام شعبہ ہائے زندگی میں سلیقہ و انتظام سے الفت اور بد نظمی سے نفرت کرنے والا، ان کے ایسا دوسرا کیوں ہونے لگا(۶۱) تقریر و محاضرات میں قادر الکلام ایسے، کہ جیسے پہاڑوں سے آبشار گر رہا ہو۔ وہ ہمیشہ تیز چلتے، تیز کام کرتے اور تھوڑے وقتوں میں بہت سارے نتائج بروئے کار لانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ خود اعتمادی ان کا سب سے کارگر ہتھیار تھی اور تعجب خیز حد تک انھیں اپنے دست و بازو پر بھروسہ تھا۔ ان کا زرخیز ذہن ہمیشہ سال خوردہ پروگراموں کو مسمار کرتا رہتا اور ہر آن نئے نئے پروگرام وضع کرتا۔ زندگی کے کسی پہلو میں لگے بندھے طرزِ کہن پر، تادیر گامزن رہنا، ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ اپنی ہنرمندی سے صرف

---

(۶۱) میں جب بھی کسی پڑھے لکھے آدمی کو بدسلیقہ دیکھتا ہوں، تو فاضل دارالعلوم ہونے کی صورت میں اور مولانا کے عہدِ وابستگیِ دارالعلوم یا رسمی اختتامِ وابستگی کے بعد، ان کی حیات میں اور دیوبند ہی میں ان کی بود و باش کے باوصف، دارالعلوم میں زیر تعلیم رہنے کے دوران، ان سے سلیقۂ زندگی کا سبق سیکھنے سے، اس کے محروم رہ جانے کا بے حد ملال ہوتا ہے اور کسی اور جگہ کے کسی بے ہنگم فاضل کو دیکھ کر دل دکھتا ہے کہ دیوبند سے فیض پانے اور مولانا سے فیضانِ شعور کے حصول کی توفیق سے یہ کیوں کر محروم رہ گیا؟!۔ بدسلیقگی غالباً کسی تعلیم یافتہ انسان کا سب سے بڑا عیب ہے اور بہت سے عیوب کا سرچشمہ، کہ اس کی وجہ سے وہ بلا ارادہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ، ان گنت ایذا رسانیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعرِ اسلام علامہ اقبال کے متعین کردہ چار عناصرِ مسلمانی (قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت) میں ایک عنصر ''سلیقہ مندی'' کے اضافے کے بعد، غالباً پانچوں عناصر سے مرکب مسلمان، مسلمانِ کامل بن کر خدا اور خلقِ خدا، دونوں کی نگاہوں میں سرخ رو ہو جاتا ہے۔ واللّٰہ اعلم بالصواب.

چند لمحوں میں، مخاطب کے دل میں گھر کر لیتے۔ وہ بہ یک وقت انسان ساز بھی تھے اور تاریخ ساز بھی، انھوں نے اپنی تقدیر اپنے قلم اور اپنی روشنائی سے لکھی تھی۔ وہ کسی بزم میں گفتگو کرتے یا محض شرکت، یا کلاس میں درس دیتے، یا مجمع میں تقریر کرتے، تو ان کے چہرے پر ایک وقار اور تمکنت ہوتی۔ وہ کسی مجلس میں بار بار پہلو نہیں بدلتے تھے۔ کسی پڑھے لکھے یا زیر تعلیم، طالبِ علم کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر تعلیماً اور تادیباً، ضرور ٹوکتے، کہ وہ مدرسوں کے ماحول میں پڑھے لکھے طبقے کو، اُس کی تہذیب کے معیارِ مطلوب پر اتارنے کی تحریک کے سب سے بڑے نقیب تھے۔

منحنی جسم، کتابی چہرہ، کشادہ جبیں، قدرے کشادہ جسم، کشیدہ قامت، گندمی رنگ مائل بہ سفیدی، آنکھوں سے ذہانت وعبقریت کے آثار نمایاں، چھریرا بدن، تیر کی طرح مستقیم القد، رفتار میں وقار، گفتار میں اعتماد و تاثیر، حرارت وصلابت اور دل کشی وحلاوت۔ ایک نفیس سانچے میں ڈھلی ہوئی، ان کی پرکشش شخصیت کی مجموعی وضع پر، سفر یا حضر میں، جس اجنبی کی نگاہ پڑ جاتی، وہ صاحبِ شخصیت کے غیر معمولی ہونے کا یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور دارالعلوم میں خصوصاً اور دیوبند میں عموماً جدھر سے بھی گزرتے، مرکزِ نگاہ رہتے۔

مولاناؒ کے پس ماندگان

مولاناؒ کے پس ماندگان میں اہلیہ محترمہ (خدا صحت کے ساتھ عمر دراز

بخشے) کے علاوہ ایک صاحب زادی (جو ماشاء اللہ صاحبِ اولاد ہیں اور قصبہ دیوبند ہی کے ایک لائق فاضلِ دارالعلوم مولانا محمد رفعت قاسمی[۶۲] کو منسوب ہیں) اور تین صاحب زادے : مولانا بدرالزماں قاسمی[۶۳] ، مولوی

---

(۶۲) مولانا رفعت قاسمی بن جناب شمس الحق صاحب صدیقی: سپید رنگ، کشادہ پیشانی، میانہ قد، دہرا بدن، خندہ رو۔ دارالعلوم کے ایک ہونہار فاضل اور فقہِ اسلامی کے موضوع پر اہم اور مستند کتابوں کے مؤلف ہیں؛ جن میں مسائل امامت، مسائل تراویح، مسائل روزہ، مسائل اعتکاف، مسائل زکاۃ، مسائل نمازِ جمعہ، مسائل عیدین وقربانی، مسائل شب براءت وشب قدر، مسائل سفر، مسائل خفین، مسائل آداب وملاقات اور مجموعۂ خطبات ماثورہ وغیرہ، بہت متداول اور مقبول ہیں۔ سن ولادت ۱۳۷۲ھ-۱۹۵۲ء ہے۔ ۱۳۸۸ھ-۱۹۶۸ء میں حفظ قرآن پاک مکمل کیا۔ ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی، پھر ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء میں دارالعلوم سے تکمیل تفسیر کی سند بھی لی۔ ۷رصفر ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں دارالعلوم میں درجۂ حفظ کے مدرس مقرر ہوئے، اُس وقت سے تادمِ تحریر برسرِ ملازمت ہیں۔

(۶۳) مولانا بدرالزماں قاسمی: مولاناؒ کے سب سے بڑے صاحب زادے ہیں۔ سرخ وسپید رنگ، دراز قد، میانہ جسم، فراخ چشم، تاریخ پیدائش ۶ر۱ر۱۹۵۸ء=۱۴ر رجب ۱۳۷۷ھ ہے۔ بارہ۔ تیرہ سال کی عمر میں اپنے آبائی وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر کے ''مدرسہ عربیہ جامع مسجد'' میں حفظِ قرآن پاک کی سعادت حاصل کی۔ اسی مدرسے میں مولاناؒ نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور دوران تعلیم ہی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نجی طور پر ہائی اسکول پاس کیا۔ ۱۳۹۸ھ / ۱۹۷۸ء کے آغاز میں سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں، بہ حیثیت مترجم عربی ملازمت شروع کی اور ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ اسی دوران ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے۔ کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبرات سے کام یاب ہوئے۔ ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے، ماشاءاللہ اس وقت ایک لڑکی اور دو لڑکوں کے والد ہیں۔ ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء سے تاحال قطر میں ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ (اضافہ بہ وقتِ طبع سوم): ۲۹/ جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ = ۲۱ر ستمبر ۱۹۹۸ء سے نئی دہلی میں سعودی سفارت خانے میں سفیر کے قلمی سکریٹری کی حیثیت سے تادمِ تحریر رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ/ دسمبر ۲۰۰۰ء کام کررہے ہیں۔

خوش اخلاقی، سنجیدگی، وضع داری اور ستعلیقیت والد ماجدؒ سے ورثے میں ملی ہے۔ مولاناؒ کی شدید علالت کی خبر سن کر کئی ماہ کے لیے چھٹی لے کر قطر سے وطن آگئے تھے اور خوش قسمتی سے، مرض الموت میں ←

صدر الزماں قاسمی[۶۴]، اور مولوی حافظ قدر الزماں[۶۵] ہیں، نیز تین برادران: جناب مولانا عمید الزماں صاحب قاسمی[۶۶]، جناب مولانا ڈاکٹر معید الزماں

← دیگر برادران واعمام کے ساتھ، شب وروز خدمت کرنے کی سعادت سے سرفراز ہونے کا موقع ملا، جس کے لیے وہ اپنے خدا کے نہایت شکر گزار ہیں۔ خدا انھیں اور ان کے دیگر دونوں برادران کو صحت وعمر دراز سے نوازے اور عظیم والد کے نقشِ قدم پر چلنے اور ان کے اہلِ تعلق سے استقامت کے ساتھ، تعلق استوار رکھنے کی توفیق ارزانی کرے۔

(۶۴) مولوی صدر الزماں قاسمی: سادہ طبیعت، سفید رنگ، میانہ قد، دوہرا بدن۔ مولاناؒ کے منجھلے صاحبزادے ہیں۔ تاریخِ ولادت ۶ر شوال ۱۳۸۸ھ/ ۲۹ر نومبر ۱۹۶۸ء ہے۔ دارالعلوم ہی میں بچپن میں حفظِ قرآن پاک کیا۔ ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، اسی وقت سے دیوبند ہی میں ''دارالقلم'' کے نام سے ایک تجارتی ادارے کی سربراہی کررہے ہیں، جو ان کی شیریں گفتاری اور نرم خوئی کی وجہ سے ماشاءاللہ ایک کامیاب ادارہ ہے۔ دارالعلوم کے تمام ہی طلبہ اسٹیشنری کی ضروریات یہیں سے پوری کرتے ہیں؛ کہ اس سے بہتر سامان دیوبند کے بازار میں دست یاب نہیں۔ ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء میں ان کی شادی خانہ آبادی کی تقریب عمل میں آئی۔ اس وقت ماشاءاللہ ایک بچے کے والد ہیں۔ اللہ تعالیٰ باپ بیٹے دونوں کی عمر دراز کرے۔ (اضافہ بہ موقع طبع سوم) اب ''دارالقلم'' کے بہ جائے اپنا ''کتب خانہ حسینیہ'' دیکھ رہے ہیں، جو مولاناؒ نے ہی قائم کیا اور اس وقت یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔

(۶۵) مولوی حافظ قدر الزماں: چھریرا بدن، کھلتا ہوا سفید رنگ، کشادہ آنکھیں، کشادہ پیشانی، میانہ قد۔ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ تاریخ ولادت ۶ر ربیع الاول ۱۳۹۴ھ/ یکم مارچ ۱۹۷۴ء ہے۔ نہایت کم سنی میں دارالعلوم ہی میں حفظ قرآن پاک کا شرف حاصل کرلیا تھا۔ پھر دارالعلوم میں درجہ عربی میں داخل ہوئے اور درجہ ششم تک تعلیم حاصل کی؛ لیکن ادھر حضرت مولاناؒ کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر، چوں کہ ان کے ذاتی کتب خانے (کتب خانہ حسینیہ) کو جو اصلاً ان کے گھر کے لیے ذریعۂ معاش ہے، کوئی دیکھنے والا نہ تھا؛ اس لیے بڑھتی ہوئی ذمے داری کے پیش نظر تعلیم کا مزید سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ ماشاءاللہ سمجھ داری اور سلیقہ مندی میں ایک حد تک اپنے والد ماجدؒ کو پڑے ہیں۔ مولاناؒ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں گھریلو انتظامات کے سلسلے میں بڑی حد تک ان ہی سے خدمت لیتے تھے۔

(۶۶) مولانا عمید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی:

دراز قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ جبیں، چہرے پر سنجیدگی ومتانت، گفتگو میں وقار، اعتماد اور فہم و فراست آمیز ٹھہراؤ۔

←

صاحب قاسمیؒ (۶۷)، جناب فرید الزماں صاحب (۶۸) اور ایک ہمشیرہ ''فریدہ بیگم''

← ان کی ولادت ۱۹؍ مارچ ۱۹۴۰ء، (۸؍ربیع الاول ۱۳۵۹ھ) کو اپنے آبائی وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) کے دست و بازو کی حیثیت سے حضرت الاستاذؒ کے قیامِ دہلی کے زمانے میں ان سے (اپنے برادرِ اکبر حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ سے) عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں داخل ہوے جہاں ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کیے، اُسی زمانے میں شیخ ''مامون دمشقی'' (جو اپنی آخری زندگی میں حیدر آباد سے دہلی منتقل ہوگئے تھے) کی صحبت سے استفادے اور عربی زبان میں مزید استعداد بہم پہنچانے کا موقع ملا۔ ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء میں دار العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ دار العلوم کے ایامِ طالب علمی میں، دار العلوم میں جامع ازہر مصر کی طرف سے مبعوث شیخ محمود عبد الوہاب محمود سے عربی زبان میں مزید کمال حاصل کیا۔ شیخ سے استفادہ کرنے والی جماعت میں ان کے ہم سبق دار العلوم کے موجودہ موقر استاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری بھی تھے، جو دار العلوم کی نصابی تعلیم میں مولانا عمید صاحب سے آگے تھے۔ نیز دار العلوم کے استاذ حدیث مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری بھی دورۂ حدیث شریف کے سال، ان کے قریبی ساتھیوں اور دوستوں میں تھے۔

دار العلوم میں تحصیلِ علم کے دوران، طلبہ کی عربی انجمن کی طرف سے دار العلوم کی زندگی میں پہلی مرتبہ عربی میں مطبوعہ شکل میں شائع ہونے والے جریدے ''الیقظ'' کی ادارت کے لیے، عربی زبان میں ان کی امتیازی صلاحیت کی بنا پر، تمام طلبۂ دار العلوم کی نگاہِ انتخاب اُنھی پر پڑی، ان کے ہم سبق مولانا سید ارشد مدنی استاذ حدیث دار العلوم دیو بند، جریدے میں ان کے معاون تھے۔

۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں دار العلوم سے فراغت کے بعد کچھ مدت کے لیے دار العلوم کے شعبۂ تبلیغ سے وابستہ رہے۔ پھر جنوری ۱۹۶۴ء سے مارچ ۱۹۶۵ء کے عرصے میں دار العلوم ہی میں ''قرآن عظیم اکیڈمی'' میں مترجم و محقق کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ اکیڈمی بمبئی کے ایک صاحبِ خیر جناب عبد العظیم صاحب کی خواہش پر، ان کی حوصلہ مندانہ امداد سے، اُس وقت معرضِ وجود میں آئی تھی۔ اکیڈمی میں کام کے دوران انھوں نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (وفات ۴؍ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ/ ۱۶؍ مارچ ۱۸۸۰ء) کی تفسیر معوذتین کے بعض دقیق مباحث کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ ''تفسیر المعوذتین'' کے نام سے شائع ہوا اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی (متوفی ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) نے اپنے موقر رسالہ ''برہان'' (ترجمان ندوۃ المصنفین دہلی) میں کتاب پر اپنی گراں قدر تقریظ و تبصرے میں، ترجمے کی خوبی کی بہ طور خاص داد دی، نیز مولانا نانوتویؒ کی ایک اور کتاب کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا، جسے حضرت الاستاذؒ نے مختلف عناوین کے تحت متعدد رسالوں کی شکل میں شائع فرمایا۔ اپریل ۱۹۶۵ء ←

ہیں، جو مولاناؒ سے چھوٹی اور دیگر باحیات بھائیوں سے بڑی ہیں۔ کیرانہ ہی

← سے جولائی ۱۹۶۷ء کے دوران جمعیۃ علمائے ہند کے اُس وقت کے ناظمِ عمومی اور حال صدر حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب کے طلب وایما پر جمعیۃ کے ''شعبۂ عربی امور'' کے ذمے دار کی حیثیت سے کام کرتے رہے، ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں وہاں سے مستعفی ہوگئے۔ اُس کے بعد ایک عرصے تک حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی (متوفی ۳؍رمضان ۱۴۱۱ھ/ ۱۸؍فروری ۱۹۹۱ء) سابق جنرل سکریٹری مسلم پرسنل لاء بورڈ وامیر شریعت بہار واڑیسہ، کی خواہش پر ''جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر'' کے نمائندہ دہلی کی حیثیت سے ذمے داریاں انجام دیں۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں ''عرب لیگ مشن'' نئی دہلی کے ہفت روزہ بلیٹن ''اخبار العرب'' کی ذمے داری ان کو سپرد ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء/ ۱۳۹۱ھ میں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے شعبۂ عربی سے مترجم اور اناؤنسر کی حیثیت سے وابستہ ہوے، جہاں ایک عرصے تک کام کرتے رہے۔

مختلف سرگرمیوں اور مشاغل کے ساتھ ساتھ بہت سے مضامین ومقالات کے عربی میں ترجمے بھی کیے۔ دارالعلوم کی طالب علمی کے دوران ہی ''ثقافۃ الہند'' میں ان کا ترجمہ کردہ ایک عربی مضمون شائع ہوا، پھر مسلسل لکھتے اور ترجمہ کرتے رہے، ان کی علمی کاوشیں مختلف اوقات میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی تحصیل میں کوشاں رہے۔ چناں چہ ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں سیکنڈری پاس کیا اور ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء میں۔ بی۔ اے۔ انھوں نے دہلی کالج میں، جو بعد میں ذاکر حسین کالج کے نام سے مشہور ہوا، شام کی کلاسوں میں داخلہ لے کر باقاعدہ عصری اور انگریزی تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں دہلی یونیورسٹی سے عربی میں۔ ایم۔ اے۔ کیا ربیع الاول ۱۳۹۲ھ/ اپریل ۱۹۷۲ء سے، سعودی سفارت خانہ نئی دہلی سے، اس کے شعبۂ صحافت واطلاعات ونشریات'' کے ذمے دار کی حیثیت سے ہنوز وابستہ ہیں۔

(اضافہ بہ موقع طبع سوم): چند سال قبل علمی وتصنیفی کاموں کے لیے یک سو ہونے کے لیے، انھوں نے سفارت خانے سے قبل از وقت، سبک دوشی حاصل کرلی: چناں چہ سفیر سعودی عرب عزت مآب عبد الرحمن ناصر العوہلی صاحب کے اصرار کے باوجود جمعہ ۱۸؍ستمبر ۱۹۹۸ء مطابق ۲۶؍جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ کو آخری دن کام کرکے، ازخود ریٹائرمنٹ لے لیا۔

مولاناؒ کے علمی شاہ کار اور ان کی آخری یادگار ''القاموس الوحید'' کا انھوں نے بڑی عرق ریزی سے مراجعہ کیا اور اس پر سوصفحات سے زائد کا گراں قدر مقدمہ تحریر کیا، جس سے مولاناؒ کی اس زبردست علمی کاوش کی قدر وقیمت میں مزید اضافہ ہوا۔

وہ اپنے برادر اکبر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کے اس سلسلے میں بھی بے حد ممنون ہیں، کہ انھوں نے انھیں صرف عربی زبان ہی نہیں؛ بل کہ جہد مسلسل، اپنی ذمے داری کا حق ادا کرنے اور ←

← کسی بھی کام میں فنائیت کی حد تک اپنے کو لگا دینے کا قیمتی درس بھی دیا، جسے انھوں نے بہت اچھی طرح سمجھا، یاد کیا اور عملی دنیا میں اسے حرف حرف برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ان کے دو لڑکیاں تولد ہوئیں: ایک کی تاریخ پیدائش ار مئی ۱۹۷۷ء اور دوسری کی ۲۲ر اپریل ۱۹۸۶ء ہے۔ ماشاء اللہ دونوں لکھنے پڑھنے میں اپنی خاندانی روایات کی حامل ہیں۔ مولانا کی اہلیہ مشہور محدث مولانا عبد الحق صاحب دہلویؒ (متوفی ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۶ء) صاحبِ ''تفسیر حقانی'' و'عقائدالاسلام' کی پوتی کی صاحب زادی ہیں۔ ذاکرنگر نئی دہلی میں ''ماڈل اسلامک اسکول'' کے نام سے ایک پرائمری اسکول کی ہیڈ ماسٹر ہیں، جہاں مسلمان بچے بچیوں کو خالص دینی ماحول میں مثالی طور پر علم وفکر کے سانچے میں ڈھالنے کی کام یاب کوشش کے ذریعے اپنا ثواب اپنے رب سے پا رہی ہیں۔

(۶۷) مولانا ڈاکٹر معید الزماں صاحب قاسمی: گورا رنگ، چھریرا بدن، لمبا قد، معصوم سی صورت، سادہ طبیعت، نرم خو، شاید کبھی غصے نہیں ہوتے۔ تاریخ ولادت ۳۱ر جنوری ۱۹۴۶ء، مطابق ۲۶ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ ہے۔ اپنے بھائیوں میں چوتھے نمبر پہ ہیں۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں حفظ قرآن پاک کی سعادت حاصل کی۔ ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوے۔ اس کے بعد ہمدرد طبی کالج (جو ان کی تعلیم کے دوران بلی ماران دہلی ۶ میں واقع تھا) سے ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں طب کی تعلیم مکمل کی۔ ہمیشہ سے مجھے اپنے برادرِ اکبر مولاناؒ کی طرح سفید پوش اور نستعلیق نظر آئے اور کیوں نہ ایسا ہو کہ تمام بھائیوں پر مولاناؒ اور اپنے والد ماجد کی تربیت کی چھاپ ہے۔ حصولِ طب کے بعد ہی سے دیوبند میں مطب کررہے ہیں۔ ماشاء اللہ ان کی خوش اخلاقی، ہم دردی اور دستِ شفا کی وجہ سے خلقِ خدا کو خوب فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اللہ عمر دراز بخشے۔

(۶۸) جناب فریدالزماں صاحب:

دوہرا بدن، میانہ قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، خندہ جبیں، حلیم و بردبار اور ملنسار۔ اپنے برادران میں سب سے چھوٹے ہیں۔ ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء میں اپنے آبائی وطن ''کیرانہ''، ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء میں مدرسہ عربیہ جامع مسجد کیرانہ میں حفظِ قرآن پاک مکمل کیا۔ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ فارسی میں داخل ہوئے۔ جہاں ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء تک کے عرصے میں فارسی، اردو دینیات اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران جامع ازہر مصر کی طرف سے دارالعلوم میں مبعوث استاذ شیخ محمود عبدالوہاب (جو ایک خوش الحان اور مستند قاری بھی تھے) کے سامنے قرآن پاک کا دور کیا۔ ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء ہی میں دہلی جامعہ ملیہ میں ہائر سکنڈری اسکول میں درجہ نہم میں داخل ہوگئے اور وہاں کے تعلیمی سال ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء — ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء میں، بی۔ اے۔ کیا۔ ۱۳۹۵ھ مطابق ←

صاحب مظاہری(۶۹) کو منسوب ہیں اور ماشاء اللہ حیات ہیں۔ صوم وصلوۃ کی پابند، نیک سیرت، خوش اوقات، رحم دل اور اپنی خاندانی خصوصیات کی امین خاتون ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اعزہ واقربا ہیں، خدا ان سبھوں کو نظر بد سے بچائے اور مولاناؒ رحمۃ اللہ علیہ کے فکر وعمل میں انھیں، ان کا سچا جانشیں

← ۱۹۷۵ء اور ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۱ء کے دوران عراقی سفارت خانہ نئی دہلی میں پریس سیکشن میں عربی ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء سے تاحال کویت سفارت خانہ نئی دہلی میں ویزا سیکشن کے ذمے دار ہیں۔ ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں دارالعلوم کے اجلاسِ صد سالہ کے تاریخی اور مبارک موقع پر دیو بند ہی میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے، ان کی تقریب شادی میں خوش قسمتی سے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی پاکستانی بھی شریک ہوئے کہ وہ اُن کے سسرالی رشتہ داروں کے قریبی عزیز ہیں۔ ماشاء اللہ اس وقت صاحب اولاد ہیں سب سے بڑی اولاد لڑکی ہے، پھر لڑکا اور پھر لڑکی۔ اس وقت دہلی ذاکر نگر میں رہائش پذیر ہیں، جہاں انھوں نے اپنے برادر اوسط جناب مولانا عمید الزماں صاحب کی طرح بود و باش اختیار کر لی ہے۔ معاملہ فہمی، مہمان نوازی اور خدمتِ خلق کا جذبہ، انھیں وراثت میں ملا ہے۔

(۶۹) مولانا غیاث الحسن صاحب مظاہری:

سپید پوش، نستعلیق، مہذب وخوش مزاج، کتابی چہرہ مائل بہ بیضوی، سرخ وسپید رنگ، بڑی بڑی خوش نما آنکھیں۔

۲۰ر ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ مطابق ۴ر فروری ۱۹۳۶ء کو اپنے وطن ''کیرانہ''، ضلع مظفر نگر (یوپی) میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کچھ اپنے وطن میں اور کچھ ''شاملی''، ضلع مظفر نگر (یوپی) میں حاصل کی اور وہیں سے ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں حفظ قرآن پاک کی تکمیل کی۔ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء سے دہلی میں مستقل قیام ہے، جہاں مختلف دینی وثقافتی کاموں میں مشغول ہیں، ان کی خوش دلی، ذوق سخن اور ظرافت و شرافت کی وجہ سے، دہلی میں ان کا ایک اپنا حلقہ ہے۔ ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء سے تاحال ''ماہ نامہ دینی مدارس'' کے نام سے ایک موقر دینی وثقافتی اور دعوتی رسالے کے ذریعے ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے دینی قلعوں یعنی مدارس اسلامیہ کا تعارف اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ان کے کارناموں، ان کی ضرورتوں اور خدانہ خواستہ ان کی سرگرمیوں کے سرد پڑ جانے کی صورت میں، ہندی ملت اسلامیہ کے لیے دینی بدحالی کے، یقینی خطروں کا مسلمانوں کی نسل نو کو احساس دلا رہے ہیں۔ [افسوس کہ شب ۲۶ر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۳/۹/۱۹۹۵ء کو دہلی میں انتقال فرما گئے]۔

بنائے، کہ اب ہم سب لوگوں کی نگاہیں انھیں پر ٹکی ہوئی ہیں۔

مولانا کے برادران وفرزندان کے درمیان جو محبت وخلوص ہے اور ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں مکمل طور پر شریک رہنے، ایک دوسرے کے حالات سے ہر وقت واقف رہنے اور فرقِ مراتب کا لحاظ کرنے میں نہایت باریک بینی سے کام لینے کا جو جذبہ ہے، وہ میں نے کم ہی کسی شریف گھرانے میں دیکھا ہوگا۔

یہ اوصاف ان کے ہاں موروثی ہیں۔ لیکن مولانا کی ہمہ جہت عبقریت کی کرشمہ سازی نے، ان میں نمایاں نکھار پیدا کر دیا تھا۔ مولانا گھریلو زندگی میں بھی غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ نفاست پسندی، سلیقہ مندی، نظم و نسق، مہمان نوازی، پابندیِ اوقات، صفائیِ معاملات، خاندان کے ہر ہر فرد کی خبر گیری ونگہ داشت، ان کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کا ہمہ وقت خیال، بچوں کی معیاری تربیت اور تہذیب وشائستگی کے آداب کی پابندی کرانے وغیرہ، کے سلسلے میں بھی وہ طاق تھے۔ عموماً ''بڑے لوگ'' ان سارے اوصاف کے بہ یک وقت حامل نہیں ہوتے۔ کوئی کسی سمت میں منفرد اور کوئی کسی گوشے میں بے مثال ہوا کرتا ہے؛ بل کہ اکثر لوگوں کی اجتماعی زندگی، گھریلو زندگی سے مختلف ہوا کرتی ہے اور بعض دفعہ اول الذکر میں مہذب، مثقف اور نستعلیق ہوتے ہیں اور ثانی الذکر میں بے ہنگمی کا ناگفتہ بہ نمونہ؛ لیکن مولانا زندگی کے تمام شعبوں کی طرح گھریلو معاملات میں بھی، چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے؛ کہ اپنے موقع پر وہی ''بڑی بڑی باتیں'' بن جایا کرتی ہیں۔

مولاناؒ کے مذکورہ بالا اوصاف کی جلوہ گری تمام افرادِ خاندان میں نظر آتی ہے، ان کے کسی برادر یا فرزند یا کسی قریبی عزیز، جس پر ان کی زندگی کی چھاپ پڑی ہو، سے مل کر آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "ایں شراب ازاں ساغر است"

مولاناؒ کے بھائیوں کو مولاناؒ سے جو دلی محبت تھی اور جس طرح وہ لوگ، ان کے لیے ہمہ گیر اطاعت شعاری کے جذبے سے سرشار رہا کرتے تھے، مجھے یاد نہیں کہ یہ وصف اپنی گراں مایہ اور گہری کیفیات کے ساتھ کہیں اور میرے مشاہدے میں آیا ہو۔ مولاناؒ کے برادران، جو سب کے سب ان کے خُرد اور بڑی حد تک ان ہی کے مینائے تعلیم و تربیت کے قدح خوار اور ان کے احسان سے زیر بار ہیں، احترام و اکرام میں، ان کے ساتھ باپ کا سا برتاؤ کرتے اور نشست و برخاست، عام گفتگو اور تبادلۂ خیال تک میں، اُن کے ساتھ لاشعوری طور پر بھی حدِ ادب سے گزر جانے کی چوک سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

حرفِ آخر

دنیا، جائے فانی ہے اور مسافرانِ آخرت کی سرائے، جو آیا ہے، وہ جانے ہی کے لیے آیا ہے اور کچھ پتہ نہیں کس کو کب جانا پڑے؟، صرف سابق اور لاحق کا فرق ہے:

اجل کے ہاتھ، کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں، رقم کیا ہے؟

لیکن دیوبندی مکتبِ فکر کے مدرسوں سے متعلق نوجوانوں کی نسلِ نو کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے، حضرت مولاناؒ کی مثالی خدمات کے پیشِ نظر (جن کی ہلکی سی تصویر سطورِ بالا میں پیش کی گئی) اور اس سلسلے میں انھوں نے جو منفرد، اچھوتا اور کم وقت میں زیادہ کارآمد تعلیم وتربیت کا اسلوب وضع کیا، اور اُن کے، اُن اوصاف وکمالات کی بنا پر، جن میں وہ یقیناً یگانۂ روزگار تھے، نوجوانوں کی جو محبت وعقیدت اور گرویدگی وشیفتگی ان کے حصے میں آئی، اس کی مثال برصغیر کے مدرسوں کے کسی مدرس کے سلسلے میں، اس دورِ آخر میں نہیں پیش کی جاسکتی۔

اسی لیے ان کی وفات پر جس طرح میں نے نوجوانوں، خصوصاً ان کے خوشہ چینوں کو لہو روتے، بلکتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا اور جس طرح ان کا غم تازہ اور ان کی یاد اب تک زندہ ہے اور جس طرح پڑھے لکھوں کی ہر مجلس میں اُن کی مدح سرائی جاری ہے، وہ بھی ان کی شخصیت کی طرح بے مثال ہے —— اور ہم ایسے پروانوں کو تو شاید زیادہ کراہنے اور گریہ کرنے کی بھی سکت نہیں:

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں موجود تو ہیں؛ لیکن میرے اور ان کے دیگر پروانوں کے لیے بے رونق؛ فکر وخیال کی دنیا اجڑ سی گئی ہے اور دل ودماغ ایک خرابۂ وحشت ناک بن گیا ہے:

ویراں ہے مے کدہ، خم وساغر اداس ہے
تم کیا گئے، کہ روٹھ گئے دن بہار کے

لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے، یاد آتے رہیں گے، دلوں اور آنکھوں میں بسے رہیں گے، ان کا کارنامۂ تاباں، انفس و آفاق پر چھایا رہے گا اور تاروں کی چمک، چاند کے داغِ جگر، شب کی زلفِ برہم، صبح کی برودت، دنوں کی حرارت، بادِ سحر گاہی کی لطافت، شبنم کی افتادگی، ساحل کی بے نیازی، غنچوں کی چٹک، پھولوں کی مہک اور بجلی کی تڑپ میں ان کی یادوں کی قندیل، ہمیشہ ضوفشاں رہے گی۔

اللہ ان کی قبر کو منور کرے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کے درجات بلند کرے، انبیا، صدیقین، شہدا اور اولیا کے جوار میں جگہ نصیب کرے اور صبح وشام کے ابر ہائے، رحمت ان کے مرقد کو سیراب کرتے رہیں:

مثلِ ایوانِ سحر، مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور، یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر، شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ، اس گھر کی نگہ بانی کرے

اِنَّ الْعَیْنَ لَتَدْمَعُ ، وَإِنَّ الْقَلْبَ لَیَخْشَعُ ، وَلَا نَقُوْلُ إِلَّا مَا یُرْضِیٰ رَبَّنَا ، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ یَا " وَحِیْدُ " لَمَحْزُوْنُوْنَ :

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے، اِس بحرِ بے کراں کے لیے

سوانحی نقوش

ہندوستان کا بابرکت علاقہ

خالقِ ارض وسما کی حکمت ومشیت سے - جو بعض دنوں اور راتوں کو بعض پر اور بعض مقامات کو دوسرے مقامات پر فضیلت دیا کرتا ہے- دہلی کے شمال مشرق میں واقع مغربی یوپی کا علاقہ عموماً اور اضلاعِ سہارن پور و مظفرنگر کا وہ حصہ، جو دریائے گنگا و جمنا کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے ''دوآبہ'' کہلاتا ہے خصوصاً، صدیوں سے خادمانِ دین، علمائے کاملین اور صوفیا و مصلحین کا گہوارہ رہا ہے۔ بالخصوص امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہ پھلتی دہلویؒ[1] (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ/۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے عہد، یعنی بارہویں صدی

---

(۱) حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم پھلتی دہلویؒ: دیارِ ہند کے بے مثال مصلح، بے بدل مفکر، محدث اعظم، جلیل القدر فقیہ اور امت مسلمہ کے ایک ممتاز ترین عالم وداعی ومجدد، جن کے تذکرے کے بغیر ہندوستان کی علمی، دینی، دعوتی، تجدیدی، تعلیمی، تربیتی، تاریخ بے معنی رہے گی۔ آج برصغیر میں دین وعلم کا باغ، جو سرسبز و شاداب ہے، وہ شاہ ولی اللہ اور آپ کی اولاد واحفاد اور تلامذہ کی دین ہے۔ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور، ندوۃ العلما لکھنؤ اور برصغیر کے تمام دینی مدرسے اور تحریکیں ولی اللہی تحریک کا ثمرہ ہیں۔

چہارشنبہ بہ وقت طلوع آفتاب ۴رشوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۲۱رفروری ۱۷۰۳ء کو ''پھلت'' ضلع مظفرنگر یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام احمد، کنیت ابوالفیاض، عرف ولی اللہ، بشارتی نام قطب الدین اور تاریخی نام عظیم الدین ہے۔ سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے خلیفۂ ثانی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے اور والدۂ ماجدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ کاظمؒ سے جاملتا ہے۔ اپنے والد شاہ عبدالرحیم (متوفی ۱۲رصفر ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۶رنومبر ۱۷۱۸ء) سے اکتسابِ علم کیا، پندرہ سال کی عمر میں تمام متداولہ علوم کی تکمیل کرلی۔ ۸ربیع الثانی ۱۱۴۳ھ کو سفر حج پر تشریف لے گئے، وہاں سے ۱۴رجب ۱۱۴۵ھ کو مراجعت ہوئی۔ حرمین شریفین کے قیام کے دوران وہاں کے اساطین علم وفضل سے استفادہ کیا، خصوصاً شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کورانی شافعیؒ (۱۰۸۱-۱۱۵۷ھ/۱۶۷۲-۱۷۴۴ء) سے۔ ۱۱۲۹ھ/۱۷۱۷ء میں اپنے والد صاحب سے بیعت ہوئے اور ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء میں خلافت واجازتِ بیعت سے سرفراز ہوئے۔

ہجری سے عصر حاضر تک، تمام دینی وعلمی اور دعوتی و اصلاحی سرگرمیوں اور برصغیر میں اسلام کے حقیقی احیا وبقا کا عظیم کام، دراصل اِسی نواح کے اصحاب فضل وکمال اور اربابِ عزیمت و دعوت سے، اللہ پاک نے لیا ہے۔ اگر اسلام کی کھیتی آج اس دیار میں سرسبز وشاداب نظر آتی ہے، تو اس کا اصل سہرا اسی علاقے کے خادمانِ اسلام و داعیانِ عظام وعلما ومشائخ کرام کے سر جاتا ہے، جن کے مخلصانہ ومجاہدانہ وسرفروشانہ و دوراندیشانہ کارناموں کے محض تذکرے سے ہمارا سر، احساسِ افتخار سے اونچا ہو جاتا ہے۔(۲)

شاہ صاحبؒ کی پہلی شادی شاہ عبیداللہ پھلتی کی صاحب زادی اور شاہ محمد عاشق کی بہن ''فاطمہ'' سے ۱۴ سال کی عمر میں ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۷ء میں ہوئی تھی۔ ان سے شاہ محمد پیدا ہوئے، جو آپ کے سب سے بڑے صاحب زادے تھے۔ جو مؤرخین کے اندازے کے مطابق ۳۰-۱۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور اُن کی وفات ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء میں بڈھانہ اپنے ناَنھیال میں ہوئی اور وہیں جامع مسجد سے متصل مدفون ہیں۔ شاہ صاحب نے ۴۳ سال کی عمر میں سیدہ ارادت بنت سید ثناءاللہ سونی پتی سے ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۶ء میں دوسرا عقد کیا، جن کے بطن سے چار صاحب زادے: حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ رفیع الدین، حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ عبدالغنی اور ایک صاحب زادی تولد ہوئیں۔

آپ کی ۵۰ کے قریب مطبوعہ اور تقریباً اتنی ہی غیر مطبوعہ تصنیفات تک مؤرخین کو رسائی ہوسکی ہے، جن میں حجۃ اللہ البالغہ اپنے موضوع یعنی مقاصد واسرارِ شریعت کی ترجمانی کے سلسلے میں پوری تاریخ اسلام میں لاجواب کتاب ہے۔ آپ کے مشاہیر تلامذہ میں پانچوں صاحب زادوں کے علاوہ شیخ محمد عاشق پھلتی، شاہ نوراللہ بڈھانوی، خواجہ محمد امین کشمیری، شاہ ابوسعید رائے بریلوی، قاضی ثناءاللہ پانی پتی، شاہ محمد نعمان بن سید محمد نورنصیرآبادی جیسے آفتاب و ماہ تاب شامل ہیں۔ بہ روز ہفتہ ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ/ مطابق ۷راگست ۱۷۶۲ء امام ولی اللہ نے دہلی میں وفات پائی اور وہیں قبرستان مہندیان بیرون دلی دروازہ سپردِ خاک ہوئے۔

(۲) اسی لیے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۲-۱۳۷۳ھ/۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے ان بستیوں کے متعلق فرمایا تھا کہ

''ان اطراف کے قصبات و دیہات سے جس قدر علمائے کاملین اور صلحائے متقین پیدا ہوئے، اس دور میں اس ملک کے کسی خطے میں پیدا نہیں ہوئے۔ یہ وہ واقعہ ہے جس کی تصدیق مشاہدے سے صاف نظر آتی ←

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور آپ کے عالی مقام صاحب زادوں واحفاد:
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (۳) (۱۱۹۵-۱۲۳۹ھ/ ۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) حضرت شاہ رفیع الدینؒ (۴) (۱۱۶۳-۱۲۳۳ھ/ ۱۷۴۹-۱۸۱۷ء) حضرت شاہ عبدالقادر (۵) (۱۱۶۷-۱۲۳۰/ ۱۷۵۳-۱۸۱۴ء) حضرت شاہ عبدالغنیؒ (۶)

← ہے۔" (سہ ماہی "احوال وآثار" کاندھلہ، ج:۱، شمارہ:۱، ص:۱۲)

(۳) سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ حضرت شاہ ولی اللہ کے دوسرے صاحب زادے، ہندوستان کے نام ور محدث و مفسر و فقیہ تھے۔ ان کی ولادت ۲۵؍رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ مطابق ۱۲؍اکتوبر ۱۷۴۶ء، بہ روز پنج شنبہ دہلی میں ہوئی۔ والد صاحب شاہ ولی اللہؒ سے حصول علم کیا۔ ۱۷ سال کے تھے کہ شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تکمیل تعلیم خواجہ محمد امین، شاہ محمد عاشق اور شیخ نور اللہ بڈھانوی سے کی۔ حصول تعلیم کے بعد والد کی مسند درس وارشاد وافتا کو زینت بخشی اور تقریباً ساٹھ سال تک اپنے زبان وقلم سے علم وفضل کا لعل وگہر لٹاتے رہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا احیا اور ہندوستان میں اسلامی اقدار کی بحالی، قرآن مجید کی ترجمانی، دین خالص کی ترویج، حدیث کی نشرواشاعت، فتنۂ تشیع کا مقابلہ، مردانِ کار کی تربیت، آپ کے عظیم کارنامے ہیں۔ قرآن پاک کی تفسیر "فتح العزیز" نیز بستان المحدثین، تحفۂ اثنا عشریہ، عجالۂ نافعہ، وغیرہ آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔

۷؍شوال ۱۲۳۹ھ یک شنبہ مطابق ۱۸؍مئی ۱۸۲۴ء کو رحلت کی اور اپنے والد ماجد کے قریب آسودۂ خاک ہوئے۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ۵۵ بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔

(۴) حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی شاہ ولی اللہ کے تیسرے صاحب زادے تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ کے امام، محدث، مفسر، فقیہ اور محقق تھے۔ ولادت دہلی میں ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں ہوئی۔ والد صاحب کی وفات کے وقت ۱۲-۱۳ سال کے تھے اور میبذی پڑھ رہے تھے۔ بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز اور ماموں شاہ محمد عاشق وغیرہ سے تحصیل علوم کی، طریقت میں آپ نے آخر الذکر سے استفادہ کیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے کثرتِ امراض کی بنا پر تدریس ترک کر دی، تو ان کے اسباق شاہ رفیع الدین ہی کے سپرد ہوئے اور مدرسے کی صدارت کا بار آپ ہی نے اٹھایا اور نصف صدی سے زیادہ عرصے تک سرگرم افادہ وتدریس رہ کے، ہزاروں تشنگانِ علم کو سیراب کیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی زندگی ہی میں آپ نے ۶؍شوال ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۲؍جولائی ۱۸۱۸ء کو رحلت فرمائی اور والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ بیسیوں اردو، عربی، فارسی گراں قدر تصنیفات یادگار چھوڑیں۔

(۵) حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شاہ ولی اللہ کے چوتھے صاحب زادے اور جلیل القدر محدث و مفسر ←

(۱۱۷۱ھ-۱۲۰۳ھ/ ۱۷۵۸-۱۷۸۹ء) حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ (۷)

(۱۱۹۳-۱۲۴۶ھ/ ۱۷۷۹-۱۸۳۱ء) حضرت شاہ محمد اسحاقؒ (۸) (۱۱۹۶-

← تھے۔ والد کی وفات کے وقت صرف ۹ برس کے تھے۔ علوم کی تکمیل شاہ محمد عاشق اور دوسرے علماء سے کی اور راہِ طریقت، شاہ عبدالعدل دہلوی کی زیرِ نگرانی طے کیا۔ دہلی کی اکبر آبادی مسجد میں درس و افادے کا سلسلہ تمام عمر جاری رکھا۔ آپ کا عظیم کارنامہ قرآن شریف کا بامحاورہ اردو ترجمہ ہے، جو آپ نے ۱۲۰۵ھ میں مکمل کیا اور جو پہلی بار ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء میں سید عبداللہ بن بہادر علی نے مطبع احمدی ہگلی بنگال سے شائع کیا۔

آپ کے تلامذہ کا شمار ممکن نہیں۔ امام فضل حق خیر آبادی، مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ محمد اسماعیل شہید، شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی، شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکی جیسے اکابر علمائے عصر نے آپ سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کیے۔ چہار شنبہ ۱۹؍رجب ۱۲۳۰ھ مطابق ۲۹؍مئی ۱۸۱۵ء کو وفات پائی اور والد کے جوار میں مدفون ہوئے۔

(۶) شاہ عبدالغنی دہلویؒ، شاہ ولی اللہؒ کے پانچویں صاحب زادے اور شاہ اسماعیل شہید کے والد تھے۔ ولادت ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۸ء میں ہوئی۔ والد ماجد کی وفات کے وقت صرف ۵ سال کے تھے۔ والد کے ایک شاگرد شیخ علاء الدین پھلتی کی صاحب زادی فاطمہ سے عقد ہوا، جن کے بطن سے ایک صاحب زادی رقیہ اور ان کے بعد ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء میں شاہ اسماعیل شہید تولد ہوئے۔ شاہ اسماعیل کی والدہ کا ۱۸۲۲ء میں سفرِ حج کے دوران وصال ہوا۔ شاہ عبدالغنی ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء میں ۳۲-۳۳ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ آپ بڑے صاحبِ کشف و کرامات، عارفِ کامل، زاہد اور پرہیزگار اور یکتائے روزگار بزرگ تھے۔

(۷) شاہ اسماعیل: آپ شاہ عبدالغنی کے فرزند اور شاہ ولی اللہ کے پوتے، نامور مجاہد، جلیل القدر عالم، توحید و سنت کے داعی اور راہِ حق کے سپاہی تھے۔ ۱۲؍ربیع الاول ۱۱۹۳ھ = ۲۶؍اپریل ۱۷۷۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، آٹھ سال کی عمر میں تکمیل حفظ کیا۔ دس سال کے تھے کہ والد کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ درسی کتابیں چچا شاہ عبدالقادر سے پڑھیں اور سند حدیث پندرہ سال کی عمر میں بڑے چچا شاہ عبدالعزیز سے لی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی سے بیعت و خلافت حاصل کیا جب کہ آپ ان سے سات سال بڑے تھے۔ راہِ خدا میں جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ اور پھر ۲۴؍ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ = ۶؍مئی ۱۸۳۱ء کو سید صاحب کے ساتھ بالاکوٹ میں شہادت کی سعادت کے علاوہ تقویۃ الایمان، منصبِ امامت، صراطِ مستقیم وغیرہ آپ کی گراں قدر علمی یادگاریں ہیں۔ تقویۃ الایمان کا سال ہا سال قبل عربی میں مولانا علی میاں صاحب ندویؒ نے ترجمہ کر کے عالمِ عربی کو اس منفرد کتاب سے روشناس کرانے کا کارنامہ انجام دیا، فجزاہ اللہ خیراً۔

←

۱۲۶۲ھ/ ۱۷۸۱- ۱۸۴۵ء) حضرت شاہ محمد یعقوب دہلویؒ(۹) (۱۲۰۰-۱۲۸۲ھ/ ۱۷۸۶ء-۱۸۶۷ء)۔

نیز ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کا خوانِ علم وعمل، اصلاً اسی خطے میں بچھا۔ یہیں سے قافلۂ علم وہنر محوِ سفر ہوا۔ برصغیر میں ڈھائی سو سال سے جو

---

(۸) شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی، سراج الہند شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے اور خلیفہ و جانشیں تھے۔ ولادت ۸/ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۹/ اکتوبر ۱۷۸۲ء کو دہلی میں ہوئی۔ شاہ محمد اسحاق انیسویں صدی عیسوی کے بیش تر خدام حدیث نبوی کے شیخ تھے۔ والد کا نام شیخ محمد افضل تھا، کتب صرف اور کافیہ تک نحو کی کتابیں مولانا عبدالحئی بڈھانوی سے پڑھیں، باقی علوم کی تحصیل شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے کی، حضرت شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی سند لی۔ منازل سلوک شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں طے کیے، انھیں سے خلافت حاصل کیا۔ ۴۰ سال تک مدرسہ رحیمیہ میں مسند تدریس پر رونق افروز رہے۔ ۱۲۴۰ھ میں حج کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور حجاز میں شیخ عمر بن عبدالکریم مکی سے سند حدیث لی۔ ۱۲۵۸ھ میں اپنے چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب دہلوی اور دیگر افراد خاندان کے ساتھ ہندوستان سے مکہ مکرمہ کو ہجرت کی اور وہیں سکونت اختیار کی، گراں قدر تصنیف یادگار چھوڑیں۔ شاگردوں میں چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب، مولانا سید نذیر حسین دہلوی، شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا عبدالغنی مجددی جیسے عظیم القدر علما شامل ہیں۔ ماہ رجب ۱۲۶۲ھ = جون ۱۸۴۶ء میں مکہ مکرمہ میں رحلت فرمائی اور جنت المعلی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

(۹) شاہ محمد یعقوب دہلوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے اور شاہ محمد اسحاق دہلوی کے برادر خرد تھے۔ ولادت ۲۸/ ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۲۴/ ستمبر ۱۷۸۶ء میں دہلی میں ہوئی۔ تحصیل علوم زیادہ تر شاہ رفیع الدین سے کی۔ تفسیر جلالین شاہ عبدالعزیز سے، ان کی چہل قدمی کے دوران پڑھی۔ سند حدیث شاہ عبدالعزیز نے عطا فرمائی۔ تحصیل علم کے بعد اپنے بزرگوں کے مدرسے میں درس دینے لگے۔ ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء میں اپنے بڑے بھائی شاہ محمد اسحاق کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا۔ واپسی پر درس کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں پورا گھرانا مکہ معظمہ ہجرت کر گیا۔ ۲۸/ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۶/ مارچ ۱۸۶۶ء کو وصال فرمایا اور جنت المعلی میں مدفون ہوئے۔ آپ کے شاگردوں میں نواب صدیق حسن خاں، مولانا مظفر حسین کاندھلوی، ملا عبدالقیوم بڈھانوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد زماں، شیخ محمد محدث تھانوی، خواجہ احمد بن یاسین نصیرآبادی، مولوی محمد سعید عظیم آبادی جیسے رجال کبار ہیں۔

علم و دعوت کا دریا، رواں دواں ہے، اس کا سرچشمہ یہیں سے ابلا تھا۔ اِحیائے دین متین، علوم اسلامی کی نشر و اشاعت، سنت و شریعت کی پیروی اور دینی اداروں کا جو سلسلہ اس وقت قائم ہے، علم و عمل کا جو ذوق برصغیر میں پایا جاتا ہے اور دعوت و اصلاح کی جوئے رواں ساری دنیا کو سیراب کر رہی ہے، وہ ولی اللّٰہی تحریک کی برکت ہے، جو خدائے کریم کی حکمت سے اِسی علاقے میں برپا ہوئی اور برگ و بار لائی۔

حضرت سید احمد شہیدؒ[10] (۱۲۰۱-۱۲۴۶ھ/ ۱۷۸۶-۱۸۳۱ء) کے قافلۂ جہاد و دعوت کے سربہ کف مجاہدین اولین و نائبین و مشیران: حضرت شاہ

---

(۱۰) سید احمد بن سید محمد عرفان حسنی رائے بریلوی: عظیم مجاہد، قائد، مصلح اور مجدد تھے۔ عرصۂ دراز کے بعد سرزمین ہند کو ایسا اسلامی سپاہی نصیب ہوا، جس نے اس پورے دیار کو روح جہاد سے سرشار کر دیا۔ ان کے جہادی کارناموں اور انفاس گرم کی تاثیر سے پورے برصغیر میں ایسا دینی و دعوتی انقلاب برپا ہوا، جس کی نظیر تاریخ اسلام کی کئی صدیوں میں نہیں ملتی۔ ۴۰ ہزار سے زیادہ غیر مسلم آپ کے ذریعے مشرف بہ اسلام ہوئے، جب کہ تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ سے بیعت کی۔

۶ر صفر ۱۲۰۱ھ مطابق ۲۸ر نومبر ۱۷۸۶ء کو تکیہ شاہ علم اللہ حسنی، رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب سیدنا علی بن ابی طالبؓ تک پہنچتا ہے۔ خدائے پاک نے آپ کی فطرت میں شوق جہاد اور ذوق عبادت ودیعت کیا تھا؛ اس لیے آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا تو تعلیم کی طرف میلان نہ ہو سکا۔ نوجوانی میں ۱۲۱۸ھ میں دہلی پہنچ کے خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے سرِ رکن شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے بعض کتابیں پڑھیں۔ شاہ عبدالعزیز سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ سات سال ریاست ٹونک میں لشکر میں رہ کے فنون سپہ گری میں مہارت حاصل کی۔ دہلی آ کے بیعت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، چناں چہ شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی بڈھانوی جیسے کبار علما حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ۱۸۲۲ء میں آٹھ سو رفقاء کے ساتھ سفر حج کیا، ۱۷ر جنوری ۱۸۲۶ء (۵ر رجب ۱۲۴۱ھ) کو پانچ سو مجاہدین کے ساتھ سفر جہاد کا آغاز کیا، پھر مجاہدین مختلف علاقوں سے آ کے ملتے رہے، جن کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ متعدد معرکوں میں مجاہدین کو خاصی کامیابی ملی؛ لیکن دشمنوں کی مسلح افواج کے سامنے بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے بالآخر تین سو رفقا کے ساتھ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/ ۶ر مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔

محمد اسماعیل و مولانا شاہ عبد الحیؒ بڈھانوی[۱۱] (۱۱۹۰-۱۲۴۲ھ/ ۱۷۷۶-۱۸۲۸ء) و مولانا محمد یوسف پھلتیؒ و حافظ مصطفیٰ جھنجھانوی کاندھلویؒ و میاں جی احسان اللہ بڈھانویؒ، اسی خاک سے اٹھنے والے غلامانِ محمد و سرفروشانِ اسلام تھے۔

یہی علاقہ، حضرت شاہ عبدالعزیز کے شاگردِ رشید: مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ[۱۲] (۱۱۶۲-۱۲۴۵ھ/۴۹-۱۷۴۸-۱۸۲۹ء) اور مولانا مظفر حسین

---

(۱۱) مولانا عبدالحی بڈھانویؒ: شاہ عبدالعزیزؒ کے مشہور شاگرد اور داماد تھے۔ والد کا نام ہبۃ اللہ بن نور اللہ تھا، جو شاہ عبدالعزیز کی اہلیہ کے بھتیجے تھے۔ ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء کے قریب بڈھانہ ضلع مظفر نگر اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ سے جملہ علوم کی تحصیل کی، خصوصاً علم حدیث، فقہ اور تفسیر میں کمال بہم پہنچایا۔ سید احمد شہید سے بیعت ہوئے، ان کی تحریک جہاد میں مشیر اعلیٰ کی حیثیت سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ سرحد کے علاقے میں فتح کے بعد جب اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا، تو سید صاحبؒ نے آپ کو مشیر اعلیٰ اور عدالت عالیہ کا جج منتخب کیا۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت کے واقعے سے تین سال قبل سوات کے علاقے میں ۸ر شعبان ۱۲۴۲ھ = ۲۴ر فروری ۱۸۲۸ء کی شب میں اللہ الرفیق الأعلی، اللہ الرفیق الأعلی کے ورد کے ساتھ، جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ سید صاحب نے سات سو مجاہدین کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

(۱۲) مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ صدیقی حنفی: حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے ہم سبق تھے۔ وہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں ۱۱۶۲ھ/ ۴۷-۱۷۴۸ء میں تولد ہوئے۔ والد کا نام مولانا محمد عرف شیخ الاسلام بن قطب الدین بن عبدالقادر تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب امام فخر الدین رازی سے گزرتا ہوا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ بچپن وطن ہی میں گزرا، قرآن پاک یہیں حفظ کیا اور عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں متوسطات تک والد ماجد سے اخذ کی۔ ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء کے آس پاس دہلی تشریف لے گئے اور جملہ علوم کی تحصیل، حضرت شاہ عبدالعزیز سے کی۔ شاہ صاحب کو مفتی الٰہی بخش کی استعداد پر بہت اعتماد تھا، حتی کہ انھوں نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا کہ

''میرے شاگردوں میں دو شخص بہت عمدہ ہوئے۔ مولوی (شاہ) رفیع الدین اور مولوی (مفتی) الٰہی بخش'' (''احوال و آثار'' ج:۱، شمارہ:۱) حضرت شاہ صاحبؒ سے ہی مفتی صاحب نے باطنی فیض حاصل کیا اور سلوک و معرفت کی منزل طے کی۔ اس کے بعد درس تدریس کا سلسلہ شروع کیا، پھر محمد شاہ کمال ←

حضرت حاجی امداد اللہ (۱۲۲۰-۱۲۸۳ھ/ ۱۸۰۵-۱۸۶۶ء) کاندھلویؒ(۱۳)
مولانا احمد علی محدث (۱۲۳۳-۱۳۱۷ھ/ ۱۸۱۷-۱۸۹۹ء) مہاجر مکیؒ(۱۴)

→ الدین سے بیعت ہو کے مزید کسب فیض کیا۔ پھر سید احمد شہید سے بھی بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت حاصل کی۔ عرصے تک بھوپال میں افتا کے منصب پر فائز رہے۔ انھوں نے کئی قیمتی تصنیفات چھوڑیں، جن میں مثنوی مولانا روم کا تکملہ بہت مشہور اور گراں قدر ہے، جسے ۱۲۲۰ھ میں مکمل کیا تھا۔

یک شنبہ ۲۵ ر جمادی الثانیہ ۱۲۴۵ھ = ۲۴ ر نومبر ۱۸۲۹ء کو کاندھلہ میں وفات پائی۔

(۱۳) مولانا مظفر حسین کاندھلوی: اپنے وقت کے انتہائی پرہیز گار اور دین دار عالم وفقیہ تھے۔ والد کا نام محمود بخش کاندھلوی ہے، جو خود جلیل القدر عالم تھے۔ سنت کی پیروی، شب بے داری اور پرہیز گاری میں مولانا مظفر حسین اپنے عصر میں لاثانی تھے، حتی کہ مشہور ہے کہ کبھی کوئی مشتبہ چیز ان کے حلق سے نہیں اتری۔ وہ ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء میں کاندھلہ میں متولد ہوئے، پہلے اپنے چچا مفتی الٰہی بخش سے تعلیمی فیض پایا؛ لیکن ابھی تکمیل تعلیم نہ کر سکے تھے کہ مفتی صاحب کی وفات ہوگئی، تو بقیہ ظاہری وباطنی تعلیم شاہ محمد اسحاق دہلوی سے حاصل کی۔ سید احمد شہید سے بھی استفادے کا موقع ملا۔ مسلمانوں کے معاشرے سے غلط رسم ورواج کے مٹانے کے لیے بہت تگ ودو کیا۔ بیوگان کے عقد ثانی کی طرح ڈالی۔ آپ نے سات حج بیدل کیے۔ ۱۰ر محرم ۱۲۸۳ھ = ۲۵ ر مئی یوم جمعہ ۱۸۶۶ء کو مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا، جنت البقیع میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس مدفون ہونے کی سعادت ملی۔

(۱۴) شیخ المشائخ، الحاج امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی پیر ومرشد علمائے دیوبند: ۲۲ر صفر ۱۲۳۳ھ = ۲ر دسمبر ۱۸۱۷ء، روز شنبہ "نانوتہ" ضلع سہارن پور میں ولادت باسعادت ہوئی۔ والد محترم حافظ محمد امین نے آپ کا نام امداد حسین رکھا، لیکن شاہ اسحاقؒ نے آپ کا نام امداد اللہ تجویز فرمایا۔ تاریخی نام ظفر احمد (۱۲۳۳ھ) رکھا گیا۔ سلسلۂ نسب حضرت ابراہیم بن ادہم سے گزرتا ہوا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

حفظ قرآن پاک کے بعد ۱۶ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ہم راہ دہلی کا سفر کیا۔ وہاں فارسی کی کتابیں پڑھیں، تھوڑا بہت علم نحو وصرف بھی حاصل کیا، مولانا رحمت علی تھانوی سے تکمیل الایمان اور حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ سے قراءت اخذ فرمائی۔ مفتی الٰہی بخشؒ کے شاگرد مولانا محمد قلندر جلال آبادیؒ سے مشکوۃ شریف ایک ربع تک پڑھی اور مثنوی معنوی بھی۔ درسیات کی تکمیل نہیں کر سکے۔ ۱۸ سال کی عمر میں، شاہ محمد آفاق دہلویؒ کے خلیفہ اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے داماد اور شاگرد مولانا نصیر الدین نقش بندی شافعیؒ سے بیعت ہوئے اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد تھانہ بھون واپس آئے۔ کچھ دنوں بعد لوہاری ضلع مظفر نگر میں مقیم پیر دانا اور عارف کامل میاں جیو نور محمد جھنجھانوی سے بیعت ہوئے اور ان سے بھی اجازت وخلافت سے بہرہ یاب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پیش پیش اور ←

سہارنپوریؒ(۱۵) (۱۲۲۵-۱۲۹۷ھ/۱۸۱۰-۱۸۷۹ء) حضرت الامام محمد قاسم
نانوتویؒ(۱۶) (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/۱۸۳۲-۱۸۸۰ء) امام ربانی حضرت مولانا

← شاملی کے میدان میں مجاہدین کے سرخیل رہے، آپ ہی کی قیادت میں یہ معرکہ سر کیا گیا۔ آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ مختلف المشارب علما و فضلا آپ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے۔ آپ کی ذات سے مخلوق خدا کو بہت فائدہ پہنچا، وسیع المشربی، حلم و بردباری، عشق نبوی، حب الٰہی اور دل کی گدازی میں، آپ کا جواب نہ تھا۔ تصوف و معرفت کے موضوع پر کئی ایک کتابیں تصنیف فرمائیں۔

چہارشنبہ ۱۲ یا ۱۳ رجمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ = ۲۲ رستمبر ۱۸۹۹ء کو مکہ مکرمہ میں اپنے رب سے جا ملے اور جنت المعلی میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے پہلو میں آسودہ خواب ہوئے۔

(۱۵) عظیم محدث و فقیہ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری: حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے اساتذۂ حدیث میں ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں سہارن پور یوپی میں ہوئی۔ والد کا نام لطف اللہ ہے۔ ابتدائی تعلیم سہارن پور ہی میں حاصل کی۔ پھر دہلی تشریف لے گئے، جہاں مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے مختلف علوم حاصل کیے۔ حدیث کی سند مولانا وجیہ الدینؒ سے لی جو مولانا عبدالحی بڈھانویؒ کے شاگرد تھے۔ حرمین شریفین حج کے لیے تشریف لے گئے، جہاں صحاح ستہ شاہ اسحاق دہلوی مہاجر مکیؒ سے پڑھی۔ ہندوستان واپس آ کے حدیث کی تدریس و ترویج میں لگ گئے۔ خصوصی طور پر صحیح بخاری کی تدریس و تصحیح و تحشیہ میں خاصا وقت گزارا۔ اخیر عمر میں مظاہر علوم سہارن پور میں تفسیر و حدیث کی مسند کو رونق بخشی۔ آپ کے تلامذہ میں امام نانوتویؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ جیسے کبار فضلائے علم شامل ہیں۔

شنبہ ۶ رجمادی الاولی ۱۲۹۷ھ = ۱۸ رمارچ ۱۸۸۰ء کو سہارن پور میں وفات پائی، عیدگاہ کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہیں۔

(۱۶) حضرۃ الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم بن اسد علی نانوتوی: اپنے وقت کے عظیم مناظر و مفکر و داعی اسلام و عالم ربانی، شاملی کے میدان کے مجاہد اور عالمِ اسلام کی منفرد درس گاہ علوم دین: دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔

ماہ شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ = دسمبر ۱۸۳۲ء یا جنوری ۱۸۳۳ء میں نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ والد کا نام اسد علی اور دادا کا نام غلام شاہ تھا۔ ابتدائی کتابیں نانوتہ ہی میں پڑھیں، پھر دیوبند تشریف لائے جہاں مولانا مہتاب علی اور شیخ نہال احمد سے تحصیل علم کیا۔ پھر اپنے نانا کے پاس، جو سہارن پور میں وکالت کرتے تھے، تشریف لے گئے، وہاں مولوی محمد نواز سے فارسی و عربی کی بعض کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۶۰ھ میں مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ہم راہ دہلی تشریف لے گئے، جہاں جملہ علوم کی تکمیل کی۔ علم حدیث شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ سے حاصل کیا۔ ←

رشید احمد گنگوہیؒ (۱۷) (۱۲۴۴-۱۳۲۳ھ/ ۱۸۲۹-۱۹۰۵ء) دارالعلوم دیوبند

→ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ہوئے اور خلافت واجازت ملی۔ ذریعہ معاش کے لیے، دہلی ومیرٹھ کے مطابع میں تصحیح کتب کا کام کیا۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ کے ایما پر صحیح بخاری شریف کے آخری پاروں کا حاشیہ بھی لکھا۔ تصحیح کتب کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شیخ الہند کے علاوہ مولانا احمد حسن امروہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور بڑے بڑے علمائے نام دار آپ کے شاگرد ہیں۔ مطبع مجتبائی میرٹھ اور مطبع ہاشمی میرٹھ میں عرصے تک آپ کی ملازمت کا سلسلہ رہا۔

آپ نے ہندوستان میں اسلامی علوم کی ترویج واشاعت کے لیے ہمہ گیر تحریک چلائی، جس کے نتیجے میں مدارس کا قیام عمل میں آیا۔ دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مراد آباد، منبع العلوم گاؤٹھی بلند شہر اور بہت سے مدرسے آپ ہی کے قائم کردہ ہیں۔ مذہبی اور سماجی اصلاح میں بہت کوشاں رہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں اہم ترین معرکہ شاملی حضرت نانوتویؒ ہی کے اصرار پر لڑا گیا۔

متکلم اور مناظر اسلام کی حیثیت سے متعدد عیسائی، پادریوں اور غیر مسلم علما کے چھکے چھڑا دیے۔ ۱۲۹۳ھ کا شاہ جہاں پور کا میلۂ خداشناسی والا مناظرہ، انتہائی مشہور ہے۔ ۱۲۹۴ھ میں بانی تحریک آریہ سماج پنڈت دیانند سرسوتی سے بھی مناظرہ ہوا۔ آپ کی دو درجن سے زائد تصنیفات، آپ کی علمی گہرائی، خداداد بصیرت، وہبی علوم، زبردست فکری ملکہ، روح اسلام کے غیر معمولی فہم وادراک کی، بین دلیل ہیں۔ جن میں آب حیات، انتصار الاسلام، تقریر دل پذیر، حجۃ الاسلام، توثیق الکلام، قبلہ نما، ہدیۃ الشیعۃ، مباحثۂ شاہ جہاں پور وغیرہ مشہور ہیں۔

۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ، ۱۵راپریل ۱۸۸۰ء بہ روز جمعرات بعد نماز ظہر، صرف ۴۹ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، مقبرۂ قاسمیہ دیوبند میں آسودۂ خواب ہیں۔

(۱۷) محدث کبیر وفقیہ اعظم امام ربانی مولانا رشید احمد بن ہدایت احمد بن پیر بخش بن غلام حسن انصاری حنفی گنگوہی: اپنے وقت کے عظیم شیخ ومرشد و مصلح، تحریک آزادی کے مجاہد، امام محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق وہم ذوق وہم راز وپیر بھائی، حاجی امداد اللہؒ کے خلیفۂ اجل، دارالعلوم کے سرپرست، تقوی وتورع، مذہبی پختگی، سنت کی پیروی اور بدعت کی مخالفت میں امام تھے۔ آپ کے والد مولانا ہدایت احمد اپنے وقت کے جید عالم اور شاہ غلام علی مجددی نقش بندی (۱۱۵۶ھ-۱۲۴۰ھ) کے خلیفہ ومجاز تھے۔

۶رذی قعدہ ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۱راپریل ۱۸۲۹ء، دوشنبہ کو بہ وقت چاشت گنگوہ ضلع سہارن پور میں ولادت ہوئی، جو آپ کا نانہیال تھا۔ آپ کا اصل وطن رام پور منہیاران ضلع سہارن پور ہے۔ فارسی کی کتابیں اپنے ماموں مولوی محمد تقی سے ''کرنال'' میں پڑھیں، نحو وصرف کی تعلیم مولوی محمد بخش رام پوری سے حاصل کی۔ ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء میں دہلی تشریف لے گئے، وہاں عربی کی بعض کتابیں قاضی احمد الدین جہلمیؒ ←

کے پہلے طالب علم، تیسرے صدر مدرس، بانی ریشمی رومال تحریک، جنگ آزادی کے اہم سپہ سالار: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ[۱۸] (۱۲۶۸-۱۳۳۹ھ/

← سے پڑھیں: لیکن درسیات کی اکثر کتابیں استاذ الکل مولانا محمد مملوک علی نانوتویؒ سے اخذ کیں، کچھ کتابیں مولانا مفتی صدرالدین آزردہؒ سے بھی پڑھیں۔ تفسیر وحدیث شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے حاصل کیا، اس سلسلے میں ان کے بڑے بھائی شاہ احمد بن ابوسعید دہلویؒ سے بھی استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن گنگوہ تشریف لائے، یہاں ایک سال میں قرآن پاک کا حفظ مکمل کیا۔ سلوک ومعرفت اور احسان وتزکیے میں کمال، شیخ المشائخ حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے حاصل کیا۔ پھر درس وافادے کی مسند پر متمکن ہوئے، سیکڑوں بڑے بڑے علما آپ کے شاگرد ہیں، معرکۂ شاملی میں بھی سرفروشی کے جوہر دکھائے، آپ کو گرفتار کر کے سہارن پور، مظفر نگر کے جیل میں رکھا گیا۔ مشرکانہ ومبتدعانہ رسوم کے خلاف شمشیر برہنہ تھے، ردشیعیت وبدعت میں امام تھے، فقہ وتصوف میں ۱۴ کتابیں تصنیف کیں، امدادالسلوک، ہدایۃ الشیعۃ، ہدایۃ المعتدی، زبدۃ المناسک اور فتاویٰ رشیدیہ مشہور کتابیں ہیں۔ آپ کے درسی افادات کا مجموعہ لامع الدراری علی جامع البخاری اور تقریر ترمذی: الکوکب الدری، مطبوعہ ومتداول ہیں جو طلبہ واساتذہ کے لیے بیش بہا خزانہ ہیں۔

۷۸ سال کی عمر میں ۸ یا ۹ رجمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۳؍ اپریل ۱۹۰۵ء، جمعہ کی اذان کے بعد گنگوہ میں، یہ آفتاب علم وکمال غروب ہوا، قصبے سے متصل اپنے باغ میں مدفون ہیں۔

(۱۸) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی بن ذوالفقار علی دیوبندی، دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین وشیخ الحدیث اور جنگ آزادی کے علم بردار، ہزاروں علما کے مربی واستاذ اور اپنے زمانے میں علوم نافعہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا مولانا مہتاب علیؒ سے حاصل کی۔ قدوری اور شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اس میں داخل ہوگئے۔ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں دارالعلوم میں نصاب کی تکمیل کے بعد حضرت نانوتوی کی خدمت میں رہ کے علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔ اس کے بعد فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں والد ماجد سے پڑھیں۔ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتوی کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی (روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ، ص: ۱۰) ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے آپ کا دارالعلوم میں تقرر عمل میں آیا، بہ تدریج ترقی پاکر ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء میں منصب صدارت پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم وفضل کے ساتھ شروع سے ہی باطن بھی منور تھا۔ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں اپنے استاذ حضرت نانوتویؒ کی معیت میں حج سے مشرف ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں حاجی امداداللہ نوراللہ مرقدہ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ اس سفر حج میں علما کا بڑا قافلہ بن گیا تھا، جس میں حضرت نانوتویؒ، حضرت مولانا گنگوہیؒ، ←

(۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ ۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ[19]

← مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا مظہر نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ، حکیم ضیاء الدین رام پوریؒ، مولانا احمد حسن کان پوریؒ جیسے مشاہیر علماء کرام شامل تھے۔ آپ کے شاگردوں میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا منصور انصاریؒ، عالم باعمل مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید اصغر حسین دیو بندیؒ، مولانا سید فخر الدین مراد آبادیؒ، مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ جیسے نام ور اور فخر روزگار علما شامل ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے لیے آپ کے دماغ میں انتہائی کام یاب اور مکمل نقشہ تھا۔ اسلامی حکومتوں کے تعاون سے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے، اس کے لیے آپ نے اپنے شاگردوں اور محبین کو مختلف ملکوں اور علاقوں میں روانہ کیا، ان سے ریشم کے کپڑوں میں لکھے ہوئے خطوط کے ذریعے ربط کرتے تھے۔ ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء میں ریشمی خطوط کا انکشاف ہو گیا۔ اس سے قبل ہی اپنی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آپ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء میں حجاز پہنچ گئے تھے۔ شریف حسین والی مکہ نے گرفتار کر کے انگریز کے حوالے کر دیا، آپ کی گرفتاری ۲۳ر صفر ۱۳۳۵ھ کو عمل میں آئی، آپ کے ساتھ آپ کے سپوت شاگرد مولانا حسین احمد مدنی بھی گرفتار ہو کر مالٹا میں قید ہوئے، سوا تین سال بعد رہائی ملی۔ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء میں رہا ہو کر ہندوستان پہنچے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء = ۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ کو علی گڑھ کی جامع مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۸ر ربیع الاول ۱۳۳۹ھ = ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی میں عازم ملک بقا ہوئے اور دیو بند میں مقبرۂ قاسمیہ میں حضرت نانوتویؒ کے بغل میں آسودۂ خواب ہوئے۔ قرآن شریف کے مقبول عام اردو ترجمے کے علاوہ، ادلہ کاملہ، ایضاح الادلہ، احسن القریٰ، جہد المقل، الابواب والتراجم اور مختلف فتاویٰ اور سیاسی خطبات آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔

(۱۹) حکیم الامت، مجدد الملت، علامۂ زماں، مربی کامل، مصلح یگانہ، شیخ زمانہ، محدث ومفسر وفقیہ، مصنف اعظم، حاجی امداد اللہ کے ممتاز ترین خلیفہ، اور عصر حاضر کے مجدد: مولانا اشرف علی بن عبد الحق تھانویؒ ۵ر ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ = ۲۲ر اگست ۱۸۶۳ء چہار شنبہ کو تھانہ بھون میں متولد ہوئے۔ تاریخی نام ''کرم عظیم'' ہے آپ کے والد صاحب بڑے صاحب جائے داد تھے اور فارسی کے اچھے انشا پرداز۔ قرآن شریف حافظ حسین علی سے حفظ کیا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں تھانہ بھون ہی میں مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھیں۔ ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت شیخ الہند، مولانا سید احمد دہلویؒ سے تحصیل علم کیا۔ تجوید وقراءت کی مشق قاری محمد عبد اللہ مہاجر مکی سے کی۔ سلوک و معرفت کی منزل حاجی امداد اللہؒ کی صحبت میں طے کی۔ ۱۳۰۱ھ میں، مدرسہ فیض عام کان پور میں صدارت ←

داعیِ ملہم مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (۲۰) (۱۳۰۳-۱۸۶۳-۱۹۴۳ء)

← کے منصب پر فائز ہوئے۔ کچھ عرصے بعد جامع العلوم کان پور کے صدر مدرس ہوئے۔ ۱۴ سال تک آپ نے وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۳۱۵ھ میں ترکِ ملازمت کر کے تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ کو رونق بخشی۔ اور آخر عمر تک یہیں بیٹھ کے تبلیغ، تربیت، تزکیہ، اور تصنیف وتالیف کی وہ عظیم الشان خدمات انجام دیتے رہے، جس کی عصر حاضر میں نظیر نہیں۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ فقہ حنفی کے مستدلات پر، شہرۂ آفاق، بے مثل اور ۱۸ ضخیم جلدوں میں احادیث کا وقیع ذخیرہ: اعلاء السنن، حضرت تھانویؒ ہی کی ہدایت اور نگرانی میں، حضرت کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثانی نے، تیار کیا۔ اصلاحی وتجدیدی کارنامہ آپ کی زندگی کا روشن اور ممتاز پہلو ہے۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، اخلاق وعبادات اور عقائد میں دین خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ نفس کی مکاریوں سے واقفیت میں حضرت تھانوی طاق تھے۔ انسانوں کی تربیت کا خداداد ملکہ تھا، ضبط اوقات میں اس عصر میں بے نظیر تھے۔

۸۲ سال کی عمر میں ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۰ جون ۱۹۴۳ء کو رحلت فرمائی، تھانہ بھون میں اپنے باغ میں مدفون ہیں۔

(۲۰) مولانا محمد الیاس کاندھلوی بن مولانا محمد اسمٰعیل: داعی الی اللہ، ولی اللہ، جماعت تبلیغ کے بانی، شیخ الہند کے شاگرد، حضرت گنگوہی کے دست گرفتہ اور مولانا خلیل احمد محدث سہارن پوری کے خلیفۂ اجل تھے۔ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں کاندھلہ، مظفر نگر میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ''الیاس اختر'' تھا۔ آپ کے والد بلند پایہ بزرگ اور انتہائی سادگی پسند انسان تھے۔ بچپن کا زمانہ ننھیال کاندھلہ اور اپنے والد مرحوم کے ساتھ حضرت نظام الدین میں گزرا۔ اس وقت کاندھلہ کا یہ خاندان دین داری کا گہوارہ تھا، مرد تو مرد عورتوں کی دین داری، عبادت گزاری، شب بے داری، ذکر وتلاوت کے قصے اور ان کے معمولات اس زمانے کے پست ہمتوں کے تصور سے بلند ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیم، کاندھلہ کے مکتب میں حافظ منگتوؒ سے حاصل کی، حفظ کی تکمیل والد صاحبؒ کے پاس حضرت نظام الدین میں کی۔ ابتدائی کتابیں والد محترم اور مولانا محمد ابراہیم کاندھلوی سے پڑھیں۔ اس کے بعد اپنے منجھلے بھائی مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کے پاس گنگوہ تشریف لے گئے، جو حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں رہا کرتے تھے، ان سے حدیث کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء میں دار العلوم دیو بند آئے، شیخ الہندؒ سے بخاری وترمذی شریف کی سماعت کی۔ پھر اپنے منجھلے بھائی فاضل باکمال مولانا محمد یحییٰ سے حدیث کی باقاعدہ سند لی۔ شوال ۱۳۲۸ھ/ ستمبر ۱۹۱۰ء میں مظاہر علوم سہارن پور میں مدرس ہوئے، متوسطات تک کتابوں کا درس دیا، اسی دوران ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء میں اپنے برادر اکبر مولانا محمد کے انتقال کے بعد مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے ایما سے ←

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (۲۱) (۱۸۸۵-۱۹۴۳ء/ ۱۳۶۳ھ)

→ بستی نظام الدین دہلی تشریف لے گئے اور تبلیغ و دعوت میں منہمک ہو گئے۔ آپ نے ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں تبلیغی تحریک کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ مولانا کی پوری تحریک ایمان و احتساب پر مبنی تھی۔ وہ امت کی بدحالی اور بے دینی کی زندگی پر اس طرح کراہتے تھے جیسے کہ امت کے سرخیل صحابہ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تابعین۔ ایک آگ سی ان کے سینے میں جلتی، جس کو سامنے بیٹھنے والے بھی محسوس کرتے۔ ان کی ہر نقل و حرکت، امت میں دینی بے داری پیدا کرنے کے لیے تھی۔ وہ اسی کے لیے گفتگو کرتے، اسی کے لیے تقریر کرتے، اسی کے لیے تقریبوں میں شرکت کرتے۔ شاید بغیر نیت اور اخروی ثواب کے ارادے کے ایک کپ چائے بھی نہیں لی اور نہ کسی کو پیش کی۔ ان کے اسی اخلاص و احتساب کی وجہ سے، یہ تحریک آج دنیا کی سب سے بڑی دینی و دعوتی تحریک بن گئی ہے۔

۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ/ یکم جون ۱۹۴۴ء کو دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں آسودۂ خواب ہوئے۔

(۲۱) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا بن یحییٰ کاندھلوی مہاجر مدنی: مشہور شیخ طریقت اور عالم گیر شہرت کے حامل محدث و مصنف اور مظاہر علوم سہارن پور کے شیخ الحدیث تھے۔ ۱۱ رمضان المبارک شب پنج شنبہ ۱۳۱۵ھ/ ۵ جنوری ۱۸۹۸ء کو اپنے وطن کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ حضرت گنگوہی کے خصوصی شاگرد تھے۔ ڈھائی سال کی عمر تک کاندھلہ میں رہے۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱۸۹۹ء میں اپنے والد کے ساتھ گنگوہ گئے، وہیں مظفر نگر کے ایک صالح آدمی ڈاکٹر عبدالرحمن سے قاعدۂ بغدادی پڑھا۔ حفظ کی تکمیل کے ساتھ اردو و فارسی کی متعدد کتابیں والد صاحب سے پڑھیں۔ فارسی کی زیادہ تر کتابیں عم محترم مولانا محمد الیاسؒ سے پڑھیں۔ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں مظاہر علوم میں داخل ہوئے، جہاں جملہ علوم وفنون کی تعلیم مکمل کی۔ دورۂ حدیث کی اکثر کتابیں مظاہر علوم ہی میں اپنے والد صاحب سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد بخاری و ترمذی اپنے استاذ و شیخ مولانا خلیل احمد سہارن پوری سے پڑھیں۔ یکم محرم ۱۳۳۵ھ/ ۳۰ ستمبر ۱۹۱۶ء سے مظاہر علوم میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔ ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء میں بخاری شریف جلد اول کی تدریس کی ذمے داری دی گئی، جب کہ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء میں بخاری کی دونوں جلدیں اور ابوداؤد کی تدریس تفویض ہوئی۔ ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۸۷ھ تک آپ نے حدیث شریف کا درس دیا اور ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے۔

معرفت وسلوک میں آپ کو مولانا خلیل احمد سہارن پوری سے بیعت و اجازت حاصل تھی۔ دور آخر میں خلق کا رجوع عام آپ کی طرف تھا، اس کی نظیر کسی اور صاحب معرفت عالم کے یہاں نہیں ملتی۔ ایک دنیا آپ سے مستفیض ہوئی۔ اس کے علاوہ گراں مایہ تصنیفات آپ کے قلم سے نکلیں، جن میں اوجز المسالک، ←

(۱۳۱۵-۱۴۰۲ھ/ ۱۸۹۷-۱۹۸۲ء) نیز حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے شیخ میاں جیو نور محمد جھنجھانوی[۲۲] (متوفی ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) اور ان کے رفقا و امثال کا مولد و مسکن ہے۔

ملت اسلامیۂ ہندیہ کی دینی شناخت کا عنوان اور اس کی اسلامی زندگی کا سب سے بڑا نشان، یعنی علوم کی کتاب وسنت کی درس گاہ اعظم دارالعلوم دیوبند، نیز مظاہر علوم سہارن پور، اسی خوش قسمت خطے میں واقع ہے، جو ذیل کے مقامات پر مشتمل ہے:

دیوبند، سہارن پور، انبہٹہ، سرساوہ، رام پور منہیاران، رائے پور، گنگوہ وغیرہ (ضلع سہارن پور)

پھلت، تھانہ بھون، جلال آباد، کاندھلہ، بڈھانہ، پور قاضی، جھنجھانہ،

← لامع الدراری اور جزء حجۃ الوداع کے علاوہ، تبلیغ و دعوتی کتابوں کا مکمل کتب خانہ ہے۔ کل تعداد تالیفات کی ۸۳ ہے۔ اواخر عمر میں مدینہ منورہ منتقل ہو گئے تھے، جس کی خاک کا پیوند ہونے کی آپ کو انتہائی آرزو تھی، اللہ پاک نے یہ آرزو پوری کر دی، یکم شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء بروز پیر بوقت شام تقریباً پونے چھ بجے، مدینہ منورہ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

(۲۲) حضرت میاں جیو نور محمد جھنجھانوی بن جمال محمد ثانی بن پیر محمد بن محمد زماں بن شاہ مربی محمد بن جمال العارفین شاہ محمد بن شاہ عبدالرزاق شاہ العالمین علوی قادری: اپنے وقت کے ولی کامل اور مستور الحال بزرگ تھے، لوہاری ضلع مظفر نگر میں مکتب میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ سلوک و معرفت میں ان کے شیخ شاہ عبدالرحیم افغانی شہیدؒ تھے۔ میاں جیو کی تیس برس تک کبھی تکبیر تحریمہ فوت نہیں ہوئی۔ اپنے شیخ شاہ عبدالرحیم کی صحبت میں سرحد کے علاقے میں بھی ایک عرصہ گزارا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بھی بیعت و اجازت حاصل کی، انھی کے حکم سے سرحد سے دوبارہ اپنے وطن واپس آئے اور مکتب کی تدریس میں مشغول رہے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اپنے پہلے شیخ مولانا نصیر الدین نقش بندی دہلویؒ کے انتقال کے بعد انھی سے بیعت ہوئے اور انھی کی صحبت میں سلوک کی اعلیٰ منزل حاصل کی۔ میاں جیو کا انتقال رمضان ۱۲۵۹ھ مطابق ستمبر ۱۸۴۳ء میں ہوا۔

شاملی، کاندھلہ، کیرانہ، مظفرنگر، منگلور، لوہاری، چرتھاول، شکارپور وغیرہ (ضلع مظفرنگر)۔

وطن، ماحول، خاندان اور نشو ونما

ان ہی بابرکت مقامات میں ایک قدیم اور مردم خیز قصبہ ''کیرانہ'' بھی ہے، جو ضلع مظفرنگر میں واقع ہے، جہاں کسی راجہ ''کرن'' نے کسی زمانے میں راج کیا تھا، اسی کے نام پر اس کا نام ''کیرانہ'' پڑ گیا۔ اس کی آبادی تقریباً پچاس ہزار ہے، مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد ہے۔ یہاں مغل دور کی تاریخی عمارتوں کے مٹتے نقوش اس کی عظمت رفتہ اور تمدنِ دیرینہ کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں کے نواب صاحب کا تعمیر کردہ ''نواب دروازہ'' اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے، نیز ایک عمیق وعریض تالاب ہے، جس کی اکثر دیواریں گر چکی ہیں، تالاب کے وسط میں ایک چبوترہ ہے، جس پر نواب صاحب کشتی سے آکے تفریح کے لیے بیٹھتے تھے، اس کے مغربی کنارے پر نواب ہی کے دور کی ایک بڑی عمارت جگہ جگہ سے شق ہونے کے باوجود ماضی کی یاد تازہ کرتی ہے۔ تالاب کے گرد وسیع وعریض باغ تھا، مغل بادشاہ شاہ جہاں کی یہاں آمد کے وقت نواب صاحب نے ان کا استقبال اسی باغ میں کیا تھا۔ تالاب اور بادشاہ کی آمد کا تذکرہ ''تزک جہاں گیری'' میں موجود ہے۔[۲۳]

---

(۲۳) حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ: ''خودنوشت سوانح کے چند اوراق'' مشمولہ ''ترجمان دارالعلوم، مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر، نئی دہلی، شمارہ: جنوری-مئی ۱۹۹۶ء۔ مولانا کی ابتدائی زندگی کے سلسلے میں، جو یہاں درج کیا جارہا ہے، اس سلسلے میں، اسی ماخذ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

اسی قصبے نے ''اِظہار الحق''(۲۴) ایسی بے مثال کتاب کے مصنف، مجاہد اور متکلم اِسلام حضرت مولانا رحمت اللہ بن خلیل الرحمٰن عثمانی حنفی مہاجر مکی(۲۵) (۱۲۳۳-۱۳۰۸ھ/ ۱۸۱۸-۱۸۹۱ء) بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کو جنم

---

(۲۴) ''اظہار الحق'' مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی ردعیسائیت میں معرکۃ الآرا بے نظیر اور عالم گیر کتاب ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ تصنیف کے بعد ہی لاتعداد مرتبہ اصل عربی نیز ترکی اور انگریزی زبان میں چھپ چکی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ کئی سال پہلے مولانا اکبر علی سہارن پوری سابق استاذ حدیث دار العلوم کراچی کے قلم سے فاضل اجل اور عالم بے بدل مولانا محمد تقی عثمانی پاکستانی کی تحقیق و تحشیے کے ساتھ، کئی مرتبہ کراچی سے ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے، تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی کا اس کتاب پر تحریر کردہ مقدمہ ''عیسائیت کیا ہے'' کے عنوان سے علاحدہ مستقل کتاب کی صورت شائع ہو کر، برصغیر کے طلبہ و علما پر اپنے موضوع پر علم و تحقیق کی دولت نچھاور کر رہا ہے اور اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر رہا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ ناچیز راقم الحروف کے قلم سے ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء مکمل ہو کے دیار عرب سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا عرصہ قبل مولانا غلام محمد راندیری نے گجراتی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ عصر حاضر میں اصل عربی میں اس کے کئی ایڈیشن مصر سے بھی شائع ہوے۔ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء میں مراکش کی وزارت اوقاف و امور مذہبی نے انتہائی آب تاب سے اس کو شائع کیا۔ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء میں قطر کے امور مذہبی کے ادارے نے شیخ عمر دسوقی کی تحقیق اور شیخ عبد اللہ ابراہیم الانصاری (متوفی ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۸۹ء) کے مراجعے کے ساتھ، بہت خوب صورت ایڈیشن چھاپا، جس پر حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ (۱۳۳۳ھ-۱۴۲۰ھ/ ۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کا گراں قدر مقدمہ ہے۔ پھر ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء میں سعودی عرب کے ادارۂ تحقیقات علمیہ و افتا کے شعبۂ نشر و اشاعت نے، جامعۃ الملک سعود (شاہ سعود یونیورسٹی) کے کلیۃ التربیۃ کے استاذ مساعد (اسسٹنٹ پروفیسر) ڈاکٹر محمد احمد محمد عبد القادر خلیل ملکاوی کے تحقیق و تحشیے کے ساتھ، پہلی مرتبہ مصنف علام کے دو اصل مخطوطہ و مقروءہ نسخوں سے مقابلے کے بعد شائع کیا۔ یہ ایڈیشن یقینا سابقہ تمام ایڈیشنوں سے فائق ہے۔

(۲۵) مولانا رحمت اللہ بن خلیل الرحمٰن عثمانی کا سلسلۂ نسب ۳۴ ویں پشت پر خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ ان کے ۲۴ ویں جد امجد عبد الرحمٰن بن عبد العزیز عثمانی گاذرونی ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی (۳۶۱-۴۲۱ھ/ ۹۷۱-۱۰۳۰ء) کے عہد میں وارد ہوے، سلطان نے انھیں فوجی قاضی متعین کیا اور ہندوستان کی فتوحات کی اپنی مہمات میں انھیں ساتھ رکھا۔ شیخ عبد الرحمٰن نے ''پانی پت'' میں سکونت اختیار کی۔ ان کی اولاد میں حکیم نابینا عبد الکریم نے مغل شہنشاہ ہند اکبر بن ہمایوں بن بابر ←

دیا، جس نے نازک وقت میں تمام خطرات سے بے پروا ہوکر، فرزندانِ

← (۹۴۹-۱۰۱۴ھ/۱۵۴۲-۱۶۰۵ء) کا علاج و معالجہ کیا، جو کام یاب رہا، اس کے انعام میں بادشاہ نے ''کیرانہ'' میں انھیں جاگیر عطا کی اور وہ اپنی اولاد کے ساتھ یہاں آبسے۔

مولانا رحمت اللہ نے اسی بابرکت قصبے کے محلّہ ''دربار کلاں'' میں یکم جمادی الاولی ۱۲۳۳ھ مطابق ۹ر مارچ ۱۸۱۸ء کو آنکھیں کھولیں۔ ۱۲ سال کی عمر میں حفظ قرآن پاک کے ساتھ ابتدائی تعلیم کے مراحل وطن میں ہی اپنے والد اور دیگر افراد خاندان سے طے کیے، اعلیٰ تعلیم کی تکمیل دہلی کے ''مدرسہ حیات'' میں کی۔ فارسی ادب کا ذوق امام بخش صہبائی (ش ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) سے حاصل کیا۔ دہلی میں ہی مختلف اہل کمال سے طب، ریاضی اور مختلف عقلی علوم میں اکتساب کمال کیا۔ مزید علمی پیاس بجھانے کے لیے لکھنؤ کا سفر کیا اور مفتی سعد اللہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ پھر آپ نے وطن کا رخ کیا جہاں اپنا مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ متعدد بڑے بڑے علما اس زمانے میں فارغ ہوے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو وقت کے سب سے بڑے چیلنج کو قبول کرنے کے لیے پیدا کیا تھا، یعنی عیسائیت کے فتنے کی سرکوبی کے لیے، چناں چہ آپ نے اپنی ساری خداداد صلاحیتیں اس میدان میں لگادیں، قلم و زبان کی طاقتیں اس کی نذر کردیں، عیسائیوں کے ساتھ بڑے بڑے مناظرے کیے، جن میں پادری فنڈر (متوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء) کے ساتھ آگرے میں رجب ۱۲۷۰ھ/ اپریل ۱۸۵۴ء کے ساتھ کیا گیا مناظرہ مشہور عالم ہے، جس میں فنڈر کو شکست فاش ملی اور وہ ہندوستان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دیگر علماے اسلام کی طرح مولانا کیرانویؒ نے بھی سرگرم حصہ لیا، جب انگریزوں نے آتش و آہن کے ذریعے، کوشش انقلاب کا خاتمہ کردیا اور علما کو تختۂ دار پر چڑھانا اور جسمانی و مالی سزا دینی شروع کی، تو مولانا رحمت اللہؒ روپوش ہوگئے کہ جان بچا کے کسی طرح اللہ کے دین کی مزید خدمت کی جاسکے۔ انگریزوں نے ان کا پتہ دینے والوں کے لیے، اس وقت کا سو روپے متعین کیا، ان کی کیرانہ کی تمام املاک و جائے داد کو ضبط کر کے (۱۴۲۰) روپے میں نیلام کردیا اور ان کی تصنیفات کی نشر و اشاعت پر پابندی عائد کردی؛ چناں چہ آپ خفیہ طور پر ہندوستان چھوڑ ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۲ء میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ وہاں آپ کو مسجد حرام میں تدریس کی سرکاری اجازت مل گئی، علمی فیضان کا حرم مکرم میں سلسلہ شروع کردیا۔ ۱۲۸۵ھ میں حجاز کا پہلا باقاعدہ مدرسہ مکہ مکرمہ میں قائم کیا، جس کو ۱۲۹۱ھ میں ''مدرسہ صولتیہ'' کا نام دیا گیا؛ کیوں کہ اس کی تعمیرات کے لیے کلکتے کی ایک فیاض اور خوش قسمت خاتون ''صولت النساء'' نے مالی امداد کی تھی۔

اپنی وفات ۲۲ر رمضان ۱۳۰۸ھ مطابق ار مئی ۱۸۹۱ء تک، وہ مدرسے کے مہتمم و مدرس رہے۔ مکہ مکرمہ کے مشہور قبرستان ''معلاۃ'' میں آپ مدفون ہیں، جہاں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی مدفون ہیں اور صحابہ اور امت کے کبار علما و صلحا بھی۔ مدرسہ صولتیہ آج بھی قائم ہے اور آپ کی اولاد و احفاد کا، اس کے ←

تثلیث کو دیارِ ہند سے میراثِ خلیل کو لے بھاگنے کی منظّم کوششوں کو، بالکل ناکام بنادیا۔ ایک طرف مناظروں کے ذریعے اور دوسری طرف مذکورہ بالا تحقیقی کتابوں کے ذریعے عیسائی پادریوں کا ناطقہ بند کردیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نواسے وخلیفہ اور دیار ہند کے نام ور محدث وفقیہ حضرت شاہ اسحاق محدث دہلویؒ کے مشاہیر تلامذہ میں سے ایک مولانا امین الدین کیرانوی بھی کیرانہ کی خاک کی دین تھے(۲۶)

اِسی خاک سے دورِ آخر میں عربی زبان کے سب سے بڑے معلم، فیض رساں مربی ومردم ساز مدبر: مولانا وحید الزماں بن مولانا مسیح الزماں بن مولانا محمد اسماعیل بن مولانا محمد حسین اٹھے، جنھوں نے اپنے فکر وعمل سے

← ذریعے فیض رسانی کا سلسلہ جاری ہے۔ برصغیر کے حجاج کرام ومعتمرین وزائرین کی خاص پناہ گاہ اور مولانا کیرانوی کی یادوں کی جلوہ گاہ ہے۔

اظہار الحق کے علاوہ، مولانا کیرانویؒ کی اِزالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک، اعجاز عیسوی، البروق اللامعۃ، تقلیب المطاعن، معدل اعوجاج میزان، احسن الاحادیث فی اِبطال التثلیث، البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف، معیار تحقیق وغیرہ، خاص ردعیسائیت کے موضوع پر ہیں، ان کے علاوہ ان کی اور بھی تصنیفات اور رسائل ہیں، جو انھوں نے ان سے قبل لکھے تھے۔ جن میں التنبیہات فی اِثبات الاحتیاج اِلی البعث والحشر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(۲۶) ڈاکٹر تنویر احمد علوی کیرانوی ایم. اے، پی. ایچ. ڈی، ڈی لٹ (علیگ) نے ''خیر البیان''، ''ملفوظات رزاقیہ'' کے اردو ترجمے ''صحیفۂ ابرار'' مطبوعہ ۹۴-۱۳۹۳ھ مطابق ۷۴-۱۹۷۳ء، میں ص: ۵۱۷ سے ص: ۵۳۴ تک قصبہ کیرانہ کے بیسیوں علمائے صالحین واولیائے متقین کے حالات اور سنین وفات درج کیے ہیں، قصبے میں ان کی قبروں کی جائے وقوع کی نشان دہی کی ہے، نیز جھنجھانہ، کیرانہ، کاندھلہ، تھانہ بھون وغیرہ کے سادات علوی وشیوخ انصاریان کے شجرہ ہائے نسب درج کیے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیرانہ اور اس علاقے کے دیگر قصبات ودیہات، علما وصلحا کا زمانۂ قدیم سے مولد ومسکن رہے ہیں، ان کی برکات اور علم وعمل کی فتوحات واکتسابات سے یہ علاقہ ہنوز بارونق اور مستنیر ہے۔

مدرسوں کی دنیا اور علما و فضلا کی ایک بہت بڑی نسل کو، جس طرح متاثر کیا اس کی مثال اس عصر میں نہیں ملتی۔

۱۳؍ شوال ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۷؍ فروری ۱۹۳۰ء کو وہ ایک ایسے علمی خانوادے میں پیدا ہوئے، جو دینی و دنیوی وجاہت کا سنگم رہا تھا۔ ان کا دادھیالی سلسلۂ نسب میزبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جاملتا ہے۔(۲۷) دادھیالی خاندان کا تعلق شیوخ ''کیرانہ'' سے تھا، تو نانھیالی خاندان کا تعلق شیوخ ''جھنجھانہ'' سے اور رشتۂ ازدواج میں شیوخ کاندھلہ کے خاندان سے منسلک ہوئے۔ دادا مولانا محمد اسماعیل، عالم بھی تھے اور بڑے زمین دار بھی؛ کئی سو پختہ بیگھ زمین، متعدد بڑے بڑے مکانات اور باغ وغیرہ کے مالک تھے۔ نیز جھنجھانے میں خاندان کی مشترکہ زمینوں اور باغات میں بھی خاصا حصہ تھا۔ مولانا محمد اسماعیلؒ کی قصبے میں نمایاں حیثیت تھی، وہ وہاں کی جامع مسجد اور ایک دوسری بڑی مسجد کے متولی بھی تھے۔

---

(۲۷) شجرۂ نسب اس طرح ہے:
مولانا وحید الزماں بن مولانا مسیح الزماں بن قاضی مولانا محمد اسماعیل بن قاضی محمد حسین بن قاضی غلام حسین بن قاضی قلندر بخش بن قاضی محمد ظہیر الدین بن قاضی محمد زماں بن قاضی شیخ حسن بن قاضی علی احمد بن قاضی محمد عبدالنبی بن خواجہ قاضی احمد بن خواجہ محمد بن خواجہ نظام الدین بن قاضی شمس الدین بن خواجہ علاء الدین مدنی (وارد ہندوستان در قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر یوپی) بن خواجہ ظہیر الدین بن خواجہ قوام الدین بن خواجہ بدر الدین، بن خواجہ رکن الدین، بن خواجہ قطب الدین، بن خواجہ تاج الدین (ان کے دو لڑکے تھے خواجہ شرف الدین جو انصاریان قصبہ ''انبیہٹہ پیرزادگان'' ضلع سہارن پور کے مورث اعلیٰ تھے۔ دوسرے خواجہ قطب الدین جو انصاریان قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے جد اعلیٰ تھے) بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ اسماعیل عبداللہ ہراتی بن خواجہ ابومنصور بن خواجہ علی بن خواجہ محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ علی بن خواجہ جعفر بن ابومنصور بن ابوایوب انصاری صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

مولانا کیرانویؒ کی والدہ محترمہ امۃ المغنی (متوفاۃ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ = دسمبر ۱۹۸۲ء) ان کے والد کی حقیقی ماموں زاد بہن[۲۸] تھیں، جب کہ دادی مرحومہ مولانا عبدالمجید صاحب جھنجھانوی کی صاحب زادی اور مولانا نواب قطب الدین[۲۹] مؤلف ''مظاہر حق'' (متوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) کی نواسی تھیں۔ چناں چہ انھوں نے اپنے نانا نواب قطب الدین صاحب کے سایۂ

(۲۸) یہ جھنجھانہ کے علوی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے، جو اس طرح ہے: امۃ المغنی بنت حافظ علی احمد بن مولوی عبدالحمید بن حکیم فضل علی بن شیخ روشن علی بن شاہ پیر محمد ثانی بن شیخ محمد ماہ عرف ماہو متوکل بن شاہ خدا بخش بن شاہ برخوردار بن حضرت شاہ بختیار بن شاہ عبدالستار بن شاہ عبدالمومن بن شیخ اللہ دیا بن شیخ محسن بن شیخ ذوالنون بن شیخ عبدالعزیز بن شیخ نور بخش بن شیخ نور کمال الدین دانش ور بن شیخ الاسلام مفتی ابوسعید الرازی (عرب سے ہندوستان آئے) بن شیخ ابواسحاق شاہ رازی بن شیخ محمد شریف بن میر جان شاہ بن فرخ شاہ بن شیخ امیر ارسلان بن شاہ علی سرمست بن شیخ حسین فردوس بن شیخ ابایزید بن شیخ محمد فرید بن شیخ حسن بن شیخ علی زمن بن شیخ محمد باقر بن شیخ ابوبکر بن شیخ ابوالمعالی بن شیخ ابوالقاسم بن شریف البرکات علی اصغر بن علی اکبر خدادوست بن علی اعظم نورالحق بن ضیاء الدین حق پرست بن حاجی الحرمین نورالدین طوسی بن علی احمد کوفی بن صلاح الملت شیخ حسین بن زائر الحرمین شیخ امام حسن بن محمد اکبر بن الحنفیۃ بن سیدنا امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (ڈاکٹر تنویر احمد علوی سابق استاذ دلی کالج: صحیفۂ ابرار، ص: ۵۳۵-۵۴۵)

(۲۹) مولانا نواب قطب بن محی الدین حنفی دہلوی، حضرت شاہ اسحاق دہلویؒ (نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ) کے ممتاز تلامذہ میں تھے۔ بلند پایہ مصنف، زاہد شب زندہ دار، صالح اور پاک باز انسان تھے، حنفی مسلک کے بڑے مدافع اور طرف دار تھے؛ چناں چہ محدث میاں نذیر حسین دہلوی (۱۲۲۰-۱۳۲۰ھ/ ۱۸۰۵-۱۹۰۲ء) کے رد میں کئی کتابیں لکھیں؛ لیکن ان کی مشہور تصنیف ''مشکوٰۃ المصابیح'' کی شرح ''مظاہر حق'' ہے جو انتہائی مقبول ومعروف کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ''حصن حصین'' کی شرح ''ظفر جلیل'' قرآن پاک کی تفسیر ''جامع التفاسیر'' نیز ''معدن الجواہر'' ''آداب الصالحین'' ''طب نبوی'' ''توقیر الحق''، ''تنویر الحق'' اور اس کے علاوہ متعدد رسالے ہیں، جو ان کے علمی کمال اور علو مرتبہ کی دلیل ہیں۔

اواخر عمر میں مکۂ مکرمہ کو ہجرت کی اور ۶۵ سال کی عمر میں اسی کی خاک پاک کا ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں پیوند بننے کی سعادت نصیب ہوئی۔

عاطفت ہی میں پرورش پائی، جس کا اثر ان کی نیکی، پابندی صوم وصلوۃ، ذکر و عبادت کے خصوصی ذوق، اور غربا و مساکین کی خدمت کے بھرپور جذبے کی شکل میں زندگی بھر ظاہر ہوتا رہا اور اس کی برکت تمام اولاد و احفاد کی طرف منتقل ہوئی۔

والدِ محترم مولانا مسیح الزماں صاحبؒ (متوفی ۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ/ ۵؍ مارچ ۱۹۸۲ء) دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل تھے۔ وہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ[۳۰] (۱۲۹۲-۱۳۵۲ھ/ ۱۸۷۵-۱۹۳۳ء) و علامہ

---

(۳۰) علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ: مایۂ ناز و جلیل القدر محدث، قوی الحافظہ عالم، عارف باللہ، شیخ الہند کے ممتاز شاگرد، حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے۔ شنبہ بوقت صبح ۲۷؍ شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۹؍ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو اپنے ننھیال بمقام دوداں وادیٔ لولاب کشمیر میں ہوئی۔ نام انور اور شاہ عرف ہے، والد کا نام محمد معظم شاہ تھا، جو کشمیر کے ممتاز عالم، زاہد اور متقی بزرگ تھے۔ سلسلۂ نسب شیخ مسعود نروری کشمیری سے ملتا ہے، جن کے اسلاف بغداد کے تھے۔ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور بے مثل قوت حافظہ ابتدائے عمر سے موجود تھی۔ ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں کتاب اللہ کے ساتھ فارسی کی چند ابتدائی کتابیں ختم کر کے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ چودہ سال کی عمر میں تقریباً تین سال ہزارہ کے مدارس میں رہ کے مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔ ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء میں دارالعلوم دیوبند آئے یہاں شیخ الہند اور دیگر اکابر سے تکمیل تعلیم کی۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء میں فراغت کے بعد حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوے اور سند حدیث لی، نیز باطنی فیوض و برکات سے مستفیض ہوے اور خلافت حاصل کی۔ ۱۳۱۵/ ۱۸۹۷ء میں مدرسہ امینیہ دہلی کا قیام عمل میں آیا، اپنے ہم سبق مولانا امین الدین گجراتی کے اصرار پر آپ وہاں صدر مدرس رہے۔ ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۳ء میں کشمیر چلے گئے، وہاں فیض عام کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، وہاں کچھ مدت قیام کیا اور حجاز کے کتب خانوں سے علمی پیاس بجھائی۔ ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں آپ دیوبند آئے، شیخ الہند نے آپ کو یہیں روک لیا۔ کئی سال تک بلا تن خواہ کتب حدیث کی تدریس میں مشغول رہے، اس عرصے میں آپ حافظ محمد احمد بن امام نانوتویؒ کے مہمان رہے۔ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں شیخ الہند نے سفر حجاز کا قصد کیا، تو جانشینی کا فخر آپ کو بخشا۔ دارالعلوم کی مسند صدارت پر تقریباً ۱۲ سال جلوہ افروز رہے۔ ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء کے اوائل میں دارالعلوم کے ←

شبیر احمد عثمانیؒ[۳۱] (۱۳۰۵-۱۳۶۹ھ/ ۱۸۸۷-۱۹۴۹ء) کے ارشد تلامذہ

← اہتمام سے بعض اختلافات کی وجہ سے فرائض صدارت سے دست کش ہو کے جنوبی ہند، ڈابھیل، گجرات کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء تک وہاں درس حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔ علامہ کشمیری وسعت نظر، قوت حافظ اور کثرت حفظ میں اپنے زمانے میں بے مثال تھے۔ علم حدیث، علم ادب، معقولات، شعر و سخن: سارے علوم میں بلا کی مہارت تھی، زہد و تقوی میں کامل تھے۔ آپ کے تلامذہ میں حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ ایسے مشاہیر شامل ہیں۔ بہت سی گراں مایہ کتابیں آپ کے قلم سے نکلیں، نیز آپ کے نامور تلامذہ نے آپ کے افادات کو مدون و شائع کیا اور علمی دنیا کے لیے اس خزانے کو محفوظ کر دیا۔

۳رصفر ۱۳۵۲ھ/ مطابق ۲رمئی ۱۹۳۳ء کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں دیوبند میں راہی ملک بقا ہوئے، عید گاہ کے قریب مدفون ہیں۔

(۳۱) علامہ شبیر احمد عثمانی بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی: زبان و قلم کے شہ سوار، ممتاز انشاء پرداز، محدث، مفسر اور زبردست سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔

۱۰رمحرم ۱۳۰۵ھ/ ۱۵راگست ۱۸۸۷ء کو بجنور میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید شروع کیا۔ اردو اور فارسی کی کتابیں مولانا محمد یاسین صاحب سے پڑھیں۔ ۱۰رربیع الثانی ۱۳۱۹ھ/ ۲۴رنومبر ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ شیخ الہند کے ممتاز ترین تلامذہ میں ہیں، انھی سے بیعت و اجازت حاصل تھی۔ فراغت کے بعد دہلی کے مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدر مدرس ہوئے۔ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں آپ کو وہاں سے دارالعلوم بلا لیا گیا۔ یہاں عرصے تک درجۂ علیا کی کتابیں پڑھائیں۔ آپ کے درس صحیح مسلم کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر آپ کی خاص نظر تھی۔ اہتمام سے اختلافات کے سبب ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۱۸ء میں علامہ کشمیریؒ اور مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندیؒ وغیرہ کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت چلے گئے۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۲ء میں جامعہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر کے اصرار پر دارالعلوم تشریف لائے، ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۴ء تک بہ حیثیت صدر مہتمم، دارالعلوم کی خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران جامعہ ڈابھیل سے بھی تعلق قائم رہا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کا شمار علم و فضل، فہم و فراست، تدبر اور اصابت رائے کے لحاظ سے ہندوستان کے چند مخصوص علما میں ہوتا تھا۔ وہ زبان و قلم دونوں کے بادشاہ تھے، اردو کے بلند پایہ اور سحر انگیز خطیب تھے۔ فصاحت و بلاغت، عام فہم دلائل، پر اثر تشبیہات، انداز بیان اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے ان کی تحریر و تقریر ←

میں تھے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد انجمن ''حمایت الاسلام'' امرتسر میں مبلغ کی حیثیت سے کچھ عرصے ملازمت کی۔ اپنے والد مولانا محمد اسماعیل کی وفات کی خبر سن کر، امرتسر سے کیرانے تشریف لائے، تو اہل خاندان کے اصرار پر کیرانہ میں مستقل قیام کا ارادہ کرلیا اور والد صاحب کی جاے داد، نیز جامع مسجد کی تولیت وغیرہ کی، والد صاحب والی ذمے داریاں سنبھالیں۔ وہ پورے انہماک سے انتظامی اور سیاسی امور میں مشغول ہوگئے۔ وقت کے تقاضے اور دین وملت کی خدمت کے جذبے کے تحت ان کا سیاسی انہماک بڑھتا گیا۔ ان کا گھر علما وزعما اور عمائدین ملت کا میزبان بن گیا، اکثر پارٹیوں کا دفتر بھی ان ہی کی زیرنگرانی ان ہی کے مکانات میں رہا۔ ۱۹۴۲ء میں جب انگریزی حکومت نے بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کیا، تو مولانا مسیح الزماںؒ اور اسی قصبے کے دوسرے سرگرم عالم مولانا احمد اللہ صاحبؒ بھی گرفتار ہوے اور دونوں ہی ایک ماہ کی جیل کی سزا کاٹ کے آئے۔ آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد، جو افراتفری کا عالم بپا ہوا، اس میں مولانا مسیح الزماںؒ نے مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے

← دونوں منفرد تھیں۔ علم الکلام، العقل والنقل، اعجاز القرآن، حجاب شرعی، الشہاب لرجم الخاطب المرتاب وغیرہ، ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے ترجمۂ قرآن مجید پر مولانا عثمانی کے تفسیری حواشی کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ علم حدیث میں ''فتح الملہم'' شرح صحیح مسلم حنفی نقطۂ نظر سے پہلی شرح ہے۔

علامہ عثمانی سیاسیات میں، شروع میں جمعیۃ علماء کے ہم خیال تھے: لیکن بعد میں متحدہ قومیت کے مسئلے پر، آپ کو اس سے اختلاف ہوا اور آپ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ رمضان ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں دستور پاکستان کے اجلاس میں شرکت کے لیے پاکستان تشریف لے گئے، آخر تک کراچی میں قیام رہا۔ ۲۱ رصفر ۱۳۶۹ھ = ۱۵ رنومبر ۱۹۴۹ء کو بھاول پور میں داعی اجل کو لبیک کہا اور کراچی میں سپرد خاک ہوے۔

اور پاکستان ہجرت کرنے سے روکنے کے لیے زبردست کوشش کی۔ صلح جو اور بھلائی پسند ہندوؤں کے تعاون سے مسلمانوں کی مختلف طریقوں سے خدمت کی۔

مولانا مسیح الزماںؒ ۱۴ چودہ بھائی بہن تھے۔ ان کے ایک دوسرے برادر خُرد مولانا بدیع الزماںؒ بھی فاضل دارالعلوم تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے مدبر و منتظم ورجال ساز معاون مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ [۳۲] (متوفی ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء) اور دارالعلوم کے پانچ

---

(۳۲) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند: منتظم و مدبر، ادیب ادیب گر تھے۔ رجال سازی میں خداداد صلاحیت کے مالک گزرے ہیں۔ سارے علم وفن شروع سے آخر تک دارالعلوم میں حاصل کیے۔ متبحر عالم اور عربی زبان کے بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کا تدبر و انتظام دارالعلوم کی تاریخ میں ضرب المثل سمجھا جاتا ہے۔ دارالعلوم کی ترقی میں ان کی خدمات اور خداداد صلاحیتوں کو بڑا دخل رہا ہے۔ ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۳ء میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے۔ ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء میں، دارالعلوم کے اس وقت کے مہتمم مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی مصروفیتوں اور اسفار کی وجہ سے، دارالعلوم کو ترقی دینے کے لیے، ایک منتظم شخص کی ضرورت شوریٰ کو شدت سے محسوس ہوئی، چناں چہ انکار کے باوجود مولانا عثمانی کو مجبور کر کے نیابتِ اہتمام کا منصب سپرد کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دارالعلوم کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو مولانا عثمانی جیسا بے دار مغز منتظم اور مخلص ہاتھ آ گیا۔ ان کو دارالعلوم کے انتظام و انصرام سے اتنا شغف تھا کہ ان کی سکونت بھی دارالاہتمام ہی میں تھی اور اسی میں وفات بھی پائی۔ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں حافظ محمد احمد صاحب اپنی پیرانہ سالی کے باعث حیدر آباد کے مفتی اعظم کے عہدے سے سبک دوش ہوئے، تو ان کی جگہ پر آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ عام خیال ہے کہ اگر مولانا عثمانی کو ملکی سیاست سے اتنا ہی شغف ہوتا جتنا دارالعلوم کے ساتھ تھا، تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے۔ مطالعے کی کثرت کی وجہ سے انتہائی وسیع المعلومات تھے۔ علامہ کشمیری فرمایا کرتے تھے: ''اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے، تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔'' ان کی تصانیف میں: ''اشاعت اسلام'' بڑی اہم کتاب ہے، یہ پانچ سو صفحات کی کتاب ہے، جس میں ان واقعات کو خوب صورتی سے جمع کیا گیا ہے جو اسلام کی ترقی و اشاعت کا ذریعہ بنے۔ دوسری اہم کتاب ''تعلیمات اسلام'' ہے۔

۴رجب ۱۳۴۸ھ = ۷ نومبر ۱۹۲۹ء کی شب میں اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔

دہائیوں کے عرصے کے مشہورِ عالَم مہتمم، جن کا گویا نام ہی "مہتمم" ہو گیا تھا یعنی حکیم الاسلام قاری محمد طیب (۳۳) (۱۳۱۵-۱۴۰۳ھ/ ۱۸۹۷-۱۹۸۳ء) بن حافظ احمد (۳۴) بن امام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے گھرانے سے

(۳۳) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب بن مولانا حافظ محمد احمد بن مولانا الامام محمد قاسم نانوتویؒ: ہندوستان کے دورِ آخر کے خطیبِ اعظم، علوم قاسمی کے امین، اسرار شریعت کے شارح اور تقریباً پانچ دہائیوں تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔

محرم ۱۳۱۵ھ/ مئی ۱۸۹۷ء، روز یک شنبہ دیوبند میں پیدا ہوئے، محمد طیب نام اور تاریخی نام مظفر الدین تھا۔ سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، دو سال میں حفظ قرآن مع قراءت و تجوید مکمل کیا۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء میں سند فضیلت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں شیخ الہند، حضرت تھانوی، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی، علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی ایسے اکابر دیوبند ہیں۔ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء میں شیخ الہند سے بیعت ہوئے، ان کی وفات کے بعد علامہ کشمیری سے رجوع کیا۔ ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں حضرت تھانوی سے خلافت حاصل کی۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء سے ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء تک مختلف فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ اوائل ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر تقرر ہوا، جس پر ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء تک فائز رہے۔ وسط ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے انتقال کے بعد آپ کو مہتمم کا عہدہ تفویض ہوا، اس وقت سے ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء تک آپ اس منصب کے لیے باعث عزت و افتخار رہے۔ اس طویل عرصے تک دارالعلوم کے اہتمام و انصرام کے علاوہ، آپ اپنی خطیبانہ اور عالمانہ و مفکرانہ لیاقت کے ذریعے پوری دنیا میں، دارالعلوم کی شہرت و عظمت کا باعث بنے۔ وعظ و خطابت میں آپ کو خداداد ملکہ حاصل تھا، خیالات و معانی: دونوں دست بستہ آپ کے حضور میں کھڑے رہتے تھے۔ اہم مسائل پر دو-دو، تین-تین گھنٹے مسلسل تقریر کرنے میں نہ آپ کو تکلف ہوتا نہ سامعین کو اکتاہٹ۔ حقائق و اسرار شریعت کے بیان میں طاق تھے۔ آپ ہی کے دور میں دارالعلوم کا بے نظیر جشن صد سالہ جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ مطابق مارچ ۱۹۸۰ء میں منعقد ہوا، جس میں کم و بیش ۳۰ لاکھ فرزندان توحید نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ تقریباً سو کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سائنس اور اسلام، اسلام میں اخلاق کا نظام، التشبہ فی الاسلام، حدیث کا قرآنی معیار وغیرہ ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں جب مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، تو بالاتفاق آپ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور آپ تاحیات اس منصب پر فائز رہے۔ ۶ر شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، مقبرہ قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

(۳۴) مولانا حافظ محمد احمدؒ: حضرت نانوتویؒ کے فرزند رشید اور دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم تھے۔ ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد والد ماجد نے ابتدائی تعلیم کے لیے ←

بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اتفاق کی بات کہ حضرت الاستاذؒ کے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی، سارے چچا اور پھوپھیاں انتقال کر گئیں۔ صرف تایا مولانا محمود الزماں صاحبؒ کو وہ دیکھ پائے، جن کا قیام ہمیشہ حیدر آباد میں رہا اور وہیں وفات پائی۔ ان کے ایک صاحب زادے ظہیر الزماں فوج کے بڑے عہدے دار تھے، وہ بھی وفات پا چکے۔ ان کی اولاد حیدر آباد ہی میں

← قصبہ ''گلاوٹھی''، ضلع بلند شہر بھیج دیا۔ وہاں حضرت نانوتوی کے قائم کردہ مدرسہ ''منبع العلوم'' میں کچھ عرصے تعلیم پائی، مزید تعلیم کے لیے مدرسہ شاہی مراد آباد بھیجے گئے، جہاں حضرت نانوتویؒ کے شاگرد رشید مولانا احمد حسن امروہیؒ پڑھاتے تھے۔ ان سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں، پھر دیو بند تشریف لائے اور شیخ الہند سے حدیث شریف پڑھی۔ ترمذی شریف کے چند سبق مولانا محمد یعقوب نانوتوی بن مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے پڑھے۔ دورۂ حدیث گنگوہ حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ درس میں پورا کیا، وہیں جلالین اور بیضاوی بھی پڑھی۔ ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء میں بہ حیثیت مدرس، دار العلوم میں تقرر ہوا۔ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں حضرت حاجی محمد عابد اہتمام سے مستعفی ہوئے، تو ایک ایک سال کے لیے حاجی فضل حق دیو بندی اور مولانا محمد منیر نانوتویؒ مہتمم رہے۔ ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء میں حضرت گنگوہیؒ نے مولانا احمد صاحب کو اس منصب پر فائز فرمایا۔ آپ کے دور اہتمام میں دار العلوم نے نمایاں ترقی کی، دار العلوم کی اہم عمارتیں، جن میں دار الحدیث شامل ہے آپ ہی کے دور میں بنیں۔ آپ ہی کے دور میں ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں دار العلوم میں زبردست جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا۔ انگریزی گورنمنٹ نے آپ کو ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا؛ لیکن اکابر کی روش کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کو واپس کر دیا۔ نظام دکن نے آپ کو ریاست کا مفتیٔ اعظم مقرر کیا۔ جس پر آپ ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۲ء سے ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء تک فائز رہے۔ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء میں نظام حیدر آباد کو دہلی اور دیو بند آنا تھا، وعدے کی یاد دہانی کے لیے آپ حیدر آباد تشریف لے گئے۔ جس وقت آپ حیدر آباد کا قصد فرما رہے تھے، طبیعت ناساز تھی؛ مگر دار العلوم کے مفاد کے لیے پرواہ نہ کی، حیدر آباد روانہ ہو گئے، وہاں پہنچ کے طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ انتظار رہا کہ طبیعت سنبھلے تو نظام سے ملاقات ہو؛ لیکن مرض بڑھتا گیا، تو متوسلین نے وہاں سے دیو بند واپس آ جانے کی رائے دی۔ واپسی کے قصد سے روانہ ہوئے، ابھی ٹرین حیدر آباد کے حدود ہی میں تھی، کہ نظام آباد اسٹیشن پر آپ نے ۳ / جمادی الاولی ۱۳۴۷ھ = ۱۹/ ستمبر ۱۹۲۸ء کو جان، جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ اگلے روز ۴/ جمادی الاولی کو نظام کے سرکاری مصارف پر قبرستان ''خطۂ صالحین'' میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ نے ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دیے اور ۱۰ سال دار العلوم میں مدرس رہے۔

رہتی ہے۔ تایا صاحب کی ایک ہی صاحب زادی تھیں جو مصنف ''تفسیر حقانی'' مولانا عبدالحق صاحبؒ[۳۵] (۱۲۶۷-۱۳۳۵ھ/ ۱۸۵۱-۱۹۲۶ء) کے صاحب زادے ابوالخیر کو منسوب تھیں۔

مولانا وحید الزماںؒ کے بھائی بہن

مولانا کے والد مولانا مسیح الزماںؒ کی پہلی شادی کیرانہ ہی کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی۔ پہلی اہلیہ سے دو لڑکے ہوے: فرید الزماں اور وحید الزماں، دونوں بارہ تیرہ سال کی عمر میں فوت ہو گئے اور ان کی والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دوسری شادی مولاناؒ کی والدہ سے ہوئی، جو ان کی ماموں زاد بہن اور جھنجھانے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں[۳۶] ان سے مولاناؒ کے

---

(۳۵) مولانا عبدالحق دہلوی مؤلفِ ''تفسیر حقانی'' اصلاً پنجاب کے شہر ''انبالہ'' کے گاؤں ''گمتھلہ'' کے رہنے والے تھے۔ کانپور، مراد آباد کے علمائے مشاہیر سے کسب علم کیا، پھر دہلی میں میاں سید نذیر حسین محدث سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ عرصے تک مدرسہ فتح پوری میں مدرس رہے۔ دہلی ہی میں بود و باش اختیار کیا۔ پھر تدریسی مشاغل سے کنارہ کش ہو کے تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔ ریاست حیدر آباد کی طرف سے باقاعدہ وظیفہ بھی جاری ہو گیا، جو اہل علم کے لیے جاری ہوا کرتا تھا۔

مولانا عبدالحق بڑے قادر الکلام، شیریں مقال، خوش مزاج، پاکیزہ طبیعت اور ملنسار آدمی تھے۔ آخری عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں استاذ ہوے۔ انگریزی سرکار کی طرف سے ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا۔ ۱۲ر جمادی الاول ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۰ر اگست ۱۹۲۶ء کو وفات پائی۔ ان کی مشہور تصنیف اردو میں تفسیر حقانی ہے، جس کا اصل نام ''فتح المنان فی تفسیر القرآن'' ہے۔ اس کے علاوہ اردو ہی میں اصول فقہ میں ''حسامی'' کا حاشیہ ''تعلیق نامی''، عقائد میں ''عقائد الاسلام'' اور علوم قرآن کے موضوع پر ''البرھان فی علوم القرآن'' بھی ان کی یادگار تصانیف ہیں۔

(۳۶) ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ/ دسمبر ۱۹۸۲ء کو مرحومہ نے دیوبند میں رحلت کی اور یہیں مقبرۂ قاسمیہ میں سپرد خاک ہوئیں۔

علاوہ سات بھائی ہوے۔ دو بھائیوں کا انتقال پیدائش کے بعد ہی ہو گیا، جب کہ ایک بھائی کا انتقال بارہ سال کی عمر میں ٹائیفائڈ سے ہوا۔ باقی پانچ بھائی بالترتیب اس طرح تھے: مولانا وحید الزماںؒ، حافظ حمید الزماں، مولانا عمید الزماں، مولانا ڈاکٹر معید الزماں، جناب فرید الزماں۔ (۳۷)

حافظ حمید الزماں صاحبؒ جو بڑے حوصلہ مند، جید حافظ قرآن اور درس نظامی کے ایک بڑے حصے کی تکمیل کر چکے تھے؛ خوش گفتاری، سلیقہ مندی، خاندانی شرافت اور رواداری میں اپنے بھائیوں ہی کی طرح بے مثال تھے۔ افسوس ہے کہ وہ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماںؒ سے پانچ سال قبل ہی اللہ کے جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ (۳۸)

---

(۳۷) آخری تینوں برادران اور دیگر پس ماندگان کے تذکرے کے لیے پڑھیے کتاب کا عنوان ''مولاناؒ کے پس ماندگان''

(۳۸) عجب اتفاق کہ ان کا انتقال ٹھیک اسی ماہ، اسی تاریخ، اسی دن ہوا: یعنی ۱۵ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ بہ روز ہفتہ مطابق ۱۵ مئی ۱۹۹۰ء کو ہوا۔ حافظ حمید الزماں مرحوم حضرت الاستاذ سے دو سال چھوٹے اور دیگر بھائی بہنوں سے بڑے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا وحید الزماںؒ اور دیگر بھائیوں کی ترقی اور عروج میں دیگر اسباب ومحرکات کے ساتھ ساتھ، مرحوم حافظ حمید الزماں صاحب کے ایثار واخلاص اور محبت وجذبۂ خدمت کو بڑا دخل تھا۔ مولانا کے اہل خانہ کو جب معاشی تنگی کا سامنا ہوا -- کیوں کہ زمین داری کا خاتمہ ہو چکا تھا اور خاندانی رہن سہن اور رکھ رکھاؤ میں کوئی فرق نہ آیا تھا — تو مولاناؒ کے بعد سب بھائیوں میں بڑے ہونے کی وجہ سے، مولاناؒ کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمے داریوں کا بوجھ انھیں بھی اٹھانا پڑا۔ انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھائی۔ اپنی تعلیم کا سلسلہ بند کر کے مکمل طور پر کسب معاش میں لگ گئے۔ اس طرح ایک طرف بڑے بھائی کا بوجھ کم ہوا اور تصنیفی وتعلیمی کاموں کے لیے قدرے یک سوئی ہوئی، دوسری طرف دیگر برادرانِ خرد کو تعلیمی ترقی کے مواقع ملے۔ مولانا نے اپنے علم وفکر کی تابانی سے ایک جہان کو روشن کیا اور دیگر برادران نے دینی وعصری آگہی کے ذریعے آبرومندانہ اور قابل رشک ترقی کے منازل طے کیے۔ دہلی کے ماحول سے گھبرا کر انھوں نے آخر عمر میں دیوبند کو وطن بنا لیا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے بالکل متصل رہائش ←

مولانا ؒ کے والد ؒ کی تیسری شادی گاؤں ''پرسولی''، ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی، ان مرحومہ سے ایک ہمشیرہ پیدا ہوئیں، جو الحمد للہ بہ قید حیات ہیں، وہ مرحوم مولانا غیاث الحسن صاحب مظاہری کو منسوب تھیں، جو کوچہ ناہر خاں (کوچہ چیلان) دہلی سے ماہ نامہ دینی مدارس نکالا کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ مولانا ؒ کی رحلت کے تقریباً چھ ماہ بعد ہی وہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔(۳۹)

بچپن اور ابتدائی و متوسط تعلیم

کہا جاتا ہے ''ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات'' (۴۰) کہ ہونہار بچے کے آثار پہلے ہی سے اچھے نظر آتے ہیں۔ مولانا ؒ کی خوبیوں اور صلاحیتوں نے جو بعد کی زندگی میں بال و پر نکالے، ان کے آثار بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے تھے۔ مولانا کے برادر خرد حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ مولانا ؒ بچپن میں کبڈی، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی اور اس طرح کے دیگر کھیلوں

← اختیار کرلی تھی؛ لیکن ایک سال بھی نہ گزار پائے تھے کہ مختصر علالت کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہاں یہ قابل ذکر ہے کہ حافظ حمید الزماں صاحب مرحوم کی شادی علامۂ یگانہ مفتی کفایت اللہ ؒ (۱۲۹۲-۱۳۷۲ھ / ۱۸۷۵-۱۹۵۲ء) کی پوتی یعنی مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف دہلوی ؒ (متوفی ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء) سابق مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی، وہ الحمد للہ بہ قید حیات ہیں، دہلی میں خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔

(۳۹) شکر کے مرض کی شدت کی وجہ سے ۲۶/ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۳/ ستمبر ۱۹۹۵ء کو انتقال ہوا۔ مزید حالات کے لیے دیکھیے کتاب کا عنوان ''مولانا ؒ کے پس ماندگان''

(۴۰) ''بِروا'': پودا، درخت۔ یعنی اچھے درخت یا پودے کے پتے شروع سے ہی اچھے اور خوب صورت نکلتے ہیں۔ یہ ایک مثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قابلیت اور لیاقت والے بچے، شروع سے ہی اچھے احوال و آثار کے مالک ہوتے ہیں جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آگے چل کے یہ بڑی شان کے مالک ہوں گے۔

میں — جن میں عام طور پر بچے لگے رہتے ہیں — کوئی دل چسپی نہ رکھتے تھے؛ بل کہ ان کی دل چسپی کا کھیل یہ تھا کہ وہ کاغذ پر مکانات کے نقشے بناتے، قینچی سے خوب صورت مساجد اور تعمیرات کے فوٹو تراشتے اور اچھے اچھے ڈیزائن تیار کرتے۔ ایک مرتبہ اپنے ہاتھ سے مٹی کے ٹوٹے ہوے برتنوں کو تراش تراش کے اینٹیں بنائیں اور ان سے گھر میں چھوٹا سا کمرہ تیار کیا، جو بہت پیارا اور خوب صورت تھا۔ مولانا کے والد مرحوم کے پاس علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی آمد و رفت رہتی تھی، جب علامہ عثمانیؒ نے مولانا کا بنایا ہوا کمرہ دیکھا، تو بہت تعجب کیا کہ یہ کم سنی اور اتنی فن کاری۔

مولانا نے بعد میں فن تعمیر میں جو جوہر دکھایا، صد سالہ اجلاس کے موقع سے اور حالیہ انتظامیۂ دار العلوم کے زمانے میں عمارتوں کی جو حسن کاری کی، کم سے کم جگہ میں وہ جس ڈھنگ اور کم سے کم خرچ کی عمارتوں کی تعمیر کا سلیقہ رکھتے تھے؛ اس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے انھیں گویا بچپن ہی سے عطا کر دی تھی۔

بچپن میں مولاناؒ نے خواب میں دیکھا کہ میں کیرانے کی جامع مسجد کے حوض میں وضو کر رہا ہوں اور حوض سے روئی کے گالے اُبل اُبل کر آسمان پر پھیل گئے۔ والدہ صاحبہ کے سامنے خواب بیان کیا، انھوں نے اس کا تذکرہ اپنے بھائی حافظ محمد عیسیٰ مرحوم سے کیا، انھوں نے تعبیر بتائی کہ اس بچے کے علم سے ایک دنیا فیض یاب ہوگی۔(۴۱) لائق ذکر ہے کہ حافظ محمد عیسیٰ مرحوم متقی اور

(۴۱) مولانا محمد رفعت قاسمی: ترجمان دار العلوم، مولانا کیرانویؒ نمبر۔

خوش اوقات بزرگ تھے، جھنجھانہ کے باشندے تھے۔ جھنجھانے کی خاک میں اللہ نے صلاح وتقویٰ کی خصوصی صلاحیت ودیعت کی ہے؛ کیوں کہ وہ خالق ارض وسما ہے، جانتا ہے کہ کہاں کون سی بھلائی پنپ سکتی ہے۔

مولاناؒ کے علم وفکر سے مدرسوں کے ماحول کا جس طرح زنگ دور ہوا، علما وفضلا کی جماعت کو جو خصوصی فیض پہنچا، تعلیم وتربیت کی جو طرح انھوں نے ڈالی، جمود وتعطل کو جس طرح کافور کیا، نسلِ نو کو جو سلیقہ وطریقہ اور زندگی کی استواری اور علم وادب کی آب یاری کا فن سکھایا؛ کہا جا سکتا ہے کہ خواب نے سوفی صد حقیقت کا روپ دکھایا۔ خواہ کچھ انکار شعار طبیعتوں کو خوابوں کی باتوں سے الرجی ہو؛ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ مولانا وحید الزماںؒ نے اپنی منفردانہ تعلیم وتربیت کا، ایک پوری نسل پر لازوال نقش چھوڑا ہے، جس کا دوست اور دشمن دونوں کو یک ساں طور پر اعتراف ہے۔

مولاناؒ نے حفظ قرآنِ پاک اور ابتدائی تعلیم کیرانہ اور جھنجھانہ میں حاصل کی۔ فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھ رہے تھے کہ آپ کو آپ کے ماموں حافظ محمد واحد علی صاحب اپنے ساتھ حیدرآباد لے گئے۔ وہاں علامہ مامون دمشقی (۴۲) سے عربی زبان کے حصول کا موقع ملا، جس میں مولانا کے لیے تصنیف وتعلیم کے حوالے سے طاق ہونا خدا کی طرف سے مقدر تھا۔ علامہ مامون دمشقی بڑے عالم، فصیح اللسان اور فہم وفراست کے مالک تھے۔ وہ جلد ہی تاڑ گئے کہ لڑکا وحید الزماں غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ ان کو اس کا

---

(۴۲) ان کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

بھی احساس تھا کہ ہندوستان میں علما تو بہت ہیں؛ لیکن عربی زبان پر خاطر خواہ اور نتیجہ خیز قدرت رکھنے والے شاید و باید ہیں؛ اس لیے انھوں نے مولاناؒ کو خصوصی دل چسپی کے ساتھ، عربی زبان سکھانے کی ذمے داری لی۔ تھوڑے ہی عرصے میں کسی خاص نظام و نصاب کے بغیر، مولاناؒ نے عربی بولنے اور لکھنے پر، یک گونہ قدرت حاصل کرلی۔ مامون صاحب کا یہ کمال بہ طور خاص ریکارڈ کرنے کے لائق ہے کہ انھوں نے مولاناؒ کو عربی کا ایسا شگفتہ، صحیح اور اوریجنل (Original) لب ولہجہ دیا کہ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کسی ہندی نژاد کو اتنے صحیح لب و لہجے میں ایسے وقار و تمکنت کے ساتھ عربی بولتے ہوئے دیکھا ہو۔

لیکن چوں کہ مولاناؒ کا سفر حیدرآباد ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں، اس وقت ہوا جب تحریک آزادی زوروں پر تھی، ہر جگہ ''ہندوستان چھوڑو'' کی صدا بلند ہورہی تھی۔ پھر ملک آزاد ہوا اور ریاست حیدرآباد بہ طور خاص تباہ ہوئی، اس لیے اب وہاں تعلیم و تعلم کا کوئی نظم مولاناؒ کے لیے قائم نہ رہ سکا اور وہ وطن کیرانہ واپس آگئے۔ ''خودنوشت سوانح کے چند اوراق'' میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں نے اپنی آنکھوں سے سابقہ ریاست کا حال اور نظام دکن کا دبدبہ بھی دیکھا اور پھر یہ اندوہ ناک منظر بھی دیکھا، جو کسی مفتوحہ علاقے کا ہوتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں وطن زیادہ یاد آنے لگا اور جلد سے جلد وطن پہنچنے کی خواہش بڑھنے لگی۔ مگر راستے پر خطر اور انتہائی

مخدوش تھے۔ اب یہاں منظّم یا غیر منظّم کسی تعلیم کا بھی، میرے لیے کوئی بندوبست نہ تھا، اِدھر وطن کے حالات کی تفصیل بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ میں روزانہ آصفیہ لائبریری جاتا اور وہاں ''مدینہ'' اخبار (۴۳) جو بجنور سے نکلتا تھا اس کا متلاشی رہتا، اس سے اپنے وطن کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔''

ابتدائی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مولانا نے ''خودنوشت سوانح کے چند اوراق'' میں جو کچھ لکھا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بعینہٖ درج کردیا جائے، کہ اس سے حالات و واقعات پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔ مولاناؒ

---

(۴۳) ''مدینہ'' اخبار شہر ''بجنور'' اتر پردیش سے ۱۲ر جمادی الثانیہ ۱۳۳۰ھ مطابق یکم مئی ۱۹۱۲ء سے نکلنا شروع ہوا۔ ابتدا میں اس کی اشاعت ہفتے میں ایک بار تھی؛ لیکن ۵ر ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۱۷ء سے، مقبولیت کی بنا پر اسے ہفتے میں دو بار شائع کیا جانے لگا۔ اس کے مالک محمد مجید حسن بجنوری (متوفی صبح جمعہ ۲۵ر شعبان ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۶۶ء بہ عمر ۸۵ سال بہ عارضۂ فالج) تھے۔ ''مدینہ'' اخبار نے مسلمانوں کے انگریز مخالف نظریات کو پختہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ بیسویں صدی کا اہم اخبار تھا۔ مولانا حسرت موہانی (۱۲۹۸-۱۳۷۰ھ/۱۸۸۰-۱۹۵۱ء) کے ''اردوئے معلّٰی'' کے بعد فرنگی حکومت کی سب سے زیادہ نظر ''مدینہ'' اخبار پر تھی؛ چناں چہ یہ بار بار اس کے عتاب کا شکار ہوتا رہا؛ لیکن اس کے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی۔ رولٹ ایکٹ اور ''جلیان والا باغ'' حادثوں پر ''مدینہ'' اخبار نے جو خبریں شائع کیں، اس کی وجہ سے پنجاب میں اس کی فروخت پر پابندی عائد کردی گئی؛ چناں چہ ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۷ر اگست ۱۹۱۹ء کے بعد عرصے تک اس کو ''یثرب'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ ''مدینہ'' کی پیشانی پر ہمیشہ یہ شعر رقم ہوتا تھا:

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں ۔۔۔ مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

اشاعت کے اختتام کے وقت بھی اس کی اشاعت ۴۰ چالیس ہزار تھی۔ قابل ذکر ہے کہ مولانا آزاد (۱۳۰۵-۱۳۷۷ھ/۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) کے ''الہلال'' و ''البلاغ'' اور مولانا محمد علی جوہر (۱۲۹۵-۱۳۴۹ھ/۱۸۷۸-۱۹۳۱ء) کے ''ہمدرد'' کا شمار، اخبار ''مدینہ'' کے بعد ہوا کرتا تھا۔

نے ''زمانۂ تعلیم وتربیت'' کے عنوان کے تحت اپنی زندگی کے اس مرحلے پر، اس طرح روشنی ڈالی ہے:

زمانۂ تعلیم وتربیت

''ہمارے گھرانے کا طریقہ یہ رہا ہے کہ پہلے بچوں کا حفظ قرآن کرانا اور پھر ضروری دُنیوی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم دلانا۔ والد صاحب نے ہم سب بھائیوں کی تعلیم کا یہی طریقہ اختیار کیا۔

حفظ قرآن

جامع مسجد کیرانہ میں قرآن پاک کی تعلیم (زیادہ تر حفظ) کے دو مکتب تھے۔ یہ والد صاحب کے زیر اہتمام چلتے تھے۔ دونوں مکتبوں میں پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد، دوسو سے زائد رہتی تھی اور ان کو پڑھانے کے لیے صرف دو حافظ مقرر تھے: (۱) حافظ ہدایت اللہ صاحب اور (۲) حافظ رحمت اللہ صاحب۔ دونوں استاذ غیر معمولی محنت کرتے تھے اور ہر ایک کو سو طلبہ کا روزانہ سبق سننا اور نیا سبق پڑھانا اور بلا ناغہ شام کو سب کا آموختہ سننا ضروری ہوتا۔ اخفا، اظہار وغیرہ: تجوید کے ضروری قواعد کے ساتھ تعلیم ہوتی تھی۔ تعداد پڑھنے والوں کی زیادہ ہوتی تھی اور تنہا سب کا آموختہ سننا ناممکن تھا؛ اس لیے طریقہ یہ تھا کہ ایک لڑکا حافظ صاحب کے سامنے بیٹھ کر سناتا اور تین یا چار جٹیں بنا دی جاتی

تھیں، یعنی تین لڑکوں کا آموختہ حافظ صاحب کے گرد بیٹھ کر تین حافظ، طلبہ ہی میں سے سنتے تھے۔ حافظ صاحب کے چوکنا پن اور محنت وتوجہ کا یہ عالم تھا کہ وہ بہ طور خاص ایک لڑکے کا آموختہ خود سنتے اور اس کے ساتھ ہر جٹ کی طرف بھی مسلسل کان لگائے رہتے۔ اگر کسی سے مد بھی چھوٹ گیا، تو کیا مجال کہ وہ بچ کر نکل جائے، فوراً ٹوکتے اور اصلاح کرتے، کبھی کبھی پٹائی بھی کی جاتی تھی۔ دونوں حافظ صاحبان روزانہ کم ازکم آٹھ گھنٹے پورے انہماک کے ساتھ پڑھاتے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر سال حفاظ کی ایک بڑی تعداد تیار ہوتی تھی۔ رمضان مبارک میں قرآن پاک سُنانے والوں کی کثرت کے باعث، مساجد کی کثرت کے باوجود، قلت ہوجاتی تھی۔ ایک ایک مسجد میں بسا اوقات کئی کئی حافظ باری باری سناتے تھے۔

ہمارے دونوں مکتبوں کا طریقہ یہ تھا کہ ماہ رمضان میں دوپہر کی چھٹی نہیں ہوتی تھی، صبح سے آکر عصر کے بعد چھٹی ملتی تھی اور بعد نماز مغرب نفلوں میں قرآن پاک سنانے کے لیے، حفظ کے تمام طلبہ کو آنا لازمی تھا۔ پرانے حفاظ جو فارغ ہوکر جاچکے ہوتے تھے، وہ ماہ رمضان میں مکتب آنا شروع کردیتے تھے۔ تمام جامع مسجد، حفاظ سے بھری رہتی تھی اور بعد نماز مغرب عجب قسم کی روحانی برکت، چہل پہل اور رونق رہتی تھی۔ قدیم حفاظ، زیر تعلیم لڑکوں کا قرآن نفلوں میں سنتے تھے۔ حافظ صاحب، ہر ایک کے پیچھے کھڑے ہوکر سنتے اور غلطی پر ٹوکتے تھے:

اس لیے پڑھنے اور سننے والے سب ہی متنبہ رہتے تھے۔

ان دونوں مکتبوں کے لیے، جن میں پڑھنے والوں کی تعداد، دوسو سے زائد ہوتی تھی، کبھی کوئی عمومی یا بیرونی چندہ نہیں کیا گیا۔ مقامی کچھ لوگ ماہانہ تھوڑا تھوڑا عطیہ دیتے تھے اور مستطیع بچوں سے چار آنہ فیس لی جاتی تھی۔ فیس اور عطیاتِ معینہ کی وصول یابی کا کام بھی، دونوں حافظ صاحبان کے سپرد تھا۔ بعد میں جب اخراجات بڑھے، تب بھی والد صاحب نے کوئی عمومی چندہ نہیں کیا، اس کے بہ جائے ایک مختصر اور کام یاب اسکیم یہ چلائی کہ فارغ ہونے والوں کی بڑی تعداد تھی اور ان میں سے بہت سے کیرانہ کے باہر اچھے روزگار پر تھے، ان سے مراسلت کرکے مدرسے کے لیے، اعانت کی اپیل کی گئی، جس سے اتنی آمدنی ہونے لگی، کہ مقامی فیس وعطیات دونوں ملاکر دونوں مکتبوں کا خرچ پورا ہونے لگا۔

آج عام طور پر یہ حال ہے کہ اگر کسی مدرسے میں سو ڈیڑھ سو بچے، حفظ قرآن وناظرہ کے زیر تعلیم ہوں، تو ان کے لیے کم سے کم چھ معلم درکار ہوں گے اور چندے کا میدان اتنا وسیع کردیا جاتا ہے، کہ ہندوستان کی حدوں کو پار کرکے آدمی دیگر ممالک تک پہنچ جاتا ہے۔ اخلاص کم ہوتا جارہا ہے۔ مدارس ومکاتب کے نام پر اتنی بڑی رقمیں حاصل کی جاتی ہیں، جن سے بڑے بڑے کام انجام دیے جاسکتے ہیں۔ جو مدارس ومکاتب اخلاص، لگن اور نیک نیتی کے ساتھ تعلیمی جدوجہد

کر رہے ہیں، وہ ضرورت بھر مالی فراہمی پر اکتفا کر لیتے ہیں؛ لیکن جن کے یہاں تعلیم کی کوئی اہمیت یا اس کا کوئی معیار نہیں، وہ حصولِ زر کے لیے، زیادہ بے چین اور کوشاں رہتے ہیں۔ جھوٹ اور فریب کاری سے دریغ نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ ہم سب کو نیک نیتی اور اخلاص و قناعت کے ساتھ دینی اور تعلیمی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

مکتب میں قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے، گھر پر پڑھنا اور یاد کرنا ضروری ہوتا ہے؛ مگر مجھے اور ایسے ہی چھوٹے بھائیوں کو گھر پر مہمانوں کی بہ کثرت آمد کی بنا پر، یاد کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا؛ اس لیے قرآن پاک میں پختگی پیدا نہ ہو سکی۔ زمانۂ حفظِ قرآن میں والد صاحب نے ایک ماسٹر صاحب کو اردو حساب وغیرہ پڑھانے کے لیے مقرر کر دیا تھا، جس سے فائدہ ہوا۔ قرآنِ پاک حفظ کرنے اور دُہرانے کے بعد کیرانہ میں پانچ سال تک تراویح میں قرآن مجید سنایا۔ اس دوران والد صاحب نے درجہ فارسی و عربی بھی قائم کر دیا تھا۔ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب کے صاحب زادے مولانا محمد خالد صاحب دارالعلوم سے فارغ ہو کر پہنچے، تو ان کو استاد مقرر کیا گیا۔ انھوں نے اپنے والد صاحب کی اجازت سے، بلاتن خواہ پڑھانا شروع کیا۔ ہم تین ساتھی تھے، ایک ساتھ فارسی شروع کی اور گلستاں و بوستاں کے بعد، عربی کی تعلیم شروع ہو گئی۔ گلستاں اور بوستاں والے سال ہمارے مدرسے میں، ایک ہندو ماسٹر مولانا محمد خالد صاحب سے ایک عربی کتاب

پڑھنے آتے تھے، کسی امتحان کے نصاب میں وہ داخل تھی اور اس میں چھوٹے چھوٹے عربی کے جملے تھے۔ ہم جب ان جملوں کا ترجمہ سنتے تو یہ شوق بڑھتا کہ آئندہ، ہم عربی کی کوئی ایسی ہی کتاب پڑھیں گے اور ہمیں عربی بولنا آئے گا؛ لیکن جب عربی کا پہلا سال شروع ہوا اور میزان منشعب اور پھر پنج گنج، علم الصیغہ وغیرہ کتابیں سامنے آئیں، تو ساری خوشی کافور ہوگئی اور دماغ پہ عجیب قسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا؛ اس لیے کہ ہر کتاب میں مشکل گردانوں اور مشکل ترین تعلیلات وغیرہ کے ذکر کے علاوہ، کوئی دل چسپی کی چیز نہ تھی۔ بانون ثقیلہ کی گردان تو بہت ثقیل اور بہ ظاہر بے سود معلوم ہوتی تھی۔ میرے دونوں ساتھی کم زور تھے، وہ اکثر گردانوں کا صحیح تلفظ اور پوری ادائےگی بھی نہ کر پاتے تھے اور نہ انھیں گردانیں یاد ہوتی تھیں۔ روزانہ ہی ان دونوں کی پٹائی ہوتی تھی اور کبھی کبھی ان کی غلطیوں پر سب کو ہنسی بھی آجاتی تھی۔ خدا خدا کر کے گردان والی کتابوں کا سلسلہ ختم ہوا اور نور الایضاح، قدوری وغیرہ کا درس شروع ہوا۔ ہمارے استاد محترم مولانا محمد خالد صاحب، باوجودے کہ تن خواہ نہیں لیتے تھے؛ لیکن انتہائی پابندی وقت کے ساتھ مدرسے کے ضابطے کے مطابق، دل چسپی اور محنت سے پڑھاتے تھے؛ چوں کہ والد صاحب انتظامی معاملات میں سخت تھے، بے ضابطگی گوارا نہ تھی؛ مولانا خالد صاحب سے انھوں نے وضاحت سے فرمایا تھا، کہ آپ تن خواہ لیں یا نہ لیں؛ لیکن تعلیم و تدریس باضابطہ ہوگی۔ استاد

صاحب نے اس بات کو پورے طور پر نبھایا۔ وہ ایک بڑے کاشت کار عالم کے بیٹے تھے، موسم سرما میں کبھی کبھی رات میں کھیت کو پانی دیئے جانے کی ایک ایک ہفتے تک باری رہتی، تو مولانا خالد صاحب کو پوری رات کھیت پر رہنا ہوتا تھا، وہ قدوری وغیرہ ساتھ لے جاتے اور کھیت پر مطالعہ کر کے سبق کی تیاری کرتے، علی الصباح پہلے گھنٹے میں آ کر درس دیتے، پھر کچھ آرام کرتے تھے۔ وہ تا دمِ تحریر بہ قید حیات ہیں، ان کے دو صاحب زادے دار العلوم سے فارغ ہوکر کاشت کاری میں مشغول اور خوش حال ہیں۔

سفرِ حیدر آباد

''کیرانہ میں قدوری وغیرہ کا درس جاری تھا، کہ اِس دوران میری والدہ کے چچازاد بھائی، یعنی میرے ماموں اور والد صاحب کی طرف سے چچا: حافظ واحد علی، جو دین دار متشرع اور انگریزی تعلیم یافتہ تھے؛ کیرانہ آئے، انگریزی زبان پر ان کو بڑی قدرت اور بڑا عبور تھا، بڑی روانی کے ساتھ فصیح و بلیغ انگریزی بولتے تھے۔ حیدر آباد میں ان کا قیام تھا۔ اتفاقاً اس محلے میں جہاں ان کا قیام تھا (محلّہ نام پلی نزد ریلوے اسٹیشن) وہاں ایک شامی عالم، جو سات زبانیں جانتے تھے اور مختلف مما لک میں رہ چکے تھے، وہ مسجد کے ایک کوارٹر میں آ کر مقیم ہو گئے اور انھوں نے مسجد میں ایک گھنٹہ عربی زبان کا درس دینا شروع کیا۔ حافظ واحد علی صاحب

نے بھی ان سے عربی پڑھ کر تھوڑے ہی دنوں میں عربی بولنا شروع کر دیا۔ جب وہ کیرانہ آئے، تو میں مدرسے میں تھا جیسے ہی مکان پر پہنچا، تو انھوں نے سلام کے بعد عربی لہجے میں کَیْفَ حَالُكَ يَا وَلَدُ وغیرہ جملوں سے عربی میں سوال کرنے شروع کیے۔ مجھے بڑی پریشانی کا سامنا ہوا اور فوراً پنج گنج اور علم الصیغہ کی گردانیں ذہن میں گھومنے لگیں؛ مگر ان سے جواب دینے کا کام نہ چلا، میں لا اور نعم بھی نہ کہہ سکا۔ بڑی شرمندگی بھی ہوئی؟ ماموں صاحب نے والد صاحب پر زور دیا کہ وہ مجھے حیدر آباد برائے تعلیم لے جانے کی اجازت دے دیں۔ والد صاحب نے اجازت دے دی اور ایک ماہ کے بعد میں ان کے ساتھ حیدر آباد (دکن) کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں ریل کے سفر میں آج کل جیسی سہولتیں نہ تھیں، دہلی سے جو گاڑی مدراس جاتی تھی، اس میں ایک بوگی حیدر آباد کے لیے لگائی جاتی تھی، جو قاضی پیٹ اسٹیشن پر کاٹ کر، نظام اسٹیٹ ریلوے سے جڑ کر، حیدر آباد پہنچتی تھی۔ ہم دہلی سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے۔ بوگی چوں کہ ایک ہی تھی اور مسافر زیادہ تھے؛ اس لیے پورے راستے کھڑکی کے پاس اٹھتے بیٹھتے سفر پورا کیا اور تیسرے دن گیارہ بجے حیدر آباد پہنچے۔

علامہ المامون الدمشقی : ایک معمر بزرگ اور سات زبانوں سے واقف تھے؛ مگر اُن کی زندگی ایک معمہ تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ اپنی اولاد و اہل خانہ سے الگ ہو کر، مختلف ملکوں میں زندگی کیوں گزار

رہے ہیں۔ بڑے زیرک، قیافہ شناس تھے، اڑتی چڑیا کو پہچان لیتے تھے۔ ان کا قیام مسجد نام پلی کے ایک کوارٹر میں تھا۔ بہت با اخلاق، بہترین ادیب وشاعر، غیر مسلموں میں کام یاب مبلغ اور انتہائی ملنسار و خوش گفتار تھے۔ زندگی نہایت سادہ و درویشانہ تھی۔ تعلقات کا دائرہ وسیع رکھتے تھے۔ قریب کی ایک مسجد میں ایک گھنٹہ عربی زبان کا درس دیتے تھے۔ میں بھی اس میں شریک رہا، درس کا کوئی باضابطہ نظام نہ تھا اور کوئی کتاب مقرر نہ تھی۔ تختۂ سیاہ پر کچھ جملے وغیرہ لکھ کر اس کی مشق کراتے تھے۔ میں روزانہ ناشتے کے وقت ان کے مکان پر جاتا ان کے ناشتے کے دوران مختلف سوالات کرتا، کبھی کتاب اٹھا کر اس کا کچھ حصہ پڑھتا اور کبھی صرف ان کی باتیں سنتا۔ یہ سلسلہ بھی غیر منظم تھا، ان کا ناشتہ بھی عجیب تھا: خشک روٹی کو پانی میں بھگولیا کچھ گڑ اور پنیر اور اسی طرح کی معمولی چیزیں ہوتی تھیں۔ گڑ شوق سے کھاتے تھے اور اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد ان کا معمول تھا کہ وہ دس بجے کے قریب مکان سے نکلتے اور مختلف اداروں اور دفتروں میں جا کر لوگوں سے ملاقاتیں کرتے۔ ہمیشہ فصیح و بلیغ عربی بولتے اور دوسروں کو حتی کہ بڑے بڑے عربی باشندوں کو لغت فصحیٰ بولنے کی تاکید کرتے۔ لغت عامیہ بولنے والوں کو ٹوکتے اور کہتے کہ لَا تُفْسِدُوا اللُّغَةَ الْعَرَبِيَّةَ ۔ میں ایک ماہ ان کے ساتھ صبح سے شام تک رہا، ہر جگہ پیدل جاتے تھے، میں تھک جاتا تھا؛ مگر وہ نہ تھکتے تھے۔ ان کی گفتگو کو

غور سے سنتا اور ان کے جملوں کو محل استعمال کے ساتھ ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کوئی جملہ بنا کر اس کی تصحیح وتصویب چاہتا، کبھی تو بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے: "اَنتَ فُقتَ العَرَب" اور کبھی ہنستے اور کہتے "اَنتَ لَا تَعرِفُ العَرَبِیَّۃَ .

حیدر آباد کی نشر گاہ (ریڈیو اسٹیشن) پر کچھ عرصے کے لیے وہ مترجم واناؤنسر مقرر ہوے، تو اصل خبریں اردو زبان میں ہوتی تھیں اور ان کا ترجمہ عربی میں کرنا ہوتا تھا۔ انھیں اردو کے بعض محاورات کو سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی؛ اس لیے مجھے ساتھ لے جاتے تھے۔ مجھے ان کی چند روزہ معیت سے بڑا فائدہ ہوا اور عربی زبان دانی کا سراغ مل گیا۔ ابھی چند ہی ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ اعلان آزادی سے قبل ۱۹۴۷ء میں حالات پے چیدہ ہونے لگے، علاوہ ازیں علامہ المامون الدمشقی جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر مقرر ہو گئے اور نام پلی سے مسافت طویل ہونے کے سبب استفادے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تقسیم ہند کے بعد علامہ مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دو سال مقیم رہے اور بعد میں دہلی منتقل ہو گئے۔ دونوں جگہ ان سے میری ملاقات رہی، دہلی ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون" (۴۴)

دار العلوم دیوبند میں داخلہ اور اعلیٰ تعلیم

شوال ۱۳۶۷ھ = اگست ۱۹۴۸ء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے، عالمِ اسلام کی

(۴۴) "خود نوشت سوانح کے چند اوراق"، ترجمان دار العلوم۔

ممتاز ترین اسلامی تعلیم گاہ: دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ یہاں متوسطات اور درجۂ علیا کی تمام کتابیں، علم وفن کے ماہر اساتذہ سے پڑھیں۔ دورۂ حدیث شریف ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی[۴۵] (۱۲۹۶-۱۳۷۷ھ/ ۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) علامہ ابراہیم

(۴۵) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی: شیخ الہند کے خصوصی شاگرد، حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ، دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین وشیخ الحدیث، جمعیۃ علمائے ہند کے صدر، عظیم محدث، مجاہد اور صاحب عزیمت عالم باعمل تھے۔

۱۹؍شوال ۱۲۹۶ھ= ۸؍ستمبر ۱۸۷۹ء کو ''بانگرمئو'' ضلع اناؤ میں ولادت ہوئی، جہاں والد ماجد سید حبیب اللہ ہیڈ ماسٹر تھے۔ تاریخی نام ''چراغ محمد'' تھا۔ والد محترم شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے دست گرفتہ تھے۔ ابتدائی تعلیم وطنِ مالوف ''الہ داد پور'' ٹانڈہ فیض آباد میں ہوئی۔ ۱۴ سال کی عمر میں ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی درجات میں داخل ہوئے اور تمام مروجہ علوم کی تحصیل کی؛ لیکن خصوصی طور پر شیخ الہند کے عنایات والطاف سے بہرہ ور رہے۔ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۳۱۶ھ میں والد محترم سارے اہل خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کرگئے، آپ ان کے ہم راہ تھے، حج کی سعادت کے حصول کے بعد محرم ۱۳۱۷ھ= اپریل ۱۸۹۹ء میں مدینہ منورہ حاضری ہوئی، جہاں ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء تک قیام کی سعادت حاصل رہی، گوکہ اس دوران تین مرتبہ ہندوستان کا سفر فرمایا، جو مجموعی طور پر چار سال کی مدت کو محیط رہا؛ لیکن مسجد نبوی میں کم وبیش ۱۴ سال درسِ حدیث دینے کا شرف حاصل ہوا، جس سے سیکڑوں علمائے عرب وعجم مستفید ہوئے۔ شیخ الہند کے ہم راہ مالٹا میں اسیر رہے، رہائی کے بعد انھی کے ہم راہ ہندوستان واپس آئے، اس عرصے میں امروہہ، کلکتہ، اور سلہٹ میں اپنی تدریس سے تشنہ گان علم کو فائدہ پہنچایا۔ ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء میں علامہ کشمیری نے جب دارالعلوم سے علاحدگی اختیار کی، تو آپ کو مسند صدارت تدریس ومسند شیخ الحدیث تفویض ہوئیں، جن پر تاحیات کم وبیش ۳۰ سال تک فائز رہے۔ اس دوران تین ہزار آٹھ سوچھبیس طلبہ دورۂ حدیث شریف میں آپ سے سیراب ہوئے۔ آپ کے وعظ وارشاد، اور تربیت ودعوت سے ہزاروں بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں قائدانہ رول ادا کیا۔ ریشمی رومال، خلافت کی تحریکوں اور جمعیۃ علمائے ہند کے روح رواں رہے۔ حصول آزادی کے لیے چار مرتبہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ زہد وتقوی، تواضع وخاکساری، مجاہدانہ زندگی، سرگرمی عمل، اخلاص واحتساب، کی دولتِ بے بہا نے آپ کو خلق خدا کا محبوب بنادیا تھا۔ ۱۳؍جمادی الاول ۱۳۷۷ھ/ ۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء کو دیوبند میں رحلت فرمائی اور اپنے استاذ ومربی ومحبوب شیخ الہند کے پہلو میں آسودۂ خواب ہوئے۔

بلیاویؒ (۴۶) (۱۳۰۴-۱۳۸۷ھ/ ۱۸۸۶-۱۹۶۷ء) شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ (۴۷) (۱۳۰۰-۱۳۷۱ھ/ ۱۸۸۲-۱۹۵۱ء) وغیرہم سے

(۴۶) علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ: شیخ الہند کے شاگرد و دست گرفتہ، ماہر معقول و منقول، صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اور استاذ الاساتذہ تھے۔ ولادت ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء میں شہر ''بلیا'' یوپی میں ایک علمی گھرانے میں ہوئی۔ ان کا خاندان پنجاب کے ضلع ''جھنگ'' سے جون پور آیا اور کچھ مدت بعد بلیا میں آباد ہوگیا۔ جون پور میں عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم مشہور طبیب مولانا حکیم جمیل الدین نگینوی سے حاصل کی۔ معقولات کی تحصیل مولانا فاروق چریاکوٹی اور مولانا ہدایت اللہ خاں (تلمیذ مولانا فضل حق خیر آبادی) سے کی۔ دینیات کی تعلیم حضرت گنگوہی کے تلمیذ رشید مولانا عبد الغفار سے حاصل کی۔ ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء کے اواخر میں دار العلوم دیوبند میں ہدایہ اور جلالین کی جماعت میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد اسی سال مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مدرس دوم ہوئے۔ پھر ''عمری'' ضلع مراد آباد کے مدرسے میں کچھ عرصے تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء میں آپ کو دار العلوم دیوبند بلایا گیا۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء سے ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء تک دار العلوم مئو ناتھ بھنجن اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں صدارت تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء میں پھر آپ کو دار العلوم دیوبند بلایا گیا۔ ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء میں پھر دار العلوم سے علاحدگی اختیار کی اور اولاً جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری میں صدارتِ تدریس کی مسند کو رونق بخشی۔ بعد ازاں بنگال میں ''ہاٹ ہزاری'' ضلع ''چاٹ گام'' (حالیہ بنگلا دیش) کے مدرسے میں صدر المدرسین رہے۔ بالآخر ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں پھر دار العلوم دیوبند آگئے۔ ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء میں حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ کو مسند صدارت پر فائز کیا گیا اور تادم واپسیں اس منصب کی رونق رہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ ہر علم و فن خصوصاً علم کلام اور عقائد میں یگانۂ روزگار تھے۔ ۶۰ سال تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ چیدہ مسائل کو حل کرنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے درس میں طلبہ کو فن سے گہری مناسبت پیدا ہوجاتی تھی۔ حدیث میں روایت سے زیادہ درایت سے کام لیتے تھے۔

۲۴ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ = ۲۷ نومبر ۱۹۶۷ء کی دوپہر کو ۸۴ سال کی عمر میں راہیِ ملک بقا ہوئے اور قبرستان قاسمی میں آسودۂ استراحت ہوئے۔

(۴۷) شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ: باکمال استاذ، تواضع کا پیکر، وقت کی قدر کرنے میں طاق اور خادم العلماء والطلبہ اور شیخ الہند و مفتی عزیز الرحمٰن کے اخص تلامذہ میں تھے۔

۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں شہر ''بدایوں'' میں ولادت ہوئی۔ آپ کا وطن قصبہ ''امروہہ'' ضلع مراد آباد ہے۔ ابتدائی تعلیم ''شاہ جہاں پور'' میں حاصل کی، جہاں آپ کے والد جناب مزاج علی برسر ملازمت تھے۔ ابتدائی ←

پڑھا۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا معراج الحقؒ (۴۸) (۱۳۲۸-۱۴۲۱ھ/

← کتابیں مدرسہ گلشن فیض ''تلہر'' میں پڑھیں۔ مدرسہ عین العلوم ''شاہ جہاں پور'' میں علامہ مفتی کفایت اللہؒ سے شرح وقایہ اور قاری شبیر احمدؒ سے متوسطات کی کتابیں پڑھیں۔ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور مفتی عزیز الرحمٰنؒ سے فتویٰ نویسی کی مشق کی۔ ۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء میں فارغ ہوئے۔ شیخ الہند کے حکم سے مدرسہ نعمانیہ بھاگلپور (بہار) میں سات سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر ''شاہ جہاں پور'' میں ایک مسجد میں ''افضل المدارس'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہاں تین سال تک حسبۃً للہ درس دیا۔ ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء میں دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس تقرر ہوا۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء میں مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کا ریاست حیدرآباد کے مفتی اعظم کے عہدے پر تقرر ہوا، تو وہ آپ کو اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے ساتھ لے گئے، وہاں ایک سال قیام رہا۔ مفتی عزیز الرحمٰنؒ کے بعد آپ کو صدر مفتی کے عہدے پر دارالعلوم میں فائز کیا گیا۔ ۴۴ سال تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے ساتھ انتظامی اور افتا کی خدمت انجام دیں۔ آپ صورتاً و سیرتاً اسلاف کی یادگار تھے۔ صاحب تقویٰ اور عمیق الاستعداد عالم تھے۔ ادب میں آپ کی مہارت مسلم تھی؛ لیکن فقہ، حدیث اور تفسیر میں بھی آپ کا پایہ بلند تھا۔ ''کنز الدقائق'' ''نورالایضاح'' ''دیوان متنبی'' ''دیوان حماسہ'' پر آپ کے حواشی علما و طلبہ کے لیے بیش بہا خزانہ ہیں۔ ادب میں ''نفحۃ العرب'' آپ کی گراں قدر تالیف ہے، جو دارالعلوم دیوبند اور برصغیر کے بیش تر مدارس میں داخل نصاب ہے۔ ابتدائی دور سے آخر تک تدریس کے اوقات کی منٹوں اور سکنڈوں کے حساب سے پابندی کرتے تھے، بعض لوگ درس گاہ میں آپ کی آمد و رفت سے گھڑی ملایا کرتے تھے۔ بے نفسی اور تواضع میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء میں دیوبند ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا، مقبرۂ قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

(۴۸) استاذ الاساتذہ مولانا معراج الحق صاحب دیوبندیؒ: دارالعلوم کے ہر دل عزیز استاذ، نائب مہتمم اور صدر مدرس تھے۔ والد کا نام منشی نورالحق تھا۔ ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء میں دیوبند کے جنوب مغربی سمت کے محلّہ ''بیرون کوٹلہ'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محلے ہی میں حاصل کی، دارالعلوم میں، درجۂ متوسطات میں ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء میں داخل ہوئے اور ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے۔ مزید ایک سال مختلف فنون کی کتابیں پڑھیں۔ وہ پڑھنے کے زمانے میں دارالعلوم کے ممتاز طلبہ میں تھے۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مدنیؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، مولانا اعزاز علی امروہیؒ، علامہ بلیاویؒ، مولانا مبارک علیؒ (وفات ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) اور مولانا عبدالسمیع دیوبندیؒ (وفات ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۶ء) جیسے آسمانِ علم و فضل تھے۔ فراغت کے بعد ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء سے ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء تک بمبئی کی زکریا مسجد کے مدرسے میں اور اس کے بعد ''گل برگہ'' کے ایک مدرسے میں ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ یکم محرم ۱۳۶۲ھ = ۱۰ دسمبر ۱۹۴۲ء میں دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس تقرر ہوا۔ تقریباً پچاس سال کے طویل عرصے ←

۱۹۱۰-۱۹۹۱ء) سابق نائب مہتمم وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، ماہر معقول ومنقول مولانا محمد حسین بہاری[۴۹] (۱۳۲۳-۱۴۱۲ھ/ ۱۹۰۵-۱۹۹۲ء) مولانا سید فخر الحسن صاحب مراد آبادیؒ[۵۰] (۱۳۲۳-۱۴۰۰ھ/

← میں دارالعلوم کے نصاب میں داخل اکثر کتابوں کو حسن وخوبی سے پڑھایا۔ حدیث شریف کی متعدد کتابیں بھی زیر تدریس رہیں۔ ان کا درس ہمیشہ بہت مقبول رہا۔ اسی کے ساتھ وہ مختلف انتظامی مناصب پر فائز رہے۔ ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں وہ ناظم دارالاقامہ منتخب ہوئے۔ شوال ۱۳۸۶ھ/ دسمبر ۱۹۶۶ء میں قاری محمد طیبؒ کے دور میں نائب مہتمم مقرر ہوئے، جس پر رجب ۱۳۹۶ھ/ جون ۱۹۷۶ء تک فائز رہے۔ ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء سے تادم واپسیں صدر مدرس رہے۔ مولانا پانچ بھائی اور تین بہن تھے، مولانا لاولد رہے۔ مشہور مؤرخ ومؤلف مولانا سید محمد میاں دہلویؒ (۱۳۲۱-۱۳۹۵ھ/ ۱۹۰۳-۱۹۷۵ء) مولاناؒ کے برادر نسبتی تھے۔ مولانا معراج الحق صاحب نفاست پسند، دراز قامت، سرخ وسفید، صاف دل، کم خواب، کم خور، کم گو، پررعب، باوقار اور راست باز عالم تھے۔

(۴۹) استاذ الاساتذہ ماہر معقول ومنقول مولانا محمد حسین بہاری: شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے شاگرد اور دارالعلوم کے ہر دل عزیز استاذ تھے۔ وہ ضلع مظفر پور (حال سیتامڑھی) کے ایک گاؤں ''شیخ بسہیا'' میں ۱۳ر شوال ۱۳۲۳ھ = ۱۳ر نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے برادر بزرگ سے گاؤں ہی میں حاصل کی، اس کے بعد کئی ایک مدرسوں میں تعلیم حاصل کی، جن میں دارالعلوم مئو سرفہرست ہے، جہاں مولانا کریم بخش سنبھلی (متوفی ۱۳۶۲ھ) سے خصوصی تلمذ حاصل کیا۔ پھر مظاہر علوم سہارن پور میں متوسطات تک پڑھا۔ ۱۳ر شوال ۱۳۴۶ھ = ۱۹ر مارچ ۱۹۲۷ء کو دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ دوسرے سال ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء میں فارغ ہوئے۔ وہ حضرت مدنیؒ سے دورۂ حدیث مکمل کرنے والی پہلی کھیپ کے فضلا میں تھے۔ ان کے دیگر اساتذہ میں علامہ بلیاویؒ، شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ، مولانا فخر الحسن مرادآبادیؒ تھے۔ ۳ر ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ/ ۹ر ستمبر ۱۹۴۸ء میں وہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے، جہاں تادم واپسیں ۴۵ سال تک علم وفن کی اکثر کتابیں پڑھائیں۔ ترمذی شریف اور ابوداؤد شریف کا درس بھی دیا۔ ان کے سیکڑوں شاگرد برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں جنھیں ان کی علمی گیرائی وگہرائی پر افتخار ہے۔ وہ انتہائی سادہ مزاج اور متواضع تھے۔

۵ر رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲ر جنوری ۱۹۹۲ء کو دارالعلوم دیوبند ہی میں انتقال ہوا اور مقبرۂ قاسمیہ میں محو استراحت ہیں۔

(۵۰) مولانا فخر الحسن صاحب مراد آبادیؒ: دارالعلوم دیوبند کے درجۂ علیا کے استاذ رہے۔ ان کا درس بہت دل چسپ ہوتا تھا۔ وہ ۱۰ر رجب ۱۳۲۳ھ = ۱۲ر اگست ۱۹۰۵ء کو اپنے آبائی وطن قصبہ ''عمری'' ضلع ←

۱۹۰۵- ۱۹۸۰ء) مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہ(*) نائب مہتمم و صدرالمدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (۱۳۳۷ھ- ۰۰۰/ ۱۹۱۸ء -۰۰۰) جیسے ارباب فضل وکمال ہیں۔

مولانا کیرانویؒ کو اللہ پاک نے ذہانت وذکاوت کی وافر دولت سے نوازا تھا اور حصولِ علم کے ذوق وشوق اور اس کے لیے مطلوبہ توفیق سے بہرہ ور تھے؛ اس لیے طالب علمی کے زمانے میں پورے دارالعلوم میں آپ کا ممتاز طلبہ میں شمار ہوتا تھا اور دیگر طلبہ اور رفقائے درس کے لیے قابل رشک تھے۔ آپ کے ایک رفیق درس جو اس وقت برصغیر کے دوتین ممتاز ترین فضلائے دیوبند میں ہیں؛ بل کہ بعض علمی وفکری خصوصیتوں کی وجہ سے سب سے نمایاں شخصیت کے حامل ہیں اپنے رفیقِ درس: مولانا کیرانویؒ کے متعلق فرماتے ہیں:

← مرادآباد میں متولد ہوئے، تاریخی نام ''مظہر حسین'' ہے۔ ابتدائی فارسی اور اردو دینیات کے بعد ۱۳۳۵ھ/ ۱۹۱۷ء میں مدرسہ شاہی مرادآباد میں داخل ہوئے، جہاں آپ کے والد صاحب کتب خانے کے ناظم تھے۔ یہاں فارسی کی تکمیل کی اور درس نظامی کی ابتدائی کتابیں والد ماجد سے پڑھیں۔ پھر مظاہر علوم سہارن پور میں متوسطات کی تحصیل کی۔ ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء میں فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں مدرس ہوئے۔ پھر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صحاح ستہ کی بعض کتابیں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے بعد پھر مدرسہ عالیہ فتح پوری واپس آگئے، بعد مین یہاں صدر مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند میں طبقۂ علیا کا مدرس مقرر کیا گیا۔ دارالعلوم میں آپ کے درسِ صحیح مسلم اور تفسیر بیضاوی کو ہمیشہ خاص شہرت حاصل رہی۔ وعظ وتقریر میں بھی دست گاہ حاصل تھا۔ ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں علامہ بلیاویؒ کی وفات کے بعد آپ کو دارالعلوم کا صدرالمدرسین منتخب کیا گیا، اس منصب پر تادم حیات فائز رہے۔ ۶/ ذی قعدہ ۱۴۰۰ھ = ۱۸/ ستمبر ۱۹۸۰ء شب پنج شنبہ کو رحلت فرمائی۔ مقبرۂ قاسمیہ میں مدفون ہیں۔

(*) حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب سے متعلق معلومات، ص: ۳۳۶ پر دیکھیے۔

''۱۳۷۰ھ/ شوال ۱۹۵۱ء جون کا مہینہ تھا، جب صبح صادق کے وقت ... باب الظاہر کے راستے دارالعلوم میں داخل ہوا۔ دارالعلوم کے داخلہ امتحان میں کام یابی حاصل کرنے کے بعد، داخلہ لیا۔ ظہر کی نماز کے بعد ہدایہ کا درس مولانا سید اختر حسین صاحب[(۵۱)] کے پاس ہوتا، وہاں ایک طالب علم پر نظر پڑی: چھریرا بدن، رنگ صاف، آنکھوں میں ذہانت اور ظرافت رقصاں؛ لیکن درس میں بالکل خاموش۔ چند دنوں کے بعد تقسیم انعام کا جلسہ ہوا، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ تشریف فرما، نتائج کا اعلان فرماتے اور طلبہ کو انعام تقسیم کیے جاتے۔ اس دور کا قاعدہ تھا کہ جو طالب علم کم از کم ۵ پرچوں میں پچاس نمبر لاتا اور کسی پرچے میں ۴۰ نمبر سے کم نہیں ہوتا، اسے خصوصی انعام دیا جاتا۔ ۷۰-۱۳۶۹ھ/ ۵۱-۱۹۵۰ء کے نتائجِ امتحان سناتے ہوئے حضرت مدنیؒ نے نام پکارا: ''وحید الزماں کیرانوی'' اور جب نتائج کا اعلان فرمایا، تو سارے مجمع نے واہ واہ اور شاباش شاباش کہا۔ انتہائی ممتاز طالب علم کی حیثیت سے وحید الزماں کیرانوی نامی اس طالب علم کو میں نے پہلی بار پہچانا اور سچی بات یہ ہے کہ پہلی اور آخری بار جس طالب علم پر مجھے رشک

---

(۵۱) مولانا سید اختر حسینؒ: دارالعلوم دیوبند کے استاذ، ناظم تعلیمات اور بلند پایہ مدرس گزرے ہیں۔ شوال ۱۳۴۴ھ/ مارچ ۱۹۲۶ء سے اپنی وفات یکم ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ/ ۱۳رنومبر ۱۹۷۵ء تک دارالعلوم سے وابستہ رہے۔ علامہ بلیاویؒ کی وفات (۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) کے بعد ناظم تعلیمات کے منصب پر فائز ہوے اور تادم واپسیں برقرار رہے۔ مولانا بشیر احمد خاںؒ (وفات ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء) کے بعد کچھ عرصے کے لیے نائب مہتمم بھی رہے۔ وہ دیوبند کے محلّہ قلعہ کے تھے۔ مدرسہ اصغریہ جواُنھی کے خاندان کا قائم کردہ ہے، کی نئی عمارت بھائلہ روڈ کے جانب غرب میں واقع مسجد کے جنوب میں متصلاً مدفون ہیں۔

آیا، وہ یہی وحید الزماں کیرانویؒ تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں مہینوں یہی دعا کرتا رہا کہ اللہ مجھے بھی ایسی ہی کام یابی عطا فرما۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجھے مولانا مرحوم کے ممتاز نتائج نے محنت اور یک سوئی کے ساتھ درس ومطالعے کی راہ پر ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔''(۵۲)

محنت اور لگن سے پڑھنے لکھنے اور ایام طالب علمی کے قیمتی اوقات کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی وجہ سے، مولانا کیرانویؒ نہ صرف عام طلبہ اور رفقائے درس کے لیے قابل رشک تھے؛ بل کہ تمام ہی اساتذہ کی توجہات اور خصوصی عنایات سے بہرہ ور تھے۔ ان کے ایک ساتھی لکھتے ہیں:

''عربی زبان کا بہترین ذوق، اسباق میں پابندی، اساتذہ کے ساتھ ادب واحترام کا سلوک اور امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کام یابی کے سبب، سب ہی اساتذہ مولانا کو چاہتے اور ان کی طرف خصوصی توجہ فرماتے تھے۔''(۵۳)

عربی دانی کے اعتبار سے چوں کہ آپ نہ صرف طلبہ؛ بل کہ اساتذۂ دارالعلوم کے درمیان بھی، دور طالب علمی میں بھی ممتاز تھے کہ آپ نے لکھنے اور بولنے کی مشق علامہ مامون دمشقی سے حیدرآباد میں کرلی تھی، اس کے بعد دارالعلوم میں داخل ہوئے تھے؛ اس لیے دارالعلوم میں آنے والے عرب مہمانوں کے استقبال اور سپاس نامے وغیرہ لکھنے کا کام، آپ ہی انجام دیتے

---

(۵۲) مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی: ''میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا'' ترجمان دارالعلوم

(۵۳) مولانا عبداللہ سورتی سابق مہتمم فلاح دارین ترکیسر، گجرات: ''رفیق محترم'' ترجمان دارالعلوم

تھے۔ مختلف جلسوں میں عربی مقالے بھی پیش کرتے، اس کے علاوہ دارالعلوم کے عربی کے تحریری کام بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔ دارالعلوم کے پانچ سالہ زمانۂ طالب علمی میں، تمام کتابوں میں اعلیٰ نمبرات اور خصوصی انعامات حاصل کیے۔ امتیازی حیثیت کی وجہ سے، دارالعلوم کی جانب سے پندرہ روپے ماہانہ خصوصی وظیفہ بھی آپ کے لیے جاری رہا۔

بعض دفعہ طالب علم ذہین اور محنتی ہوتا ہے، تو وہ یک سوئی پسند ہوتا ہے؛ لیکن مولانا کیرانویؒ نے طالب علمانہ سیاست بھی کی۔ وہ دارالعلوم کی جمعیۃ الطلبہ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ اسی طرح ''مدنی دارالمطالعہ'' کے بھی ناظم اعلیٰ رہے اور ایک دفعہ تو مشرقی یوپی اور مغربی یوپی کے طلبہ کی زبردست کش مکش کے درمیان، طلبہ نے بالاتفاق آپ ہی کو ناظم اعلیٰ کا عہدہ تفویض کیا۔

طالب علمی کے زمانے میں —شروع شروع میں— صدر گیٹ سے مطبخ کی طرف جاتے ہوئے کتب خانے کے سامنے دو کمرے تھے، جن کی دیواریں کچی تھیں اور چھت بھی مٹی کی تھی، انھی کمروں میں دو تین ہم ضلع طلبہ کے ساتھ مقیم تھے[۵۴] لیکن بعد میں برج جنوبی میں قیام رہا[۵۵] ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد دوسرے سال فنون وغیرہ کی کتابیں پڑھنے کے لیے، طالب علمانہ زندگی کو باقی رکھنے کا ارادہ کیا؛ لیکن اس وقت کی معاشی پریشانیوں کی وجہ

(۵۴) حوالۂ سابق

(۵۵) مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی: ''رفیق محترم'' نیز مولانا پروفیسر بدرالدین الحافظ: ''ان کی یادوں کے سفینے'' ترجمان دارالعلوم۔

سے دار العلوم میں مزید قیام نہ کر سکے۔[۵۶]

نکاح واولاد

دار العلوم دیوبند سے فراغت سے دو سال قبل یعنی ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۵۰ء میں آپ کی شادی کاندھلہ کے خاندان شیوخ میں، انتظام احمد بن حافظ حبیب احمد صدیقی کی چھوٹی صاحب زادی محترمہ فخر النساء[۵۷] سے ہوئی۔ یہ گھرانہ بھی کاندھلہ کے شریف گھرانوں کی طرح ہمیشہ سے علمی رہا ہے۔ مولاناؒ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ چھوٹی لڑکی ۱۴ سال کی عمر میں بہ عارضۂ ذیابیطس ربیع الاول ۱۳۹۸ھ/ جنوری ۱۹۷۸ء میں انتقال کر گئیں۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی اس وقت موجود ہیں، سبھی صاحبِ اولاد ہیں اور بڑے لڑکے کے سوا سب دیوبند ہی میں رہتے ہیں۔ سبھی برسر روزگار اور راحت و عافیت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا آپس کا میل جول اور محبت ایک دوسرے کا خیال، مولاناؒ اور اپنے اعمام کی طرح مثالی اور قابل رشک ہے۔[۵۸] مولانا رحمہ اللہ کو بھی اپنی اولاد کی محبت باہمی اور اپنے اسلاف کی

---

(۵۶) مولانا پروفیسر بدر الدین الحافظ۔

(۵۷) الحمد للہ مولاناؒ کی اہلیہ محترمہ حیات ہیں اور دیوبند ہی میں اپنے منجھلے اور چھوٹے صاحب زادوں: مولوی صدر الزماں اور مولوی قدر الزماں کے ساتھ رہتی ہیں۔ بڑے صاحب زادے مولانا بدر الزماں قاسمی کیرانوی، جو دہلی میں رہتے ہیں، ان کے ہاں بھی آمد و رفت رہتی ہے۔ ان کے والد انتظام احمد صدیقی چار بھائی تھے۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ کے ایک بھائی نثار احمد صدیقی تھے، جو انٹر پاس تھے۔ افسوس ہے کہ اسی سال ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء میں آج رمضان/ دسمبر سے آٹھ ماہ قبل انتقال کر گئے۔ اور ایک بڑی بہن ہیں قمر النساء، جو حیات ہیں۔

(۵۸) مولاناؒ کی اولاد اور بھائیوں کے حالات کے لیے، دیکھیے کتاب کا عنوان ”مولانا کے پس ماندگان“

روش کے مطابق آپسی رواداری سے بے حد خوشی تھی۔ انھوں نے اس بات کو بہ طور خاص اپنے مضمون ''خودنوشت سوانح کے چند اوراق'' میں ان الفاظ میں سراہا ہے:

''اللہ کا فضل وکرم ہے کہ جس طرح بھائیوں اور بھاوجوں میں خوش گوار تعلق اور چھوٹے بڑے کا خیال ہے، اسی طرح چاروں اولاد، فرماں بردار اور نیک چلن ہے۔ میں اولاد کی طرف سے ہر طرح مطمئن اور خوش ہوں۔ اولاد کا نیک چلن اور ماں باپ کا فرماں بردار ہونا اور خدمت گزار ہونا، بڑی سعادت اور خدا کا بڑا انعام ہے۔ اس پر جتنا بھی خدا کا شکر ادا کروں کم ہے۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔''(۵۹)

مولاناؒ نے اپنے اور اپنے بھائیوں کے مثالی تعلقات کو بھی خوب صورت الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ یہاں انھی کے الفاظ میں، اس لیے پیش کیا جا رہا ہے، تاکہ دیگر لوگوں کو بھی اس سیرت وکردار کو اپنانے کا سبق ملے؛ کیوں کہ اکثر گھرانوں میں ایک تو بھائیوں کے تعلقات اچھے نہیں رہتے اور اگر رہیں تو بھاوجوں میں تو چپقلش؛ بل کہ جھگڑے ضرور رہتے ہیں:

''یہ اللہ کا فضل وکرم اور والد صاحب کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہم اس وقت موجود چاروں بھائیوں: وحید الزماں، عمید الزماں، معید الزماں، فرید الزماں؛ بہن: فریدہ؛ بہنوئی: مولانا غیاث الحسن صاحب، میں

---

(۵۹) ترجمان دارالعلوم۔

خوش گوار تعلقات قائم ہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ ہم دردی وتعاون کا جذبہ کارفرما ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ، ادب و احترام ملحوظ رہتا ہے۔ عام طور پر اگر بھائیوں میں اتحاد واتفاق ہوتا بھی ہے،تو عورتوں میں کچھ نہ کچھ ناچاقی ضرور رہتی ہے۔ ہمارے گھرانے میں الحمدللہ یہ بھی ایک خصوصیت ہے، کہ چاروں بھاوجوں اور نند میں کوئی اختلاف و چپقلش نہیں۔ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں؛ نیز یہ بھی اللہ کا بڑا انعام ہے کہ معاشی طور پرتھوڑی کمی بیشی کے فرق کے ساتھ، آسودگی ہے اور معیار زندگی تقریبا یک ساں ہے، جو عام طور پر کم دیکھنے میں آتا ہے۔"(۶۰)

عملی زندگی

فراغت کے بعد رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی(۶۱) کی

(۶۰) ترجمان دارالعلوم

(۶۱) مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مسلمانوں کی پرجوش تنظیم "مجلس احرار" کے قائد اور حوصلہ مند و صاحب عزیمت و جری انسان تھے۔لدھیانہ میں آپ کا گھرانہ کئی پشتوں سے علمی گھرانہ رہا تھا، آبا و اجداد میں کئی نام ور عالم گزرے ہیں۔ بعد میں آپ نے لدھیانہ کے بہ جائے امرتسر میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مولانا لدھیانوی شعلہ بار و آتش نوا مقرر تھے۔تحریکِ آزادی میں، ان کی تقریروں سے انگریزی حکومت کے در و بام بہت سی مرتبہ لرزہ براندام ہوے۔ متعدد مرتبہ گرفتار ہوے اور جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تقسیمِ ملک کے وقت جو فسادات کی آندھی چلی، اس نے امرتسر کو بھی تہ وبالا کردیا، بڑی مشکل سے آپ اپنے خاندان کو بچا کے دہلی لے آئے۔ یہاں بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں سے چوں کہ تعلقات تھے؛ اس لیے رہائش کے لیے جگہ مل گئی۔ پھر یہیں مقیم ہوگئے۔کوچہ رحمٰن میں ایک اچھا خاصا بڑا مکان تھا، اسی کے مردانہ حصے میں ان کا ایک باقاعدہ آفس قائم تھا، وہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے اس ←

وفات (۱۳۱۰-۱۳۷۶ھ/۱۸۹۲ء-۱۹۵۶ء) تک، ان کے پرسنل سکریٹری رہے، جس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ چوں کہ مولاناؒ کے والد حضرت مولانا مسیح الزماں کیرانویؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی میں، دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کے زمانے سے گہرے تعلقات تھے؛ دہلی کے ایک سفر کے دوران مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے اپنے دوست سے یہ طے کیا کہ ان کے بڑے صاحب زادے مولانا کیرانویؒ، ان کے سکریٹریٹ میں کام کریں گے۔ زمین دارانہ نظام کے خاتمے کے نتیجے میں معاشی حالات کی ابتری نے چوں کہ فراخی کے بعد معاشی تنگی پیدا کر دی تھی؛ اس لیے مولاناؒ نے ان کے ہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن ہی کی معرفت حکومتِ ہند کے دفترِ خارجہ میں آنا جانا ہوتا رہا اور بڑی بڑی سرکاری تقریبات اور ضیافتوں میں شرکت کا موقع ملا۔ مصر کی انقلابی کونسل کے رکن، بعد میں قومی اسمبلی کے اسپیکر اور پھر مصر کے صدر انور السادات[۶۲] (وفات

← وقت کے ضروری مسائل کے حل کے لیے تگ و دو کرتے تھے۔ دہلی ہی میں ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔ ولادت ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء کی تھی، اس حساب سے ۶۴ سال کی عمر پائی۔

(۶۲) محمد انور السادات ۲۵/دسمبر ۱۹۱۸ء (۲۰/ربیع الآخر ۱۳۳۷ھ کو) مصر کے گاؤں میت ابوالکوم میں پیدا ہوئے۔ ثانوی اور ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۳۸ء میں عسکری کالج سے فارغ ہوئے۔ مختلف فوجی عہدوں پر فائز ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں وزیر اسٹیٹ مقرر ہوئے۔ ۲۳/جولائی ۱۹۶۰ء کو قومی مجلس کے اسپیکر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۲۰/دسمبر ۱۹۶۹ء کو صدر جمہوریہ کے نائب اول منتخب ہوئے۔ جمال عبدالناصر کی ۲۸/۹/۱۹۷۰ء کو موت واقع ہونے کے بعد عبوری طور پر صدر جمہوریہ بنے۔ پھر اسی سال وسط اکتوبر میں صدر جمہوریہ منتخب ہوئے، جس پر اپنے مقتول ہونے کے وقت تک فائز رہے۔ یعنی ۱۹۸۱ء (۱۴۰۲ھ) تک۔ انور السادات نے اپنے عہدۂ صدارتِ مصر کے دوران ۱۹-۲۱/۱۱/۱۹۷۷ء کو، اسرائیل کا دورہ کیا جو کسی عرب سربراہ کی طرف سے اسرائیل کا پہلا دورہ تھا، جس کے بعد انھوں نے کہا تھا کہ دراصل میں نے ←

۱۹۸۱ء/۱۴۰۲ھ) ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے، تو ڈاکٹر سید محمودؒ (۶۳) نے، جو اس وقت ہندوستان کی وزارت خارجہ میں ریاستی وزیر تھے، مولانا کیرانویؒ ہی کو ان کا ترجمان مقرر کیا۔ اس ملاقات کے دوران آپ نے انور السادات سے کہا کہ مصر اور ہندوستان میں کلچرل تبادلہ ہونا چاہیے۔ اس سے انھوں نے اتفاق کیا، چناں چہ اس کے بعد شیخ عبدالمنعم النمرؒ (۶۴) (۱۳۳۲-۱۴۱۱ھ/۱۹۱۳-۱۹۹۱ء) دارالعلوم دیوبند میں جامعہ ازہر

← اس دورے کے ذریعے عرب اور اسرائیل کے ذہنی فاصلے اور نفسیاتی رکاوٹ کو دور کیا ہے۔ اس کے بعد ۵-۱۷/۹/۱۹۷۸ء میں انھوں نے امریکہ کے تفریحی مقام ''کیمپ ڈیوڈ'' میں اسرائیل کے، اس وقت کے وزیر اعظم مناحیم بیگن کے ساتھ، سارے عرب ملکوں کے منشا کے برخلاف تنہا معاہدہ کیا، جس سے نہ صرف عرب ممالک: بل کہ مصر کے تمام لکھے پڑھے خصوصاً اسلام پسند انتہائی ناراض ہوے۔ لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا، عرب ملکوں نے عرصے تک مصر کا بائیکاٹ کیے رکھا۔ اس ناراضگی کے ہی نتیجے میں ۶/۱۰/اکتوبر ۱۹۸۱ء = ۶ محرم ۱۴۰۲ھ کو جب وہ فوجی پریڈ دیکھ رہے تھے کہ ایک فوجی افسر خالد احمد شوق اسلام بولی، نیز دوسرے افسر مطوع حسین عباس علی نے خودکار پستول سے ان کا کام تمام کر دیا۔

(۶۳) ڈاکٹر سید محمود: تحریک خلافت کے دیرینہ رہنما، راسخ العقیدہ قوم پرور مسلمان و کانگریسی، گاندھی جی کے معتمد ترین رفیق، چوٹی کے مسلم لیڈر و قائد اور جنگ آزادی کے ایک نمایاں مجاہد تھے۔ وہ یوپی کے ضلع غازی پور کے ایک قصبہ ''سید پور بھتری'' کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب اس کے صدر منتخب ہوے۔ انھوں نے اس پلیٹ فارم سے مسلمانوں اور ملت کے لیے بہت خدمات انجام دیں۔ دسمبر ۱۹۶۳ء اور جنوری ۱۹۶۴ء کے کلکتے کے فسادات میں، نیز مارچ و اپریل ۱۹۶۴ء میں رانچی و جمشید پور و اوڑیسہ کے خوں ریز و مسلم کش فسادات میں، انھوں نے مسلمانوں کے دل و جگر پر جس طرح مرہم رکھا، طوفانی دورے کیے، شب و روز تڑپے، وہ انھی کا حصہ تھا۔ وہ مستقل طور پر بعد میں دہلی ہی کے باشندے ہو گئے تھے۔ ۶ رمضان ۱۳۹۱ھ/ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے رحلت کی۔

(۶۴) شیخ عبدالمنعم النمر شہر ''دسوق'' مصر میں پیدا ہوے۔ کلیۃ اصول الدین سے فراغت کے بعد ۱۹۷۲ء میں تاریخ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ کئی اہم مناصب پر فائز رہے۔ مجمع البحوث الاسلامیہ کے مددگار ناظم مقرر ہوے، پھر جامعہ ازہر کے ناظم منتخب ہوے، وفات سے قبل وزیر اوقاف رہے۔ انھوں نے جامعہ ازہر کے مبعوث کی حیثیت سے یہاں دارالعلوم دیوبند میں کئی سال گزارے اور عربی زبان ←

مصر کے مبعوث کی حیثیت سے آئے۔

مولانا لدھیانویؒ کے انتقال کے بعد یہ سلسلۂ ملازمت ختم ہوگیا۔ معاشی حالات کا تقاضا تھا کہ آمدنی کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ رسالہ شمع کے بانی و مدیر: جناب یوسف دہلوی نے دینی کتابوں کی اشاعت کے لیے، اس زمانے میں ایک کتب خانہ "مکتبۂ دینیات" کے نام سے قائم کیا اور عام فہم زبان میں عوام کے لیے مؤثر عنوانات کے تحت، مولاناؒ سے کتابیں لکھنے کی فرمائش کی۔ ہر چند کہ یہ معاشی مسئلے کا کوئی پائے دار حل نہ تھا؛ لیکن چوں کہ اس کام میں اسلامی خدمت کا ایک پہلو موجود تھا؛ اس لیے مولاناؒ نے اس کو انجام دینے کا فیصلہ کرلیا اور سو عنوانات تجویز کر کے بھیجے۔ مکتبہ کے منیجر جناب انور علی دہلوی کے منتخب کردہ عنوانات کے تحت، مولاناؒ نے تالیف وتحریر کا کام شروع کردیا اور ہر ماہ تقریباً ایک کتاب کا مسودہ تیار کر کے ارسال کرتے اور منیجر صاحب فوری طور پر اس کا معاوضہ ادا کر دیتے۔ مولانا کے برادر اوسط جناب مولانا عمید الزماں صاحب کیرانوی (۶۵) اس وقت مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں، طالب علم تھے؛ اس لیے واسطے کا کام اکثر وہی انجام دیتے تھے۔ ان میں سے بعض کتابیں خاصی مقبول ہوئیں۔ اب عرصے سے

← میں طلبہ کو فائدہ پہنچایا۔ نیز یہاں کے قیام کے دوران "تاریخ الاسلام فی الہند" اور مولانا آزاد کی سوانح لکھی۔ اول الذکر کتاب کی تالیف میں مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلویؒ کی تالیفات اور بالمشافہہ ان سے فائدہ اٹھایا۔ وہ بہت سی گراں قدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ۱۹۷۸ء میں یہود کے ساتھ صلح کے، نائب شیخ الازہر کے عہدے پر رہتے ہوئے، عدم جواز کا فتوی دیا تھا، جس کی بڑی دھوم رہی۔ دوشنبہ ۲۰؍ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ = ۵؍مئی ۱۹۹۱ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۶۵) مولانا عمید الزماں کیرانوی کے حالات کے لیے دیکھیے کتاب کا عنوان "مولاناؒ کے پس ماندگان"

مولاناؒ کی یہ اولیں کاوشیں بازار میں دست یاب نہیں؛ بل کہ بعض کتابوں کا ایک نسخہ بھی کہیں باقی نہ رہا۔(۶۶) مولانا کے فرزندوں اور برادران نے اچھا کیا کہ ان میں سے، جن کتابوں کے نسخے ملے، انھیں مولاناؒ کے قائم کردہ کتب خانہ: ''کتب خانہ حسینیہ'' دیوبند سے کمپیوٹر ٹائپ کے ذریعے، مولانا عمید الزماں کیرانوی - جو مولاناؒ کے بعد گویا ان کے علمی وارث ہیں- کے کاشفِ احوال پیش لفظ کے ساتھ، خوب صورت اور جاذب نظر پیمانے پر شائع کر کے، ان کی علمی میراث کے اِحیا کا آغاز اور مولانا کے ہزاروں شاگردوں اور عقیدت مندوں کے لیے مسرت کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔(۶۷)

دارالفکر کا قیام اور مجلّہ ''القاسم'' کا اجرا

اس عبوری دور کے بعد، وہ دیوبند منتقل ہو گئے اور انھوں نے اپنے فکری اور علمی خاکوں میں، رنگ بھرنے کا کام، تمام پریشانیوں، بے سروسامانیوں اور معاشی الجھنوں کے باوجود، شروع کر دیا۔ ۱۹۵۹ء (۱۳۷۸-۱۳۷۹ھ)(۶۸) میں دیوبند کی جامع مسجد کے عقب میں مرحوم حافظ ظہیر احمد

---

(۶۶) مولانا عمید الزماں کیرانوی: ''پیش لفظ'' کتاب ''شرعی نماز'' تالیف: مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

(۶۷) اپریل ۲۰۰۰ء (صفر ۱۴۲۱ھ) میں چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں: شرعی نماز، خدا کا انعام، انسانیت کا پیغام، اسلامی آداب۔ یہ کتابیں چھوٹے سائز پر تقریباً ڈیڑھ سو صفحات کی ہیں۔ دیگر بعض کتابوں کے نام یہ تھے: آخرت کا سفر نامہ، اچھا خاوند، اچھی بیوی، وغیرہ، جو فی الحال دست یاب نہ ہو سکیں۔

(۶۸) ان کے دارالفکر کے یار غار اور رفیق کار مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ (متوفی ۲۹/جون ۱۹۹۸ء = ۳/ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ) نے دارالفکر کے قیام کی تاریخ ۱۹۵۸ء درج کیا ہے، دیکھیے ترجمان دارالعلوم مولانا کیرانوی نمبر ص: ۶۲

صاحب عرف حافظ دھنیے کے مکان کی بیٹھک (۶۹) میں ''دارالفکر'' کے نام سے ایک جامع المقاصد ادارے کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد تصنیف وتالیف، نشر واشاعت، اسلامی اور ادبی صحافت کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ، فضلا و طلبہ کو عربی زبان کی شوق انگیز اور نتیجہ خیز تعلیم، اسی کے ساتھ ان کی تربیت اور ان کے اندر انسانی تہذیب وتمدن کی آب یاری اور زندگی کو بامقصد گزارنے کا شعور بیدار کرنا تھا۔ ہم دردانہ اور شفقت آمیز برتاؤ، خلوص وایثار، امداد و تعاون، حوصلہ افزائی اور طلبہ وفضلائے نو میں زندگی کی رو دوڑا دینے کی فکر کی وجہ سے، وہ دارالعلوم کے باہر رہتے ہوئے بھی طلبہ میں ہر دل عزیز ہو گئے۔

مولانا کے ایک رفیقِ درس تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا کے اچھوتے طرز تعلیم اور طلبہ کی صلاحیتوں کو ابھارنے، ان میں خود اعتمادی اور خودی پیدا کرنے، ان کو نظم وضبط کا پابند بنانے، عربی تلفظ درست کرنے اور مختصر وقت میں عربی رسم الخط میں ماہر بنانے وغیرہ جیسی کئی خصوصیات کے سبب دارالفکر اور مولانا کا چرچا، دارالعلوم کی چار دیواری میں عام ہونے لگا تھا۔'' (۷۰)

''دارالفکر'' سے دارالعلوم کے طلبہ کو جو فیض پہنچا، اس کا تذکرہ، ان کے ایک نامور شاگرد اور مشہور ملی وقومی خدمت گزار کے قلم سے پڑھیے:

---

(۶۹) اس بیٹھک میں ایک بڑا ہال کمرہ درمیان میں تھا، سامنے مختصر سا دالان اور دالان کے دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ہال کمرے میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے کلاسیں شروع کیں، ایک کمرہ دفتر کے لیے، ایک رہائش اور آرام کے لیے مخصوص تھا۔

(۷۰) مولانا عبداللہ سورتی: ''رفیق محترم'' ترجمان دارالعلوم

''دار الفکر قائم تو کیا گیا جدید عربی زبان وادب کی تعلیم وتمرین کے لیے؛ لیکن وہاں طلبہ کی اخلاقی، ذہنی اور فکری تربیت بھی کی جاتی تھی۔ اہم علمی موضوعات پر مباحث کا سلسلہ بھی تھا۔ طلبہ کو تعلیم کے مقاصد اور ذمے داریوں سے آگاہ بھی کیا جاتا تھا۔ اِس طرح دار الفکر کا فیض یافتہ ہر طالب علم؛ علمی اعتماد، فکری شعور وآگہی، ذہنی بالیدگی اور احساسِ ذمے داری کا پیکر بن کر، باہر آتا تھا اور یہ دراصل سب کچھ فیض تھا حضرت الاستاذ کا، جو اس اِدارے کے بانی اور روحِ رواں تھے۔ انھوں نے دار الفکر کے ذریعے مردم خیزی اور کردار سازی کی ایک مہم شروع کی تھی اور اس مہم کو، کام یابی کے ساتھ آگے بڑھانے میں ان کی فعال، متحرک اور سیمابی شخصیت، شب وروز مصروفِ کار رہتی تھی۔''(۷۱)

یہاں آغازِ کار سے ہی مولانا کے ہم سفر اور ہم صفیر مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ (۷۲) (متوفی ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء) تھے۔ پھر مولانا عبدالرؤف عالی

---

(۷۱) مولانا محمد اسرار الحق قاسمی اسسٹنٹ سیکریٹری آل انڈیا ملی کونسل وسابق ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند: ''ہمارے شفیق استاذ'' ترجمان دار العلوم۔

(۷۲) مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ:

دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ حضرت مدنیؒ کے شاگرد اور انتہائی عقیدت مند تھے۔ آپ نے حضرت مدنیؒ پر ''شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات'' لکھی جو بہت مقبول ومشہور کتاب ہے۔ مولانا کیرانویؒ سے شروع سے ہی یارانہ تھا اور زندگی بھر وہ اس تعلق پر قائم رہے۔ وہ ایک پختہ قلم ادیب تھے، ان کی تحریروں میں بڑی روانی، نزاکت، لطافت اور خاص قسم کی ادبی چاشنی ہوتی تھی۔ وہ ان خوش نصیبوں میں تھے جن کی تحریروں کو پڑھتے وقت طوالت کے باوجود اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ شعر وشاعری سے بھی دل چسپی تھی۔ بڑے ظریف، مرنجامرنج طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو انتہائی دل چسپ ہوتی تھی، برجستہ فقرے اور شعر ان کی نوکِ زبان پر رہتے تھے۔ پاکیزہ نفس، پاکیزہ طبیعت اور پاکیزہ کردار آدمی تھے۔ ان کا دل انسیت ومحبت کا ←

شریک قافلہ ہوئے، جو ''القاسم'' جدید کی ذمے داریوں میں شریک تھے۔ یہاں بے تکلف احباب کی آمد ورفت رہتی۔ جمعہ کی شب میں نمازِ عشا کے بعد اجتماعی کھانے کا پروگرام بھی ہوتا، جس کے شرکاء میں اس وقت کے منیجرِ مدنی کتب خانہ: قاری علاء الدین ہردوئی، مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ، مولانا عبدالرؤف عالی اور مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی بانی و مہتمم جامعہ دارالسلام مالیر کوٹلہ پنجاب ہوا کرتے۔ وقتاً فوقتاً احباب کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہ مجلس سج دھج، ظرافت و بذلہ سنجی، زندگی و زندہ دلی اور ادب و سلیقے میں پورے دیوبند میں مشہور و معروف ہوگئی تھی۔

اس مجلس کے ایک رکن، مجلس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''مجلسیں جمتی تھیں، طرح طرح کے علمی پروگرام بنتے تھے، کھانا بنتا، ہنسنا بولنا، غمِ روزگار سے بے نیاز، طالب علمی کے سارے دن جیسے لوٹ کر آگئے تھے۔ مولانا وحید الزماںؒ ہر دن ایک نیا پروگرام بنا کر سامنے رکھ دیتے تھے۔ مولوی ابوالحسن صاحب بے تکلفی سے کہہ دیتے تھے کہ ''اس فکری کی کھوپڑی میں ہر وقت ایک پلان تیار رہتا ہے۔''(۷۳)

← گہوارہ تھا۔ سچائی، وفا شعاری، رواداری سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے والہانہ تعلق تھا۔ اجلاس صد سالہ کے موقع سے تقریباً ایک سال تک دیوبند رہ کے تحریری خدمات انجام دیں۔ ایک عرصے تک جمعیۃ علما کے ''مرکز دعوتِ اسلام'' کے شعبے میں جو مولانا کیرانویؒ کے زیرِ نگرانی تھا، دیوبند میں کام کیا۔ پھر وہ بارہ بنکی واپس چلے گئے۔ پچھلے کئی سال سے ''موئی''، ضلع بارہ بنکی کے ایک قدیم مدرسے سے وابستہ تھے۔ مکاتب و مدارس کا قیام ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

افسوس ہے کہ ۲۹ر جون ۱۹۹۸ء (۳ر ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ) بہ روز دوشنبہ بہ وقت دوپہر، اپنے وطن ''دھنولی''، ضلع بارہ بنکی میں یرقان کے عارضے کا شکار ہوکر اپنے ربِ شکور سے جا ملے۔

(۷۳) مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی: ''باتیں ان کی، یادیں ان کی'' ترجمان دارالعلوم۔

عربی کلاسوں، اور ''القاسم جدید'' رسالے کی اشاعت کے علاوہ مولاناؒ نے ابھرتے ہوئے تصنیف وتالیف کی صلاحیت رکھنے والوں کو، دعوت دی کہ ادارے سے وابستہ ہوکر اپنی کاوشوں کو جاری رکھیں، ادارہ ان کی نگارشات کو، ان کے نام سے منظرِ عام پر لائے گا۔ اسی کے ساتھ آپ کے ذہن میں ایک معیاری دارالکتب قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا، جس کے ذریعے ایسی کتابوں کی اشاعت ہو جو مضامین، کتابت، طباعت اور ڈیزائن کے زیورِ حسن سے آراستہ ہوں۔ اس کام کے لیے بڑے سرمایے کی ضرورت تھی۔ دیوبند کے ایک متمول عالم مولانا شوکت علی خاں مرحوم بھٹے والے (محلّہ قلعہ دیوبند) اس مکتبے کے قیام کے لیے راضی ہوگئے۔ پہلے چھوٹی چھوٹی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ اس مکتبے کا نام ''مکتبہ نظامیہ'' تھا۔ اس کے معیارِ طباعت واشاعت کو دیکھ کے دیوبند کے دوسرے تاجرانِ کتب کو اپنی تجارت کے لیے خطرہ محسوس ہوا، کہ ان کے چراغ مدھم نہ پڑ جائیں؛ چناں چہ پراسرار طریقے سے مولانا کے خلاف سازشیں شروع کردیں اور مولانا شوکت علی خاں کے دل میں شکوک وشبہات کے بیج بوکر، اس شجرِ نو کو جڑ سے قطع کردیا۔ اس مکتبے کے بند ہونے سے مولاناؒ کو شدید صدمہ پہنچا؛ کیوں کہ اس کو ترقی دینے میں رات دن محنت کی تھی؛ لیکن آپ صبر ورضا کے پیکر تھے اس صدمے کو خاموشی سے برداشت کرلے گئے۔(۷۴)

عربی کا جو خداداد ذوق، اللہ پاک نے آپ کو ودیعت کیا تھا، اس کو عام

(۷۴) سید احمد رامپوری مشہور فنان وخطاط: ''میرے مرشد، میرے رہنما'' ترجمان دارالعلوم۔

کرنے کے لیے اور برصغیر کی ادبی تاریخ کے ایک بڑے خلا کو پر کرنے کے لیے، فراغت کے بعد اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ سے جڑنے سے قبل سے ہی، آپ نے اپنی مشہور جدید عربی لغت کی کتاب ''القاموس الجدید'' (اردو عربی) ترتیب دینی شروع کردی تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے ہاں کام کے زمانے میں یہ کام رک گیا تھا، دارالفکر کے قیام کے ساتھ ہی آپ نے القاموس الجدید (اردو سے عربی) اور القاموس الجدید (عربی سے اردو) تصنیف فرمائی، جو اسی زمانے میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ ڈکشنری مرتب کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے برابر سائز کے کاغذ کے ٹکڑے کاٹ کر ان پر الفاظ لکھتے، پھر ان کو حرفوں کے حساب سے الگ الگ ڈبوں میں رکھتے جاتے، مکمل ہونے کے بعد، ان کاغذ کے ٹکڑوں کو کاپی میں منتقل کرتے۔ سلیقہ اور نظم ان کی ہر بات میں تھا۔ (۷۵)

القاموس الجدید کی تالیف و اشاعت کے دوران، مولاناؒ کو کس کس طرح کی زہرہ گداز پریشانیوں سے گزرنا پڑا؟ ان کا بیان دارالفکر کے ان کے مخلص رفیقِ کار مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ کی شگفتہ و لطیف زبان میں پڑھیے:

> ''القاموس الجدید کی پہلی طباعت کے سلسلے میں، مولاناؒ کو کتنے زہرہ گداز مراحل سے گزرنا پڑا، اس کا کچھ اندازہ صرف اس ایک واقعے سے ہوسکتا ہے: پوری کتاب کی ترتیب اور صبر آزما کتابت (۷۶) کے بعد

---

(۷۵) مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی۔

(۷۶) دونوں ڈکشنریوں کی کتابت مولاناؒ نے اپنے قلم سے ہی کی تھی، ''القاسم جدید'' کی کتابت بھی خود ہی کرتے تھے: کیوں کہ آپ بڑے خطاط اور خطاط گر بھی تھے۔

جب کتابت شدہ کاپیاں مرحوم کے مخلص اور بے تکلف دوست مولانا خالد صاحب اعظمی کے ''کوہ نور'' پرنٹنگ پریس دہلی، پہنچ گئیں اور شاید ہفتہ عشرہ میں طباعت ہونے ہی والی تھی کہ صرف ''القاموس الجدید'' کی کتابت شدہ کاپیاں، چوہے درمیان سے اس طرح کتر گئے، جیسے خاص اسی کام کے لیے پلان بنا کر آئے ہوں؛ کیوں کہ وہیں رکھی ہوئی دوسری متعدد کتابوں کی کتابت شدہ کاپیاں بالکل محفوظ رہیں؛ مگر اس قسم کی باتوں کا مولاناؒ کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ مولاناؒ ساری آفت رسیدہ کاپیاں دہلی سے دیو بند لائے اور ان کے متاثرہ حصوں پر بہ طور پیوند دوسرا کاغذ چسپاں کرنے کے بعد از سرِ نو کتابت مکمل کر لی۔''(۷۷)

دار الفکر کی ترقی اور مولانا کی علمی وفکری سرگرمیوں کے نئے، انوکھے اور ولولہ انگیز انداز اور روز افزوں ترقی پذیر پروگراموں کو دیکھ کے، اس زمانے میں بھی کچھ لوگوں کو حسد ہوا اور انھوں نے مولاناؒ کو دیو بند سے اکھاڑنے کی کوشش کی۔ دار الفکر میں کھڑکی کے راستے دھمکی آمیز خطوط لکھ کے ڈالے جاتے؛ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ مولانا کا آفتاب، ایک روز ضرور نصف النہار پر تاباں ہوگا اور ہمارے چراغ کی روشنی معدوم ہو جائے گی۔(۷۸)

دار العلوم دیو بند میں تقرر

پچھلے صفحات میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ مولاناؒ چوں کہ حیدر آباد میں

---

(۷۷) مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ: ''شہید نازِ اربابِ تقوی: مولانا وحید الزماں کیرانویؒ'' ترجمان دار العلوم۔

(۷۸) سید احمد رامپوری۔

علامہ مامون دمشقی سے عربی زبان سیکھنے کے بعد آئے تھے؛ اس لیے طالب علم ہونے کے باوجود، دارالعلوم کی عربی زبان سے متعلق خدمات وہی انجام دیتے تھے۔ پھر پانچ سالہ طالب علمی میں ہمیشہ ممتاز نمبرات سے کام یاب ہوے۔ ادب واحترام کے سلوک کی وجہ سے اساتذہ کے نزدیک محبوب تھے۔ فراغت کے بعد ان کی علمی وفکری سرگرمیاں اساتذہ سے مخفی نہ تھیں۔ دارالفکر کے قیام سے آپ کی صلاحیتیں طلبہ واساتذہ کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکیں اور دارالعلوم میں آپ کا آوازہ گونجنے لگا۔ ارباب حل وعقد کو شدت سے احساس ہوا کہ دارالعلوم میں عربی زبان اور طلبہ کو تہذیب وثقافت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے، مولانا کیرانویؒ ایسے سپوت فرزند کی خدمات حاصل کرنی ضروری ہیں۔

چناں چہ اس وقت کے ناظم تعلیماتِ دارالعلوم دیوبند علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ کی تحریک پر تقسیمِ اسباق کے اجتماع میں، اس وقت کے اکابر اساتذہ نے مولاناؒ کو یکم ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ/ ۲۶ر فروری ۱۹۶۳ء سے، بہ طور اجیر استاذ، دارالعلوم میں تدریس کی سفارش کی؛ تاکہ حسبِ ضابطہ، مشاہدۂ کار کے بعد، مجلس شوریٰ سے باقاعدہ استاذ منتخب کیے جانے کی سفارش کی جاسکے۔ علامہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ، ۱۹ر شوال ۱۳۸۲ھ = ۱۵ر فروری ۱۹۶۳ء کو مہتمم صاحب دارالعلوم کے نام اپنے ضابطے کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''بہ گرامی خدمت حضرت مہتمم صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تقسیمِ اسباق کے اجتماع میں، جس

میں احقر اور جناب محترم حضرت مہتمم صاحب اور مولانا سید فخر الحسن صاحب، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا ظہور احمد صاحب شریک ہوے: احقر نے یہ ذکر کیا تھا کہ مجلس شوریٰ میں اس کا تذکرہ بہت دنوں سے آرہا ہے کہ عربی تقریر وتحریر سے طلبہ عاجز نظر آتے ہیں۔ مصر سے بھی علما آئے؛ مگران کے آنے سے بھی جو ذوق مطلوب تھا، وہ پیدا نہیں ہوا اور جو کچھ کام یابی ہوئی، وہ کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتی۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ علمائے مصر اردو نہیں جانتے۔ اس پر غور وفکر کرتے ہوے یہ تجویز سامنے آئی کہ مولوی وحید الزماں کیرانوی دار العلوم کے فاضل ہیں اور ان کو عربی کی تحریر وتقریر میں اچھی مہارت ہے، ان کی استعداد پر نظر کرتے ہوے، مجلس کو یہ امید ہوئی کہ وہ اس سلسلے میں وقیع خدمات انجام دے سکیں گے۔ نیز مختصر نصاب جو افریقی طلبہ کے لیے تجویز کیا جارہا ہے، اس میں سے کچھ تعلیم بھی ان کے سپرد کردی جائے۔ سب کی رائے سے یہ بات طے ہوئی کہ سردست یکم ذی قعدہ ۱۳۸۲ھ (۲۶ر فروری ۱۹۶۳ء) سے ایک سال کے لیے بہ مشاہرہ (۱۱۰) ایک سو دس روپے بہ حیثیت اجیر، اُن کو رکھ لیا جائے۔ ایک سال کی کارکردگی پر نظر کرنے کے بعد، ملازمت مستقلہ کی حیثیت میں، ان کے درجے و گریڈ کے تعیین کے ساتھ مجلس شوری سے تقرر کی منظوری حاصل کی جائے گی۔ حسب قاعدہ تنفیذ فرمادی جائے۔ اور احقر کی یہ رائے بھی ہے کہ افریقی طلبہ کی علمی واخلاقی نگرانی بھی مولوی صاحب موصوف

کے متعلق، خارج اوقات میں کردی جائے اور اس کا معاوضہ کم از کم ۵۰ روپے ماہ وار ہونا چاہیے۔ اس معاوضے کی ادائے گی اہل افریقہ کے ذمہ ہوگی۔ فقط والسلام

محمد ابراہیم، ۱۹/۱۰/۱۳۸۲ھ

چناں چہ ایک سال کے بعد مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۶/رجب ۱۳۸۳ھ =۴/نومبر ۱۹۶۳ء نے مولاناؒ کو ترقی کے ساتھ، با قاعدہ استاذ مقرر کیا۔ علامہ بلیاویؒ ۲۹/رجب ۱۳۸۳ھ = ۱۷/نومبر ۱۹۶۳ء کو تعلیمات کی طرف سے مجلس شوریٰ کے حکم کو نافذ کرنے کی سفارش کرتے ہوئے، ضابطے کی تحریر میں فرماتے ہیں:

''بہ گرامی خدمت حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم

سلام مسنون۔ مولوی وحید الزماں صاحب کے متعلق مجلس شوریٰ مؤرخہ ۱۶/۷/۱۳۸۳ھ میں تعلیمات نے درخواست کی تھی کہ ان کا تقرر درجۂ وسطیٰ ب میں کر دیا جائے، اس درخواست کو مجلس شوریٰ نے منظور فرمالیا ہے۔ درجہ وسطیٰ ب کے گریڈ پر ان کا تقرر ۱۷/۷/۱۳۸۳ھ سے مستقل کر دیا گیا ہے۔ بہ غرض تنفیذ مرسل ہے۔''

فقط والسلام

محمد ابراہیم عفی عنہ، ۲۹/۷/۱۳۸۳ھ

مولاناؒ نے اپنی وہبی صلاحیتوں کے ذریعے، دار العلوم میں جو کچھ کیا، دار العلوم کا ہر انصاف پسند مؤرخ اسے آبِ زر سے لکھنے پر مجبور ہوگا۔ صف

ابتدائی، صف ثانوی، صف ثالث کے تین درجوں کے ذریعے (جن میں ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء سے قبل تک مختصر المعانی کے درجے تک طلبہ شریک ہوتے رہے۔ شوال ۱۳۸۷ھ/ دسمبر ۱۹۶۷ء سے شرح جامی کے درجے سے ہی طلبہ کو شریک کرنے کا فیصلہ ارباب دارالعلوم نے لیا) نیز دارالعلوم کی تدریس کے ابتدائی دور سے ہی النادی الادبی[۷۹] (عربی انجمن) کے قیام کے ذریعے، مولاناؒ نے عربی زبان کی ہمہ گیر تعلیم، ہمہ گیر تربیت، ہم دردی وغم خواری، دردِ دل، اتحاد و یگانگت، احساسِ ذمے داری، راست بازی، اولوالعزمی، خودداری، خودشناسی، خود اعتمادی، محنت وجاں فشانی، انتظامی واجتماعی صلاحیت، تہذیب وتمدن کی عملی استعداد سازی، نظم ونسق، پابندیِ اوقات، جرأت و بے باکی اور ظاہر و باطن کی یک سانیت پر قائم رہنے کی جو گراں قدر سوغات بانٹی؛ اس کے پانے، اس سے فائدہ اٹھانے اور اپنے دین ودنیا کی راہوں کو مستنیر کرنے والے، بے شمار تعداد میں نہ صرف برصغیر میں؛ بل کہ عرب وعجم کے قریہ وشہر میں ہنوز موجود ہیں۔

کتاب کے گزشتہ صفحات میں، راقم الحروف مولاناؒ کے البیلے تعلیمی

---

(۷۹) ''النادی الادبی'' کے تعارف، دائرۂ کار اور ہمہ گیر سرگرمی کو جاننے کے لیے پڑھیے کتاب کا عنوان: ''النادی الادبی، ایک جامع مدرسہ''۔ نیز مولانا ندیم الواجدی قاسمی دیوبندی کا مضمون ''کچھ حقائق کچھ تاثرات'' خصوصاً اس کا ذیلی عنوان ''النادی الادبی، ایک مکمل ادارہ'' ترجمان دارالعلوم۔

قابل ذکر ہے کہ اس عربی انجمن سے ہر سال تقریباً تین سو طلبہ وابستہ ہوکر، عربی زبان کی تقریری اور تحریری مشق کرتے تھے۔ اس کے تحت ایک درجن سے زائد عربی میں قلمی دیواری رسالے نکالے گئے، جن سے طلبہ کو انشا وصحافت کا سلیقہ پیدا ہوا۔ النادی کے ذریعے نہ صرف تحریری وتقریری صلاحیت بیدار کی گئی؛ بل کہ طلبہ میں انتظامی اور قائدانہ لیاقت بھی پیدا کی گئی۔

ندریسی طرز پر لکھ چکا ہے؛ یہاں مولانا کے ایک مشہور و معروف تلمیذ رشید کے خوب صورت قلم سے، مولانا کی دارالعلوم میں لائی ہوئی بہار کی مختصراً نقشہ گری کو درج کرنے کو جی چاہتا ہے:

''قدرت نے ان کو (مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کو) علم وفضل اور جہد وعمل کی سرفرازیوں سے نوازا تھا: اخلاق کریمانہ تھا، دل درد میں ڈوبا ہوا تھا، ذہن کشادہ تھا، فکر میں بے پناہ وسعت تھی اور خیالات جدت طراز تھے؛ لیکن شریعت پر مضبوط گرفت تھی۔ طلبہ کے ساتھ باپ جیسا سلوک کرتے تھے۔ وہ زبردست پدرانہ شفقت کے حامل تھے۔ وہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے تھے اور اپنا آشیانہ پھونک کر روشنی بخش دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ان کی یادیں اور محبتیں، ان کا علمی وقار و عظمت، طلبہ کی تعلیم و تربیت میں ان کی مسلسل محنت اور عرق ریزی کے گہرے نقوش، میرے ذہنی کینوس پر مرتسم ہو کر لافانی اور لازوال ہو چکے ہیں۔

''...اس خوش خبری سے (کہ دارالعلوم میں عربی زبان کا شعبہ کھل رہا ہے، جس کے سربراہ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ہوں گے) طلبہ کے چہرے کھل اٹھے۔ انھیں اس بات کی بے حد مسرت تھی کہ اب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے علمی تبحر اور فکری تجدد سے، زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہونے کا موقع میسر آئے گا۔ راقم السطور کا دورۂ حدیث کا سال تھا۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ اگلے تعلیمی سال، فنون میں داخلہ

لوں گا اور ایک سال مادر علمی میں مزید رہ کر، حضرت الاستاذؒ سے بھی فیض یاب ہوسکوں گا۔ نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا اور شعبہ کھل گیا...

''عربی زبان وادب کی نئی بہار آگئی، نئی نصابی کتابیں، نیا طریقۂ تعلیم ، نیا اسلوبِ بیان، تدریس و تدریب کا نیا طرز، آلاتِ درس کا استعمال، اوقات کی تجدید و تقسیم اور مناسب ومفید استعمال سے ایک نیا ماحول پیدا ہوا، جس میں ذوقِ مطالعہ کو فروغ ملنے لگا۔ عربی زبان میں قلمی جرائد کا سلسلہ شروع ہوا، عربی خطابت وصحافت کے میدانوں میں طلبہ کی فطری صلاحیتیں پروان چڑھنے لگیں، عربی خطاطی کے فن کو عروج بخشا گیا... نظم وضبط اور ڈسپلن کی زندگی پر زور دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے، اس کے دل کش مناظر ہر طرف نظر آنے لگے۔ درد محسوس کرنے اور درد بانٹنے کا مزاج پیدا کیا گیا اور مواسات ومواخات کے چشمے ابل پڑے۔ اکرام واحترام اور عقیدت ومحبت کا درس دیا گیا اور استاذ وتلمیذ، ہم عصر وہم درجہ جیسے رشتوں کے تقدس میں، انوکھا نکھار آگیا۔ اور یہ سب کچھ وہ نیا ''تعلیمی انقلاب'' اپنے دامن میں سمیٹ کر لایا، جو حضرت الاستاذ کی تشریف آوری سے مادر علمی میں بپا ہوا تھا۔ حضرت الاستاذ نے ''دارالفکر'' میں طلبہ کی کردار سازی کی جو مہم محدود پیمانے پر شروع کی تھی، انھوں نے اس مہم کو یہاں نہ صرف جاری کیا؛ بل کہ اس کو مزید وسعت دی۔ انھوں نے موم کی بتی کی طرح ہمیشہ اپنے جسم و جان کو پگھلایا اور اپنے طلبہ کی زندگیوں میں حیاتِ نو اور نئی تازگی پیدا

کی۔ اپنا آرام وراحت قربان کیا اور اپنے طلبہ کے لیے زندگی بھر کی راحتوں کا سامان مہیا فرمادیا۔ ...ان کی ذات طلبہ برادری کا مرجع وملجا بن گئی تھی۔ ان کی محبت وعقیدت کی جڑیں، طلبہ کے دلوں میں گہری ہوگئیں۔" (۸۰)

۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء تک مولانا نے تمام صفوف کو تنہا پڑھایا؛ لیکن کام کی وسعت اور طلبہ کی کثرت کو دیکھتے ہوے آپ کی درخواست پر مجلس شوریٰ صفر ۱۳۸۸ھ/ اپریل ۱۹۶۸ء نے دارالافتا کے طلبہ میں سے ایک معین بہ طور اجیر پندرہ روپے ماہ وار پر ایک گھنٹہ یومیہ کے لیے آپ کو دیا، جو صف ابتدائی کے طلبہ کو پڑھانے پر مامور ہوے۔ اس حقیر نے بھی صف ابتدائی کا سبق ایک لائق فاضلِ دارالعلوم اور اُس وقت دارالافتا کے نمایاں طالب علم (۸۱) سے پڑھا تھا۔

چند سال بعد یعنی صفر ۱۳۸۸ھ/ اپریل ۱۹۶۸ء میں مولاناؒ کو درجۂ وسطیٰ الف میں ترقی ملی۔ پھر ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں درجۂ علیا میں ترقی دی گئی اور ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء میں عربی زبان وادب کے ساتھ حدیث کی دو مشہور کتابوں طحاوی شریف اور نسائی شریف کا درس بھی دیا۔

مولاناؒ نے جو کچھ پڑھایا، اس میں ان کا تمام اساتذہ کے درمیان — ان کے اپنے اپنے مقام کے اعتراف کے ساتھ — امتیاز رہا۔ وہ جو کچھ

---

(۸۰) مولانا محمد اسرار الحق قاسمی: "ہمارے شفیق استاذ"۔

(۸۱) یعنی مولانا مفتی ابوالقاسم بنارسی سے، جو اس وقت جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، بنارس کے استاذ حدیث وفقہ اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممتاز رکن ہیں۔

بولتے ایسا بھرپور بولتے، جو کچھ کہتے اس طرح مؤثر انداز میں کہتے کہ ساری باتیں ایک ایک لفظ یاد ہو جاتیں۔ اتنا مزے دار، اتنا بابرکت درس میں نے زندگی میں نہ عجم میں سنا اور پڑھا اور نہ عرب میں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کے درس میں طلبہ کو فن سے بھی عشق ہو جاتا اور خود ان کی ذات سے بھی۔ ان سے پڑھنے والا شاید ہی کوئی بدبخت ہو، جس کو ان سے محبت اور ہمیشہ کے لیے لازوال عقیدت پیدا نہ ہوگئی ہو۔ اس قاعدے سے وہی طالب علم مستثنیٰ رہا ہوگا، جس کو خود اپنی ذات سے بدگمانی رہی ہوگی اور دنیا کی تمام صالح قدروں کا منکر رہا ہوگا۔

ادب و زبان کے اسباق میں وہ ایک جگہ صرف ایک معنی بتانے پر اکتفا کرتے، جو وہاں پر منطبق ہوتا، دوسرا معنی ہرگز نہ بتاتے کہ لغت پڑھانے اور زبان پڑھانے کا فرق باقی رہے، نیز یہ کہ ایک ہی جگہ کئی کئی معنی بتادینے سے، طالب علم کا ذہن مشوش ہو کر کسی ایک معنی کو بھی صحیح طور پر گرفت میں نہیں لے پاتا۔ مولاناؒ نے مقامات حریری کے سبق میں بھی یہی روش اختیار کی، جس میں اساتذہ عموماً اپنا علمی رعب قائم کرنے کے لیے، طلبہ کو ایک لفظ کے کئی کئی معنی ضرور بتاتے ہیں اور کوئی معنی ڈھنگ سے یاد نہیں ہوتا۔

بہت سی غلط روشوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ایک غلط روش کو، جو پرانے زمانے سے قائم تھی، مولاناؒ ہی نے ختم کیا۔ وہ یہ کہ دورانِ درس طلبہ اساتذہ کو روک کر جا بہ جا استفسار کے انداز میں سوال کرتے، استفسار کا مقصد، متعلقہ مسئلے کو سمجھنا کم اور استاذ پر اپنی صلاحیت کا رعب قائم کرنا زیادہ ہوتا تھا۔

مولانؒا ہر سال اسباق کے آغاز میں اعلان کر دیتے کہ اگر میں "سَبُّوْرَۃٌ" (تختۂ سیاہ) کا ترجمہ "رجسٹر حاضری" کروں، تو کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا اور نہ درس کے بیچ میں بول سکتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ آج دار العلوم میں کوئی طالب علم درس کے دوران، اساتذہ کے لیے بلا ضرورت کی خلل اندازی کا باعث نہیں ہوتا۔

بعض دفعہ اساتذہ اظہار ظرافت و مزاح کے لیے، غیر مناسب جملے غیر شعوری طور پر درس میں بول جاتے ہیں، مولانا کا درس شرافت، ادب اور ظرافت کا نمونہ ہوتا اور لب و لہجہ انتہائی مہذب ہوتا تھا۔ فصیح و بلیغ اردو عربی دونوں پر ماہرانہ اور قابل رشک و قابل تقلید قدرت تھی۔ کوئی تکیۂ کلام بھی ان کا نہ تھا۔ وہ "سمجھے" "خیال فرمایا" "ہاں تو سمجھے" یا اس طرح کے کسی لفظ یا جملے کی تکرار کبھی نہ کرتے۔ درس کی جو رونق، بانکپن، البیلاپن، خوش رنگی، جماؤ، وقار، ثمر خیزی، برکت، کم وقت میں زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر فائدہ، دین و دنیا کا شعور اور مادر علمی اور اس کے اکابر سے محبت و شیفتگی کی فضا: ان کے یہاں دیکھی، وہ اس کم علم و کم شعور کو کہیں اور دیکھنے کو نہ ملی۔

دعوۃ الحق کا اجرا

مجلس شوریٰ ۱۸؍ رجب ۱۳۸۳ھ = ۶؍ نومبر ۱۹۶۳ء کی تجویز اور مجلس عاملہ ۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲۷؍ ستمبر ۱۹۶۴ء کے فیصلے کے بہ موجب رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ/ دسمبر ۱۹۶۴ء سے سہ ماہی مجلّہ "دعوۃ الحق"

کا اجرا عمل میں آیا اور آپ کو اس کی ادارت سپرد کی گئی۔ اس کا پہلا شمارہ شوال ۱۳۸۴ھ/ جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ دعوۃ الحق کے ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ = اپریل ۱۹۷۵ء میں بند ہو جانے کے بعد، جب ۱۱ر جمادی الاخری ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۰ر جون ۱۹۷۶ء سے اس کی جگہ پر پندرہ روزہ ''الداعی''(۸۲) شائع ہوا، تو کچھ عرصے تک اس کی ادارت اور سرپرستی بھی آپ ہی کے سپرد رہی۔(۸۳)

صد سالہ اجلاس اور مولانا کا کارنامہ

مارچ ۱۹۸۰ء = جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ میں دارالعلوم نے عدیم المثال اجلاس صد سالہ منعقد کیا، جس میں ہند و بیرون ہند سے تقریباً تیس (۳۰) لاکھ لوگوں نے شرکت کی اور عرب و عجم کے جہاں دیدہ و برگزیدہ بزرگوں نے اجلاس کے منبر سے فرمایا کہ میدان ''عرفات'' کے بعد فرزندان اسلام کا اتنا بڑا اجتماع، انھوں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔

اس کے لیے غیر معمولی تیاریاں بہت پہلے سے کی گئیں۔ انتظامات کو سلیقے

---

(۸۲) اب یہ صفر - ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق اگست ۱۹۹۳ء، جلد نمبر ۱۷ سے ماہوار اور باوقار شکل میں بڑے سائز کے ۴۸ صفحات پر نکل رہا ہے۔ دمِ تحریر رمضان ۱۴۲۱ھ = دسمبر ۲۰۰۰ء میں اس کی ۲۴ویں جلد چل رہی ہے۔

(۸۳) بعد میں اس کی ادارت مولانا ہی کی سرپرستی میں ان کے لائق شاگرد مولانا بدرالحسن قاسمی کو سپرد کی گئی۔ ۲۶ر جمادی الاخری ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ر مارچ ۱۹۸۲ء کو دارالعلوم میں نئے انتظامیہ کی استواری کے بعد جب انھوں نے اس کی ادارت چھوڑ دی، تو شوال ۱۴۰۲ھ مطابق جولائی ۱۹۸۲ء سے اس کی ذمے داری حضرت الاستاذ کے مشورے سے دارالعلوم کے ذمے داروں اور مجلس شوریٰ نے راقم الحروف کے دوشِ ناتواں پہ ڈالی؛ چناں چہ ۷ر محرم ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کو احقر نے اس کا شمارہ نمبر ۱ جلد نمبر ۶ اپنی ادارت میں نکالا اور اب تک اس کی بڑھتی ہوئی ذمے داری اسی کے سپرد ہے۔

سے انجام دینے کے لیے اکیس۲۱ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ مولاناؒ کی غیر معمولی انتظامی لیاقتوں کی وجہ سے، ان میں سے اکثر کمیٹیوں کا کنویز نامزد کیا گیا۔

مولانا کا زبردست کارنامہ اس موقع سے، صرف آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں، مالیہ کی فراہمی کے لیے اندرونِ ملک کے طوفانی دوروں کے ساتھ، دارالعلوم کی طویل وعریض عمارتوں کی تزئین وترمیم اور نئی عمارتوں کی تعمیر کا کام تھا۔ صد سالہ سے پہلے والی عمارت اور مولانا کے ذریعے اس کی حسن کاری اور تعمیرِ نو والی عمارتوں کے موازنے کے بعد، مولانا کے ذوق تعمیر، مہندسانہ لیاقت، جاں کاہی، قوتِ عمل اور مادر علمی کے لیے، اپنی صحت وتوانائی کو نچھاور کر دینے کے جذبے کی قدر ہوتی ہے۔(۸۴) اس موقع سے نہ صرف بوسیدہ اور مرمت طلب عمارتوں کی تزئین وتجدید کی؛ بل کہ بہت سی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں، جن میں مسجد قدیم کا صدر دروازہ؛ دارالعلوم کے صدر دروازے کی بالائی منزل، احاطۂ کتب خانہ کا دومنزلہ برآمدہ؛ دفتر تعلیمات؛ دار جدید کی بالائی منزل کے بہت سے کمرے، جو ہر دو کمروں کے بیچ میں ایک کمرے کے بہ قدر خالی جگہ میں بنائے گئے؛ دارالحدیث فوقانی کی دائیں اور بائیں جانب دو درس گاہیں اور ان کے سہ طرف برآمدے قابل ذکر ہیں۔(۸۵)

کئی ماہ تک مسلسل اور شب وروز مشغول رہنے کی وجہ سے، وہ اس لائق

---

(۸۴) اجلاس صد سالہ کے متعلق مزید جان کاری کے لیے پڑھیے کتاب کا عنوان ''دارالعلوم کا اجلاس صد سالہ اور مولانا کا ناقابل فراموش کارنامہ''۔

(۸۵) صد سالہ کے موقع سے مولانا کی تعمیری سرگرمی اور شبانہ روز جاں کاہی کو قدرے تفصیل سے جاننے کے لیے پڑھیے ڈاکٹر محمد معروف قاسمی دیوبندی کا مضمون ''تعمیراتی کارنامے'': ترجمان دارالعلوم۔

بھی نہ رہے کہ اجلاس کی کسی نشست میں شریک ہوسکیں۔ نحیف و ناتواں، مجموعۂ امراض تو تھے ہی، شب و روز کی جہد مسلسل اور خوراک اور دوا و علاج سے لاپرواہی کے نتیجے میں وہ بسترِ علالت پر پڑ جانے پر مجبور ہوے۔ حالاں کہ ان کی عربی و اردو فصاحت و بلاغت، غیر معمولی انتظامی صلاحیت اور نظم و نسق کا استاد ہونے کی وجہ سے بہ جا طور پر توقع تھی کہ اسٹیج پر ان کو بار بار رونق افروز ہوتے، بل کہ اجلاس کی کارروائی کی ذمے داری کو چار چاند لگاتے ہوے دیکھنے کا ہم تمام شاگردوں، عقیدت مندوں اور محبین کو موقع ملے گا؛ لیکن وَمَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ.

کیمپ دارالعلوم ۔۔دارالعلوم کی تاریخِ نو کا آغاز

اجلاس صد سالہ کے بعد بدقسمتی سے دارالعلوم کے حالات خراب ہوتے چلے گئے، جس کی ابتدا صد سالہ کے موقع سے ۲۲/ مارچ ۱۹۸۰ء (۴/ جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ) کو ''عالمی موتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' اور ۸/ اپریل ۱۹۸۰ء (۲۰/ جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ) کو اس کے متوازی ''تنظیم فضلا و ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' کے قیام سے ہوئی، جس سے باقاعدہ تصادم کی شکل پیدا ہوئی اور یہ تصادم دارالعلوم کے شدید خلفشار کا باعث بنا۔ اس خلفشار کے محرکات کو کچھ دیگر باتوں سے بھی تقویت ملی، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں[۸۶]

(۸۶) تفصیل کے لیے پڑھیے مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کا فاضلانہ اور انتہائی معلوماتی مضمون ''مولانا وحید الزماں اور دارالعلوم دیوبند'': ترجمان دارالعلوم ص: ۳۵۸-۳۸۴۔

الغرض بات بڑھتی گئی اور زبردست رسّا کشی کے بعد ۳۰؍اکتوبر ۱۹۸۱ء (۳۰؍محرم ۱۴۰۲ھ) کو حالات انتہائی خراب ہو گئے، دار العلوم بند کر دیا گیا اور پولیس کے سپرد کر دیا گیا۔ شام ہوتے ہوتے پولیس نے اعلان کر دیا کہ طلبہ ایک گھنٹے کے اندر دار العلوم خالی کر دیں، مدنی گیٹ پر بسیں آرہی ہیں، وہ اسٹیشن پہنچا دیں گی۔ دار العلوم کے دروازے بند کر دیے گئے۔ مدنی گیٹ پر جب بسیں آکر رک گئیں تو مولانا کیرانویؒ — جو ہمیشہ طلبہ کے لیے پدری شفقت کا نمونہ رہے اور ہر نازک موقع پر، طلبہ کے لیے شفا بخش مرہم کا کام دیتے رہے — دلِ دردمند اور فکرِ ارجمند کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ مولاناؒ نے طلبہ کو سامان کے ساتھ دار العلوم سے نکلتے دیکھا، تو وہ طلبہ کے لیے آغوشِ مادر بن گئے اور داروغہ سے پوچھا کہ طلبہ کا ان بسوں میں بیٹھ کر جانا ضروری ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، صرف اس لیے آئی ہیں تاکہ طلبہ اگر اسٹیشن جانا چاہیں تو انھیں وہاں پہنچا دیں۔ مولاناؒ نے جوش اور پیار کے ملے جلے لہجے میں طلبہ سے کہا: بسوں سے اتر آؤ، موتمر کے دفتر (۸۷) چلو۔ طلبہ سامان اور کتابوں کے ساتھ مؤتمر کے دفتر آ گئے، مغرب تک اس عمارت

---

(۸۷) مؤتمر کے دفتر سے مراد وہ عمارت ہے، جو دار العلوم کے مرحوم جامعہ طبیہ والے احاطے کے شمال مشرق کونے پر مقبرۂ قاسمیہ سے متصل واقع ہے، یہ عمارت عرصے تک ''مؤتمر بلڈنگ'' کے نام سے مشہور رہی، اب ''مسلم فنڈ بلڈنگ'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور نیچے ایک بڑے ہال کا نام ''محمود ہال'' ہے؛ اس لیے پوری بلڈنگ بھی ''محمود ہال'' کے عرف سے معروف ہے۔ اس میں دیوبند مسلم فنڈ، جس کی یہ ملکیت ہے ''آئی ٹی آئی'' اور ''آئی ہسپتال'' چلاتا ہے۔ کیمپ کے زمانے میں یہیں دفتر قائم تھا اور مولانا کی تاریخی سرگرمیاں، کیمپ کے حوالے سے اور دار العلوم میں نئے انتظامیہ کی استواری کے لیے، یہیں سے انجام پذیر ہوئیں۔

کی تینوں منزلیں طلبہ سے بھر گئیں، بہت سے طلبہ شہر کی مسجدوں میں مقیم ہوگئے۔ شہر میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ یہ منظر انتہائی اثر انگیز اور رقت خیز تھا، بہت سے لوگ طلبہ کو یک بہ یک بے سروسامانی کے ساتھ نکال دیے جانے کے اس منظر سے آب دیدہ نظر آئے۔ رکشے والے، جو عموماً اجڈ ہوتے ہیں اور عام دنوں میں ایک ایک پیسے کے لیے طلبہ سے الجھتے رہتے ہیں، اس دن طلبہ نے جہاں کہا، محبت اور عقیدت کے ساتھ بلا اجرت کے پہنچا دیا۔

کیمپ دار العلوم (۸۸) میں، اس وقت کے ریکارڈ کے اعتبار سے ۱۸۵۸ طلبہ تھے۔ اب اتنی بڑی تعداد کے شام کے کھانے کا مسئلہ تھا۔ مولاناؒ نے دیوبند کے مختلف محلوں میں جا کر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ طلبہ کے لیے، اپنے گھروں کا کھانا فوری طور پر پہنچا دیں اور اپنے بچوں کے لیے دوسرا کھانا پکا لیں۔ عشا تک اتنا کھانا آگیا کہ سب طلبہ کے لیے کافی ہوگیا۔

دوسرے دن شام کو محبانِ دار العلوم اور اساتذہ کے ساتھ مولاناؒ نے میٹنگ کی، جس میں متفقہ طور پر آپ کو کیمپ کا ناظم اعلیٰ اور مؤتمر کے طلبہ سے بھرے ہوئے دفتر کا نام ''کیمپ دار العلوم'' رکھ دیا گیا۔

کیمپ چلانا آسان نہ تھا اتنے سارے طلبہ کی رہائش، جاڑے میں ان

---

(۸۸) کیمپ دار العلوم کے حالات جاننے کے لیے پڑھیے کتاب کا عنوان'' کیمپ دار العلوم اور مولانا کے کارہائے شیشہ و آہن'' نیز مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کا مذکورہ بالا مضمون، اور مولانا مزمل الحق حسینی قاسمی کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کا مضمون ''کیمپ دار العلوم'': ترجمان دار العلوم، ص: ۳۸۵-۴۰۲، نیز مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی ویشالوی کا مضمون ''کیمپ کی ڈائری کے چند اوراق'' ص: ۴۰۳-۴۱۷، ترجمان دار العلوم

کے لیے اوڑھنے بچھانے کا سامان، خورد و نوش کا انتظام، تعلیم کا نظم، طلبہ کو لمبے عرصے تک مطمئن رکھنا۔ دوسری طرف پولیس اور سرکاری انتظامیہ سے نمٹنا، جو کیمپ کو کسی بھی لمحے ختم کردینے کے درپے تھا۔ پھر غلہ اور پیسوں کا اکٹھا کرنا۔ مولاناؒ نے یہ سارا کام جس حسن و خوبی سے انجام دیا، اگر اس طرح انجام نہ دیا جاتا، تو نہ کیمپ چلتا نہ دارالعلوم کے آج وہ دن ہوتے، جو آج ہیں۔ کیمپ کے قیام کے تیسرے ہی دن نقشۂ اسباق بنا اور اساتذہ کو کتابیں تقسیم کردی گئیں اور باقاعدہ کیمپ چل پڑا۔ مولانا نے ان سارے مسائل کا ایک بے باک اور جری قائد کی حیثیت سے مقابلہ کیا، جو کیمپ کے زمانے میں پیش آئے۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تھک ہار کے بیٹھ جاتا۔

وہ کیمپ کے پیچ در پیچ اندرونی و بیرونی مسائل کو حل کرتے، مقدمات سے نمٹتے، پولیس والوں سے نبرد آزما ہوتے، پریس والوں کو مطمئن کرتے، باہر سے بڑی تعداد میں آنے والے مہمانوں کا استقبال کرتے اور ان کو صحیح صورتِ حال سے مؤثر انداز میں آگاہ کرتے، شہر والوں سے رابطہ اور ان کو کیمپ کے ساتھ پیہم تعاون پر آمادہ رکھتے، کیمپ کی تعلیمی اور انتظامی نگرانی اور تعلیم و انتظام سے متعلق بروقت فیصلے کرتے، کیمپ کے لیے شہر اور شہر کے باہر سے مالیات و اشیائے ضروریہ کی فراہمی کرتے، نکتہ چینوں اور بدخواہوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی افواہوں کے جوابات دیتے۔ گوناگوں مسائل اور مصائب کے اس ہجوم میں اور کیمپ کے حاسدوں اور دشمنوں کی کڑی نگاہ اور ریشہ دوانیوں کے باوجود، کیمپ کے پانچ ماہ کے طویل عرصے

میں (جو ۳۰/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کی شام سے ۲۳/ مارچ ۱۹۸۲ء کی رات تک کو محیط تھا) کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں گزرا، جس سے لوگوں کو کسی بدنظمی یا بدمزگی کا احساس ہوا ہو۔ کیمپ کے سیکڑوں طلبہ، اساتذہ، کارکنان اور ہزاروں معاونین، مولاناؒ کی وجہ سے ایک متحد الخیال خاندان نظر آتے، جو کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں ہو۔ مولاناؒ کیمپ کی جزئیات اور تفصیلات سے ہر وقت آگاہ رہتے، ہر روز دفتر کے کارگزاروں کی رپورٹیں سماعت فرماتے اور آئندہ کے لیے ہدایات دیتے، خاص طور سے حساب و کتاب پر گہری نظر رکھتے، ہر ہفتے اور ہر ماہ آمد و صرف کے واضح گوشوارے مرتب کرواتے۔(۸۹)

کیمپ کا اختتام اور نئے انتظامیہ کا استحکام

۲۳/ مارچ ۱۹۸۲ء (۲۵/ جمادی الاخری ۱۴۰۲ھ) کی شب میں سابقہ منصوبہ بندی کے تحت ۲ بج کر ۲۰ منٹ پر، طلبہ کیمپ سے دارالعلوم میں در آئے۔ مولاناؒ شکر کے مرض کی شدت کی وجہ سے دو تین روز قبل سے جیون نرسنگ ہوم دہلی میں زیرِ علاج تھے۔ ۲۴/ مارچ کو دارالعلوم، کیمپ سے اندرون دارالعلوم آ گیا۔ ۲۷/ مارچ کو باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ اسی روز ایک جلسہ ہوا، جس میں اساتذہ نے تقریریں کیں اور استاذ الاساتذہ مولانا معراج الحق نے فرمایا کہ مولانا وحید الزماں کے بغیر آج دارالعلوم ایسا لگ رہا

(۸۹) مولانا مزمل الحق قاسمی حسینی: ''کیمپ دارالعلوم'' ترجمان دارالعلوم۔

ہے، جیسے جسم بغیر روح کے، ان کی صحت کے لیے دعا کیجیے۔ طلبہ نے زار و قطار رو رو کے دعا کی۔ یکم اپریل ۱۹۸۲ء (۶ر رجب ۱۴۰۲ھ) کو مولاناؒ دہلی سے تشریف لائے، باب الظاہر سے داخل ہوے، طلبہ کا ہجوم استقبال کے لیے ٹوٹ پڑا، پھولوں کی بارش کی گئی اور ''مولانا وحید الزماں، زندہ باد'' کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

دار العلوم کے باقاعدہ دوبارہ محوِ سفر ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد، آپ کو ناظم مجلس تعلیمی کا عہدہ تفویض ہوا اور حسبِ توقع آپ نے اس شعبے کو انتہائی سرگرم و فعال بنا دیا۔

پھر مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۲۵-۲۷ر صفر ۱۴۰۵ھ میں آپ کو ان الفاظ کے ساتھ معاون مہتمم کے منصب پر فائز کیا:

''رپورٹ اہتمام کے ضمن میں، دفتر اہتمام کی کارکردگی اور اس میں پائے جانے والے اضمحلال کے تدارک کا معاملہ زیر غور آیا۔ دار العلوم کے وسیع شعبہ جات اور ان کے کاموں کے پھیلاؤ کے پیش نظر، جب کہ ہر دو نائب مہتمم صاحبان، علالت اور ضعف و اضمحلال سے دوچار ہیں، مجلس شوریٰ ضرورت محسوس کرتے ہوے معاون مہتمم کے منصب کی منظوری دیتی ہے اور اس منصب کے لیے، موجودہ وقت میں قوت کارکردگی اور انتظامی صلاحیت کی بنیاد پر، مولانا وحید الزماں صاحب کا تقرر عمل میں لاتی ہے۔''

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان دنوں شدید علیل تھے؛ اس لیے وہ خود اور ان

کے اہل خانہ اور محبین، معاون مہتمم کے اس منصبِ گراں کو قبول کرنے سے متردد تھے؛ لیکن حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ، حضرت کے گھر پر تشریف لے گئے اور مجلس شوریٰ کے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ مولاناؒ نے معذرت کرنی چاہی، تو حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ نے فرمایا ''دارالعلوم کا کباڑا ہوگیا ہے، آپ اللہ کا نام لے کر اٹھیے اور دارالعلوم کی خدمت کیجیے ان شاء اللہ شفا ہوگی'' یہ جملہ سنتے ہی دارالعلوم کے اس عاشق نے، جو لحاف اوڑھ کے لیٹا ہوا تھا، لحاف اتار پھینکا اور دونوں مخدومانِ گرامی سے فرمایا کہ: ''اگر یہ بات ہے، تو میں جس حال میں بھی ہوں، تیار ہوں۔''

چناں چہ اگلے روز سے دارالعلوم آنا شروع کردیا اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے تمام دفاتر وشعبہ جاتِ دارالعلوم کو اِن الفاظ میں اطلاع فرمائی: ''حسبِ تجویزِ اجلاسِ مجلس شوریٰ مؤرخہ ۲۵-۲۷/صفر ۱۴۰۵ھ مطابق ۲۰-۲۲/نومبر ۱۹۸۴ء، حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب نے اپنے عہدے: ''معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند'' پر فائز ہوکر آج مؤرخہ ۷/ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق یکم دسمبر ۱۹۸۴ء سے، کارہائے مفوضہ کی انجام دہی شروع کردی ہے، شعبہ جاتِ متعلقہ کو بہ غرض اطلاع وضروری کارروائی ارسال ہے۔''

مولاناؒ نے حسبِ توقع اپنی لیاقت اور انتظامی صلاحیت سے تھوڑے ہی دنوں میں اہتمام اور ساتھ ہی تعلیمات — کہ وہ اس وقت تعلیمات کی مجلس تعلیمی کے بھی ناظم تھے — کی تمام کارروائیوں میں استحکام اور تیزی پیدا کردی،

بہت سی اصلاحات کیں، بہت سی رکاوٹیں دور کیں، کام کی رفتار کی راہ میں آنے والے مسائل کو آسانی سے حل کر دیا۔ دارالعلوم کے فراشوں کے لیے ''دفتر دار'' کا خوب صورت نام وضع کیا۔ سند کے حصول میں فضلائے دارالعلوم کو جو تقریباً ایک ماہ لگانا پڑتا تھا، اب صرف ایک ہفتے میں ملنے لگی۔ اساتذۂ دارالعلوم کو تن خواہ لینے کے لیے دفتر محاسبی جانا پڑتا اور کبھی کبھی لائن میں بھی بیٹھنا پڑتا تھا، آپ نے ان کی تن خواہ کی وصول یابی کا ایک نیا نظام قائم کیا اور دفترِ تعلیمات میں لفافوں میں بند کر کے دیے جانے اور لفافوں پر تمام وضعات کے درج کیے جانے کا طریقہ رائج کیا، جب کہ علیا کے اساتذہ کو تن خواہیں ان کے کمروں یا ان کے مکانات پر پہنچانے کا نظم فرمایا۔ اس کے علاوہ قلیل مدت میں بہت سی کارآمد تعمیرات کیں(۹۰) اور ان کے لیے ازخود مالیہ کی فراہمی کے لیے دورے کیے۔ ''آئینہ دارالعلوم'' کے نام سے ایک اردو پندرہ روزے کا اجرا فرمایا، جو کچھ دنوں ''پیام دارالعلوم'' کے نام سے نکلتا رہا۔ پھر ہر کام کو اپنے وقت پر کرنے کا دفتری عملے کو خوگر بنایا اور روزانہ کے کاغذات پر، روز کے روز عمل درآمد کی روش کو مستحکم کیا۔ مولانا نے اس سلسلے میں شب و روز اتنی محنت کی کہ ایک دفعہ مولانا معراج الحق صاحبؒ نے غایتِ شفقت سے آپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''اتنی محنت نہ کیجیے، دارالعلوم کو ابھی آپ کی بہت ضرورت ہے۔'' ممبرانِ شوریٰ نے تحریری اور زبانی طور پر آپ کی خدمات کو

---

(۹۰) اس دور کی، مولانا کی تعمیر کردہ عمارتوں کو اجمالاً جاننے کے لیے پڑھیے کتاب کا عنوان ''دارالعلوم کے نئے دور میں مولاناؒ کے تابندہ کارنامے''۔

بلند الفاظ میں سراہا، جس کے آپ بہ جا طور پر مستحق تھے۔

لیکن صرف دو سال کے بعد ہی کثرتِ کار اور کثرتِ امراض، نیز بعض دوسرے ناگزیر محرکات کی وجہ سے، آپ نے دارالعلوم کے ذمے داروں سے معاون مہتمم کی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو جانے اور حسبِ سابق تدریسی خدمات انجام دینے کی اجازت دینے کی درخواست کی، جس کو مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس صفر ۱۴۰۷ھ/ نومبر ۱۹۸۶ء میں، منظور کرلیا اور آپ نے حسبِ سابق طلبہ کو اپنی وہبی تدریسی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا شروع کردیا؛ پھر ۲۱-۲۲ر شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ کی شوریٰ نے آپ کو دارالعلوم کی ذمے داریوں سے سبک دوش کرنے کا فیصلہ کیا، جس کے بعد رسمی طور پر آپ کا دارالعلوم سے تعلق ختم تو ہو گیا؛ لیکن قلب وجگر میں اس کی یاد اور اس کے لیے ممکنہ خدمات کا جذبہ کبھی فرو نہ ہوا۔

دارالعلوم سے سبک دوشی کے بعد

اس کے بعد مولاناؒ نے اپنی بیماری اور ناتوانی کے باوجود، اپنے آپ کو لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مشغول رکھا کہ سستی، کاہلی اور جمود، ان کے بس کی بات نہ تھی، چناں چہ اشاعتی اور تالیفی ادارے ''دارالمؤلفین'' جس کو وہ ۱۹۸۸ء (۱۴۰۸ھ) میں قائم کر چکے تھے، جس سے تقریباً دو درجن گراں بہا کتابیں اشاعت کے اعلیٰ پیمانے پر شائع کیں اور اس کے ذریعے متعدد فضلائے دیوبند کو تصنیف وتالیف کا سلیقہ سکھایا، اسے مزید کچھ کام کرنے اور

اس کو استحکام دینے کی طرف متوجہ ہوے۔ حالات نے اور زندگی نے موقع نہ دیا؛ ورنہ ان کا ارادہ تھا کہ حضرت نانوتویؒ اور دیگر بنیاد گزاران و عظیم فرزندانِ دارالعلوم کی تالیفات کو جدید زمانے کے تقاضے کے مطابق شائع کریں گے۔ اس سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی بعض تصنیفات کی تسہیل و تحقیق کا کام شروع بھی کروا دیا تھا اور ایک دو شائع بھی ہوئیں۔

اس اثنا میں آپ نے ۱۸۰۰ صفحات کا ایک لغت ''القاموس الوحید'' کے نام سے لکھا، جو جامع ترین لغت ہے۔ یہ آپ کا آخری اور بڑا کارنامہ ہے، جو آپ کی دیگر علمی کاوشوں کی طرح آپ کی سرخ روئی اور نیک نامی کا ذریعہ ہے اور ان شاء اللہ آخرت میں ترقیِ درجات کا ذریعہ بھی بنے گا۔

اسی عرصے میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (۹۱) کی تفسیر قرآن ''معارف القرآن'' کے اہم مباحث کا خلاصہ ''جواہر المعارف'' کے نام

---

(۹۱) مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم الپاکستانی بن حافظ مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندیؒ، دارالعلوم کے چیدہ و برگزیدہ علما میں ہیں۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء میں دیوبند میں پیدا ہوے۔ تعلیم ساری کی ساری دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی۔ ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء میں فارغ ہوے۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس تقرر ہوا۔ ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۱ء میں دارالافتا دارالعلوم میں بہ حیثیت مفتی تقرر ہوا۔ ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہوگئے، جہاں ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں دارالعلوم کے نام سے ایک بڑا مدرسہ قائم کیا، جو پاکستان کا دیوبندی مکتبہ فکر کا ممتاز ترین مدرسہ ہے۔ حضرت شیخ الہند سے بیعت ہوے، ان کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ سے اجازت و خلافت حاصل کی۔ دو سو کے قریب تصنیفات ہیں۔ فقہ و افتا میں آپ کو کامل دست گاہ حاصل تھا، اس موضوع پر آپ کی ۹۵ کتابیں ہیں۔ ''معارف القرآن'' تفسیرِ قرآن آپ کا زندہ جاوید کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ علم و عمل کی جامع، اپنے نقش قدم پر چلنے والی اولاد چھوڑی، جو آپ کے لیے صدقۂ جاریہ اور علما کے لیے قابل رشک ہے۔ ۱۱ر شوال ۱۳۹۶ھ = ۶ر ۱ کتوبر ۱۹۷۶ء کی شب میں کراچی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

سے تیار کیا، جو مقبول و متداول ہے۔ نیز مشکوٰۃ شریف کے منتخبات کا کام بھی شروع کیا تھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ اواخر عمر میں ترجمہ قرآن پاک کا بھی آغاز کیا مگر عمر نے وفا نہ کی۔

تالیفات

مولاناؒ کی تالیفات میں اولیں کام کا تذکرہ ضمناً آچکا ہے کہ انھوں نے عام فہم اردو میں سات کتابیں ''مکتبۂ دینیات'' دہلی کے لیے لکھی تھیں، جو اسی وقت شائع ہوگئی تھیں۔ ان میں سے چار کتابوں کے نسخے مل سکے ہیں، جو دوبارہ اشاعت پذیر ہوئیں ہیں: ان کے نام یہ ہیں:

۱- اسلامی آداب، ۲- خدا کا انعام، ۳- انسانیت کا پیغام، ۴- شرعی نماز۔ دیگر تین کتابیں یہ تھیں: ۵- اچھا خاوند، ٦- اچھی بیوی، ۷- آخرت کا سفر نامہ۔

اس کے بعد کی سب سے پہلی تالیف ۸- القاموس الجدید (اردو سے عربی ہے) جس کا کام آپ نے دارالعلوم سے فراغت کے بعد ہی شروع کر دیا تھا؛ لیکن اس کی تکمیل ''دارالفکر'' میں کی اور اسی زمانے میں ۹- القاموس الجدید (عربی سے اردو) تالیف فرمائی اور اس کی پہلی اشاعت دہلی میں آپ ہی کی کتابت سے ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں چھوٹے سائز کے تقریباً ۱۲۰۰- صفحات پر ہیں اور دیوبند میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابیں ہیں؛ بل کہ ہندوستان میں شاید دو چار ہی کتابیں اتنی فروخت

ہوتی ہوں گی؛ کیوں کہ مولاناؒ نے ان دونوں کتابوں میں عربی اخبارات و رسائل کو ماخذ بنایا ہے، جن میں روزمرہ کی اصطلاحات اور زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق زندہ تعبیریں اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر بے مثال کتابیں ہیں۔

۱۰- القاموس الاصطلاحی (عربی سے اردو) یہ چھوٹے سائز کے تقریباً ۵۵۰ صفحات پر ہے، جب کہ ۱۱- القاموس الاصطلاحی (اردو سے عربی) اسی سائز کے تقریباً ۴۵۰ صفحات پر ہے۔ یہ دونوں کتابیں، القاموس الجدید (عربی۔ اردو؛ اردو- عربی) کا تتمہ ہیں؛ کیوں کہ مولاناؒ کو اس کا احساس ہوا کہ القاموس الجدید کی تالیف پر ایک عرصہ گزر چکا ہے، اس دوران بہت سے الفاظ اور تعبیرات معرضِ وجود میں آئی ہیں، لہٰذا ان کو بھی القاموس کا حصہ ہونا چاہیے؛ تاکہ استفادے کے رواں دواں قافلے کو تشنگی کا احساس نہ ہو۔ ان نئے الفاظ کو القاموس الجدید کے اندر ضم کرنا چوں کہ وقت طلب کام تھا؛ اس لیے مولاناؒ نے علاحدہ سے باقاعدہ دو کتابوں کی شکل میں چھاپ دیا۔ یہ دونوں کتابیں بھی قاموسین ہی کی طرح کثیر الاشاعت ہیں۔

۱۲- نفحۃ الأدب، دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد کے اصرار پر یہ کتاب ''نفحۃ الیمن'' کی جگہ پر تالیف کی گئی؛ کیوں کہ ثانی الذکر میں بعض ایسے نامناسب قصے درج ہیں، جو کم عمر طلبہ کے اخلاق و کردار کے لیے زہر قاتل ہیں۔ یہ متوسط سائز کے ۹۶ صفحات پر ہے، دارالعلوم اور ہندوستان کے مدرسوں میں ہر جگہ داخل نصاب ہے۔

۱۳-شرح نفحۃ الادب، یہ ''نفحۃ الادب'' کی دلیل ہے، یہ مولانا نے دارالعلوم سے سبک دوشی کے بعد تحریر فرمائی۔ اس سے طلبہ اور اساتذہ کو کتاب کے حل کرنے میں خاصی سہولت ہوتی ہے۔

۱۴-القراءۃ الواضحۃ، یہ مولانا کی اہم ترین کتابوں میں ہے۔ یہ تین جلدوں میں ہے اور ہر جلد چھوٹے سائز کے تقریباً سو صفحات کی ہے۔ یہ ریڈنگ بک ہے اور عربی زبان کو قواعد کا زیادہ سہارا لیے بغیر سیکھنے کی کلید ہے؛ اسی لیے نہ صرف برصغیر کے اکثر مدرسوں میں داخل نصاب ہے؛ بل کہ ہندوستان کے معتد بہ سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے، جہاں عربی زبان وادب کی تعلیم کا نظم ہے۔ یہ کتاب دارالعلوم کی تدریس کے زمانے میں تالیف ہوئی۔

۱۵-شرح القراءۃ الواضحۃ۔ یہ القراءۃ الواضحۃ تینوں جلدوں کی تین جلدوں میں شرح اور دلیل ہے۔ جس سے عربی الفاظ اور جملوں کی صحیح تعبیریں مل جاتی ہیں۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

۱۶- جواہر المعارف۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا، یہ کتاب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کی آٹھ جلدوں پر مشتمل ضخیم تفسیر قرآن، کے اہم مباحث کا مجموعہ ہے اور بڑے سائز کے تقریباً ۷۰۰ صفحات پر ہے۔ مقبول ومتداول ہے۔

۱۷- القاموس الوحید (عربی اردو) یہ بڑے سائز کے تقریباً دو ہزار صفحات پر لغت کی کتاب ہے، مولانا کی آخری زندگی کا آخری کارنامہ ہے

اور جدید وقدیم الفاظ کا مجموعہ ہے، اس کے بعد طلبہ اور اساتذہ دیگر لغات سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ مولاناؒ کے برادر اوسط مولانا عمید الزماں کیرانوی نے شب و روز کی محنت کے بعد اس کی مراجعت کی ہے اور ۱۰۰ صفحات کا گراں قدر مقدمہ لکھا ہے۔ مولاناؒ کی زندگی میں یہ گراں مایہ کام منظر عام پر نہ آ سکا، اس کا افسوس ہے۔

۱۸- سلسلۃ الدروس العربیہ- یہ کتاب طبع نہ ہو سکی؛ بل کہ نایاب ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں طلبہ کو عربی سکھانے کے لیے، عربی کے اسباق لکھ کر دار العلوم کی دیواروں پر آویزاں کرتے تھے، یہ اسی کا مجموعہ ہے۔

۱۹- نخبۃ الاحادیث۔ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کی منتخب حدیثوں کے ترجمے اور ان کے ذریعے اصلاحی و دعوتی اسباق مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ طلبہ میں عربی کا ذوق، حدیث سے پیدا کرنے کے کام کا آغاز، زندگی کے اواخر میں کر دیا تھا؛ لیکن افسوس ہے کہ یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔

۲۰- ترجمہ قرآن پاک۔ زندہ اردو زبان میں روزمرہ کا لحاظ کرتے ہوئے، قرآن پاک کے ترجمے کے کام کا مولانا نے ارادہ کر لیا تھا اور زندگی کے آخری دنوں میں کام کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ افسوس ہے کہ آغاز سے آگے نہ بڑھ سکے۔

۲۱- ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب سے واپسی پر محمد احمد کاظمی مرحوم ممبر پارلیامنٹ کی کتاب ''تقسیم ہند اور مسلمان'' کا ''تقسیم الھند والمسلمون فی الجمھوریۃ الھندیۃ'' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا

تھا۔ یہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اگر دارالعلوم دیوبند کے جھگڑوں میں فریق نہ بنتے اور جیسا کہ زندگی کا آغاز تصنیف وتالیف اور علمی وثقافتی کاموں سے کیا تھا، آخر تک اسی راہ پر گام زن رہتے، تو آج برصغیر کے چیدہ مؤلفین میں ان کا نام سرفہرست لوگوں میں ہوتا اور عربی زبان کا تو ممتاز ترین کتب خانہ تیار ہو جاتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضیات ومقدرات کی بات ہے کہ وہ متضاد سمتوں میں محوِ سفر ہو گئے۔

لیکن تلامذہ کی جو نسل انھوں نے تیار کر دی ہے، وہ ان کا زندہ کتب خانہ اور متحرک تالیفات ہیں اور ان کے ذریعے، ان کا کام جاری وساری اور ان کا نام روشن رہے گا۔

اسفار

ہندوستان: صد سالہ اجلاس کے موقع سے، نیز معاون مہتمم کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد، دارالعلوم کے لیے مالیہ کی فراہمی کے لیے یوپی، خصوصاً اس کے مشرقی علاقوں کا طول طویل دورہ کیا۔ اہم علما وفضلائے مدارس سے ملے، عوامی جلسوں کو بھی خطاب کیا، قریہ قریہ اور شہر شہر گئے اور اپنے مقصد میں کام یاب رہے۔

اس کے علاوہ بھی مشرقی اور جنوبی ہند میں اپنے تلامذہ ومحبین کے اصرار پر متعدد جگہ تشریف لے گئے۔ اور چند گڑھ کولھاپور، مہاراشٹر کے ایک

مدرسے میں تو کچھ دنوں باقاعدہ قیام بھی فرمایا۔

حجاز: ۱۹۵۶ء میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کے ساتھ قیام کے زمانے میں ایک وفد گدول مشن کے طور پر حجاز کیا تھا، نو ۹ ارکان پر مشتمل یہ وفد مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ گیا۔ ۴۲ روزہ سفر میں مولاناؒ ہی ترجمانِ وفد تھے۔

یورپ و افریقہ: نئے انتظامیہ کے قیام کے بعد، رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ = جون ۱۹۸۲ء میں آپ نے دارالعلوم کے اس وقت کے تنگ دستی کے حالات کے پیش نظر، لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دارالعلوم کی مالی مدد کے لیے راغب کرنے کی خاطر ماریشش، ری یونین اور انگلینڈ وجنوبی افریقہ کا دورہ فرمایا، جہاں ہندی نژاد مسلمانوں کی بڑی تعداد برسرروزگار ہے اور شروع سے دارالعلوم کی خدمت کرتی آئی ہے۔ دورے کا اختتام آپ نے مصر کے سفر سے کیا۔ وہاں متعدد اخبارات میں آپ کے دعوتی وادبی انٹرویو چھپے، جن میں ''لواءالاِسلام'' سرفہرست تھا۔

۲۶/ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ = ۱۶/ستمبر ۱۹۸۲ء کو اس سفر سے دیوبند واپس تشریف لائے، تو طلبہ نے زبردست استقبال کیا، تلہڑی چنگی سے دارالعلوم تک طلبہ دوطرفہ قطار میں کھڑے تھے اور قائد ملت، شیخ الادب وغیرہ کے فلک شگاف نعرے لگارہے تھے۔

اس موقع سے دارالحدیث میں طلبہ نے جو زبردست جلسہ کیا، اس کی صدارت حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ نے فرمائی۔ مولانا وحید الزماںؒ نے طلبہ سے فرمایا: میں آپ کے لیے صرف ایک پیغام لایا ہوں، جو میرے

سفر کا نچوڑ ہے: آج یورپ اور افریقہ کی روح پیاسی ہے، نوجوان طبقہ اسلام قبول کرنے کے لیے بے چین ہے؛ لیکن آج ان کے اعتراضات کا جواب دے کر انھیں مطمئن کرنے والا کوئی نہیں۔ آپ کی کھیپ کی کھیپ دیگر مسائل کی طرح اس مسئلے کو بھی حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ خدارا اب خلوص کے ساتھ اس میدان میں آیئے اور تبلیغ و دعوت کے فرائض انجام دے کر دنیا کو ضلالت و گمراہی کے عمیق غار سے نکالیے۔

ریاض: اگست-ستمبر ۱۹۹۲ء (ربیع الاول-ربیع الآخر ۱۴۱۳ھ) کے عرصے میں، ریاض میں اپنے تلامذہ کے اصرار پر وہاں کا سفر فرمایا۔ طلبہ نے روزانہ کی مجلس قائم کی اور اس طرح استفادہ کیا، جیسے طالب علمی کا ان کا زمانہ لوٹ آیا ہو۔ وہاں کی سربرآوردہ شخصیتوں سے ملاقات ہوئی اور علمی و ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔

۱۸/ اگست - ۱۸/ ستمبر ۱۹۹۴ء (۱۰/ ربیع الآخر- ۴/ جمادی الاخری ۱۴۱۵ھ) کے عرصے میں انھی تلامذہ کی درخواست پر، ریاض کا دوسرا سفر ہوا۔ فضلا نے جوق در جوق آپ سے استفادہ کیا۔ مولاناؒ نے باہمی اتفاق واتحاد پر زور دیا اور دین وملت کی خدمت پر نوجوانوں کو راغب کیا۔

سعودی عرب، بحرین، متحدہ عرب امارات: ۱۹۷۷ء/ ۱۳۹۷ھ میں جمعیۃ علمائے ہند کے ایک سہ رکنی وفد کی سربراہی کرتے ہوئے، متعدد عرب ممالک، یعنی سعودی عرب، بحرین اور متحدہ عرب امارات وغیرہ کا دورہ کیا۔

کویت: ۱۶- ۱۸/ رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹-۲۱/ جنوری ۱۹۹۲ء کو

کویت میں، وزارت اطلاعات ونشریات کی طرف سے، بغداد میں قید کویتی افراد کی رہائی پر زور دینے کے لیے ایک کانفرنس "المؤتمر العالمي للإفراج عن الأسرى والمحتجزين الكويتيين وغيرهم في سجون النظام العراقي" کے عنوان سے منعقد ہوئی تھی۔ اس میں وزارت کی طرف سے مولاناؒ، راقم الحروف، مولانا سید احمد ہاشمی اور ہندوستان کے متعدد اہل علم مدعو تھے۔ مولاناؒ کی سربراہی میں ہمارا تین نفری وفد اس کانفرنس میں شریک ہوا۔ ہوٹل میریڈیان میں قیام رہا اور ایک ہفتے بعد واپسی ہوئی۔

حج کا سفر: جون ۱۹۹۰ء (ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ) میں وزارت حج واوقاف سعودی عرب کی دعوت پر حج وزیارت سے شرف یاب ہوے۔

قطر: مولاناؒ کے بڑے صاحب زادے: مولانا بدرالزماں کیرانوی تقریباً ایک دہائی تک قطر میں برسرروزگار رہے، ان کے وہاں قیام کے دوران، دو مرتبہ قطر تشریف لے گئے اور وہاں کی علمی و دینی اور سیاسی شخصیات سے ملاقاتیں کیں اور امت مسلمہ کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔

پہلا سفر ستمبر ۱۹۹۲ء (ربیع الآخر ۱۴۱۳ھ) میں ہوا اور دوسرا سفر ستمبر ۱۹۹۴ء (جمادی الاخری ۱۴۱۵ھ) میں ہوا۔ قطر کے یہ دونوں اسفار سعودی عرب کے مذکورہ بالا اسفار کے اختتام پر ہوے۔

دبی: قطر کے سفر کے ساتھ ہی وہاں مقیم اپنے بعض شاگردوں کے اصرار پر ایک ہفتے کے لیے، دبی کا سفر فرمایا اور مختلف دینی و علمی حلقوں میں آپ کا تعارف ہوا۔

مختلف دینی وملی وثقافتی خدمات

طویل عرصے تک جمعیۃ علما کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور دو دہائیوں تک نکلنے والے جمعیۃ علماء کے عربی پندرہ روزہ ترجمان ''الکفاح'' کے بانی ورئیس تحریر رہے — جس کا پہلا شمارہ اکتوبر۱۹۷۳ء (شوال ۱۳۹۲ھ) میں اور آخری شمارہ دسمبر ۱۹۸۷ء (جمادی الاولی ۱۴۰۸ھ) میں نکلا تھا — اس کے علاوہ جمعیۃ کے تصنیفی شعبے ''مرکزِ دعوت اسلام'' کے ڈائریکٹر بھی رہے، جو آپ ہی کی تحریک پر قائم کیا گیا تھا۔ اس شعبے سے متعدد علمی اور اصلاحی کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۹۸۸ء میں دہلی میں منعقدہ ملی کنونشن میں ''ملی جمعیۃ علمائے ہند'' کا قیام عمل میں آیا اور آپ کو بہ اتفاق رائے اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے اس پلیٹ فارم سے بہت سے علما وقائدین کے ساتھ ملکی وملی معاملات میں بہت سی مفید خدمات انجام دیں۔ متعدد جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوے اور آپ کی گراں قدر تقریروں اور مشوروں سے عوام وخواص نے روشنی حاصل کی۔

۱۹۹۲ء میں مرکزی جمعیۃ علما کا قیام عمل میں آیا، آپ اس کے بھی صدر منتخب ہوے۔ نیز مختلف مدرسوں اور اداروں کی مشاورتی مجلسوں کے ممبر رہے۔

عربی کا ذوق اور اس کی تعلیم کی خداداد صلاحیت

مولاناؒ نے علامہ مامون دمشقی سے حیدرآباد میں، بہت مختصر عرصے میں،

عربی زبان کے تعلم کے حوالے سے جو فائدہ اٹھایا، اس کے سوا مولاناؒ نے عربی کے حوالے سے کسی با قاعدہ استاذ کی شاگردی نہیں کی؛ بل کہ مامون دمشقی نے جو ذوق وشوق ان کے اندر پیدا کر دیا تھا، اس کے سہارے از خود محنت کے ذریعے، وہ عربی زبان کے عدیم المثال خادم بن گئے اور اس کی تدریس کے حوالے سے تو شاید و باید ہی ایسا کوئی استاذ برصغیر میں عصر حاضر میں پیدا ہوا ہوگا۔

ایک مشہور معاصر نے عرصہ قبل عربی زبان پر ان کی اتنی شاندار گرفت کے حوالے سے، دار العلوم دیوبند ہی میں، ان سے انٹرویو لیا تھا، جب یہ راقم الحروف بھی دار العلوم کا طالب علم تھا۔ یہ انٹرویو ''الجمعیۃ ویکلی'' کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے مولاناؒ سے سوال کیا: مولانا! سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیے کہ دیوبند کے ماحول میں آپ نے جدید عربی اور عربی زبان میں لکھنے بولنے کی صلاحیت، کس طرح پیدا کی؟

مولاناؒ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے اِس سلسلے میں جو کچھ حاصل کیا ہے، بغیر کسی استاد کے حاصل کیا ہے۔''

اس کے بعد مولاناؒ نے حیدر آباد کے سفر اور مامون دمشقی صاحب کی مختصر سی رفاقت و مصاحبت کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ ''اس کے علاوہ باضابطہ طور پر ان سے عربی سیکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی؛ مگر میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی، فوراً کسی نہ کسی شکل میں استفادہ شروع

کر دیتا... بد قسمتی سے یہ سلسلہ صرف چند مہینے جاری رہ سکا، تاہم اس تجربے سے مجھے ایک خاص فائدہ ہوا۔ حیدر آباد کے سفر سے پہلے، عربی زبان میرے لیے بس اس طرح کی ایک چیز تھی، جس کو میں نے ''نحو میر'' جیسی کتابوں میں پایا تھا۔ یعنی فَعَلَ فَعَلُوْا کی گردان وغیرہ۔ اب معلوم ہوا کہ عربی ایک زندہ زبان ہے، جو اردو کی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں یہ میرے لیے گویا ایک دریافت تھی، جس نے میرے سامنے ایک نئی دنیا کھول دی۔''

پھر انھوں نے پوچھا کہ علامہ مامون دمشقی سے چھوٹنے کے بعد آپ نے عربی سیکھنے کے لیے کیا صورت اختیار کی، تو مولاناؒ کا جواب تھا۔

''اس کے بعد میں کتب خانہ آصفیہ جانے لگا، وہاں روزانہ ۵-۶ گھنٹے مطالعہ کرتا۔ مطالعے میں عربی اخبارات و رسائل خصوصیت سے دیکھتا تھا۔ اِس طرح عربی کی شد بد ہوگئی، یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں، میں نے دارالعلوم دیو بند آکر داخلہ لیا۔ داخلے کے وقت عربی تو کچھ بول لیتا تھا؛ مگر عربی رسائل وغیرہ پڑھنے کی استعداد ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔''

پھر ان کا سوال تھا کہ دارالعلوم میں آپ کی عربیت کے ذوق کے لیے کیا مواقع ملے؟ تو مولاناؒ نے فرمایا: ''جہاں تک دارالعلوم کا تعلق ہے، اس وقت یہاں اِس سلسلے میں کچھ نہیں تھا، حتی کہ عربی انشا بھی نہیں تھی۔ مجھے بالکلیہ طور پر خود سے محنت کرنی پڑی اور اس معاملے میں اپنے شوق اور لگن کے سوا کوئی چیز میری راہ نما نہ تھی۔''

پھر انھوں نے پوچھا: پھر آپ نے کیا صورت اختیار کی؟ مولاناؒ کا جواب تھا:

''میں نے عربی اخبارات ورسائل حاصل کر کے پڑھنے شروع کیے؛ مگر استعداد کا عالم یہ تھا کہ ماہ نامہ ''العرب'' کے ایک ایک صفحے کو دس دس بار پڑھتا تھا، پھر بھی پوری بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میرے پڑھنے کا ایک خاص طریقہ تھا۔''

عربی زبان کے مطالعے کا نتیجہ خیز اور عربی آموز طریقہ

پھر مولانا نے مزید فرمایا:

''میرے مطالعے اور پڑھنے کا ایک خاص طریقہ تھا: میں کسی مضمون کو اس اعتبار سے نہیں پڑھتا تھا کہ اس میں جو بات ہے، وہ کیا ہے؟ بل کہ صرف اس اعتبار سے دیکھتا تھا کہ کسی مفہوم کو عربی میں کس طرح ادا کیا گیا ہے؟ میں ایک جملے کو لیتا اور پھر اس کی اردو تعبیر کو سامنے رکھ کر غور کرتا، کہ ایک بات کو عربی میں کس طرح تعبیر کیا جاتا ہے اور اردو میں کس طرح؟ فرض کیجیے، ایک جملہ ہے: سَأَشْكُوكَ إِلَى أَبِيكَ بِأَنَّكَ تَغِيبُ عَنِ الدَّرْسِ كَثِيرًا ۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم عربی عبارت کا اجمالی مفہوم سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے؛ اس لیے وہ عربی اور اردو تعبیر کے فرق کو نہیں سمجھ پاتا۔ مثال کے طور پر مذکورہ جملہ سمجھنے میں ایک طالب علم کو دقت پیش نہیں آئے گی؛ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ

اس کی عربی بناؤ کہ ''میں تمھارے والد سے شکایت کروں گا'' تو عین ممکن ہے کہ وہ کہہ دے: سَأَشْكُوكَ مِنْ وَالِدِكَ ۔ میرا طریقہ تھا کہ جب اس طرح کا جملہ آیا، تو میں نے خصوصیت سے نوٹ کیا کہ ایسے موقع پر عربی میں شکایت کے ساتھ ''إلیٰ'' کا صلہ آئے گا۔ اس طرح مطالعے میں میرا انہماک اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اکثر ایسا ہوتا کہ میں پورا مضمون پڑھ ڈالتا؛ بل کہ کئی کئی بار پڑھتا، اس کے باوجود، اس سے لاعلم رہتا کہ پورے مضمون میں بات کیا کہی گئی ہے؛ کیوں کہ میرا ذہن عام طور پر اخذِ تعبیرات پر مرکوز رہتا تھا۔''(۹۲)

مولانا نے اپنی محنت اور اپنے مطالعے سے عربی زبان سیکھنے کا جو طریقہ اپنے اس انٹرویو میں بتایا ہے، یہی بات وہ ہم سبھی طلبہ کو درس گاہ میں بھی ہمیشہ کہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ انتہائی مفید طریقہ ہے۔ اس کے بعد مولاناؒ نے طالب علمی کے زمانے میں جو طلبۂ دارالعلوم کو عربی کی مشق کرائی، اسباق لکھ لکھ کے دیواروں پر چسپاں کیے، اس کے بعد دارالعلوم میں مدرس ہوے اور عربی کی تدریس اور طلبہ کو خطابت وصحافت پر لگایا، نیز خود بھی ''دعوۃ الحق'' کے ذریعے باقاعدہ صحافت کے میدان میں قدم رکھا؛ اس سے ان کو عربی بولنے، عربی لکھنے، عربی زبان کے ماحول میں رہنے اور عربی ماحول بنانے کا ایسا ذوق پیدا ہو گیا کہ وہی معاصر جنھوں نے مذکورہ انٹرویو لیا تھا، انٹرویو کے لیے دارالعلوم آنے سے قبل، مولانا سے دہلی میں تعارف اور پھر دیوبند میں

(۹۲) مولانا وحیدالدین خاں مدیر ''الرسالہ'' نئی دہلی: ''مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ کی یاد میں'' ترجمان دارالعلوم۔

ان سے ان کے کمرے میں ملاقات کی خوب صورت داستان کو، ذیل کے دل آویز الفاظ میں لکھتے ہیں:

''جولائی ۱۹۶۷ء کی ایک شام تھی۔نئ دہلی کی ایک مجلس میں کچھ علما جمع تھے اور عرب ممالک کے حالات پر بات ہو رہی تھی۔اس مجلس کا خاتمہ ایک شخص کی گفتگو پر ہوا۔گفتگو کے آخر میں تمام حاضرین نے محسوس کیا کہ موصوف کو اس موضوع سے خصوصی تعلق ہے۔ان کی شخصیت، ان کا انداز اور ان کا لب ولہجہ: ہر چیز میں ایک دل آویز قسم کی عربی شان نظر آتی تھی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا، جیسے میں ایک ''ہندوستانی عرب'' سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ایک ایسا شخص جو نسلاً ہندوستانی؛ مگر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے عربوں جیسا ہو۔ یہ مولانا وحید الزماں کیرانوی تھے، جن کی عمر تیس چالیس کے درمیان ہوگی۔آپ دارالعلوم دیوبند میں ادب عربی کے استاذ ہیں اور اسی کے ساتھ دارالعلوم سے نکلنے والے سہ ماہی عربی رسالہ ''دعوۃ الحق'' کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

''نئی دہلی کی مجلس کے بعد مجھے خصوصی اشتیاق ہوگیا کہ مولانا سے تفصیلی ملاقات کروں۔

''میں آپ سے ملنے کے لیے دیوبند آؤں گا'' میں نے کہا۔

''ضرور آیئے، مجھے آپ کو وہاں پا کر بے حد خوشی ہوگی'' مولانا کا جواب تھا۔

''حسن اتفاق سے یہ موقع جلد آ گیا، جولائی ۱۹۶۸ء کی ۱۵ر تاریخ

تھی۔ایک طالب علم کی راہ نمائی سے مجھے دار العلوم دیو بند کے دار جدید کے اوپر کے، ایک کمرے کے سامنے پہنچایا گیا۔ کمرے کی دیوار پر ''دعوۃ الحق'' کا خوب صورت بورڈ، اس بات کی علامت تھا کہ میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہوں۔

''السلام علیکم

''وعلیکم السلام

''اب میں مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے کمرے میں تھا، جو رسالے کا دفتر بھی ہے اور ان کی ذاتی رہائش گاہ بھی۔ وسیع کمرے میں دفتر اور رہائش کے دوگونہ تقاضوں کونہایت سلیقے کے ساتھ جمع کیا گیا تھا۔ کمرے کا فرش، الماریاں، کتابوں اور اخبارات ورسائل کے ذخیرے، دفتری ضروریات، رہائشی ضروریات کے سامان: ہر چیز اس طرح رکھی گئی تھی، جیسے انھیں کسی اور صورت میں ترتیب نہ دیا جا سکتا ہو۔اس کے ساتھ اس کمرے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اندر حیرت انگیز طور پر عربی تہذیب سموئی ہوئی تھی۔جس طرح کسی شدید موسم میں سڑک سے گزر کر ایرکنڈیشنڈ مکان میں داخل ہونے سے، یکا یک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح اس کمرے میں داخل ہوکر مجھے محسوس ہوا، جیسے میں ہندوستانی جغرافیے میں چلتے چلتے، اچانک عرب دنیا کے اندر داخل ہو گیا ہوں۔اس کمرے کے پورے ماحول میں ایک قسم کی عربیت چھائی ہوئی تھی، جو غیر شعوری طور پر اپنا احساس دلاتی تھی۔

''سرسری جائزے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ضروری سامان کو الگ کرلیا جائے، تو اِس کے بعد اس کمرے میں جو کچھ بچے گا، وہ عربی لٹریچر، عربی کتابیں، عربی رسائل اور عربی اخبارات ہوں گے۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ یہ کمرہ درحقیقت دارالعلوم کی اِس وسیع دنیا میں عربی ادب اور عربی تقریر وتحریر کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (۹۳)

عربی جاننے والے تو بہت ہوا کرتے ہیں، لیکن اپنی حرکات وسکنات اور گرد و پیش کو عربی کے رنگ میں رنگ دینے والے، تو صرف مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ہی تھے۔

ہم لوگ پڑھنے کے زمانے میں کہا کرتے تھے کہ مولاناؒ عربی میں ہی چلتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی چال بھی عام لوگوں سے الگ تھی۔ وہ چلتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی لکڑی، پانی پر سیدھی کھڑی بہی چلی جارہی ہے، دائیں بائیں زیادہ نہ جھکتے نہ ہاتھوں کو زیادہ حرکت دیتے۔

جب وہ بولتے تو کیا مجال ہے کہ سبقت لسانی سے کسی عربی جملے کی نشست میں، کسی طرح کی ناہمواری پیدا ہوجائے۔ اِعرابی اور لفظی غلطی، تو دور کی بات ہے کسی لفظ کو نہ تو وہ مجہول ادا کرتے اور نہ ہی غلط مخرج سے، خواہ کتنی جلدی اور کتنے غصے میں کیوں نہ بول رہے ہوں۔ ہم لوگوں نے عربی کے بڑے بڑے ادیبوں کو عربی میں سنا ہے؛ لیکن اس ہندی ''نژادِ عربی'' کی روانی،

---

(۹۳) مولانا وحیدالدین خاں

الفاظ کی صحت، عربی کے آمرانہ لہجے کی شناخت، کسی کے ہاں نہ دیکھی۔

ابھی وفات سے دو ایک سال پہلے کی بات ہے، کویت سفارت خانے میں انفارمیشن آفس کے ذمے دار: باسم لوغانی صاحب، راقم الحروف کی دعوت پر دار العلوم دیکھنے آئے۔ ذرا دیر کے لیے مولانا سے ان کے مکان پر ملنے گئے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے مولاناؒ سے پوچھا کہ آپ نے عربی کہاں سیکھی؟ مولاناؒ نے جواب میں جو گفتگو عربی میں کی، اس سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ کار میں بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا: ''میں شیخ وحید الزماں سے بہت متاثر ہوا، وہ تو عربوں سے اچھی عربی بولتے ہیں، اگر میں دیوبند آ کے ان سے نہ ملا ہوتا، تو یہاں سے گویا خالی ہاتھ جاتا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ان سے ملایا اور انھیں جاننے کا موقع دیا۔

۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء میں کویت کے سفر میں، جس میں راقم الحروف کو ان کی رفاقت کی سعادت ملی تھی، وزارتِ اوقاف کے سکریٹری سے گفتگو فرما رہے تھے، تو وہ اتنا متاثر تھے کہ بار بار سبحان اللہ کہتے اور مسلسل آپ کی طرف نظر گڑائے متوجہ رہے۔

وہ عربی کے بہت بڑے ادیب نہ تھے؛ لیکن سچی بات یہ ہے کہ بڑے سے بڑے ہندی نژاد عربی ادیب کو، ان کی طرح عربی ادب کی تعلیم دینے کا سلقیہ شاید ہی نصیب ہوا ہو۔ وہ چند روز میں طلبہ کو ذرے سے آفتاب بنا دیتے تھے۔ پھر یہ کم ہوتا ہے کہ آدمی عربی لکھنا بولنا بھی جانتا ہو اور اس کا اتنا ماہر خطاط اور خطاط گر بھی ہو۔ عربی ٹائپ کے حروف کو قلم سے لکھنے کے فن

کے موجد تھے۔ کتنے طلبہ مولاناؒ کی راہ نمائی سے عربی خطاط بن گئے اور روزی روٹی سے جڑ گئے۔ (۹۴)

پھر عربی زبان کی تعلیم کا ایسا شوق اور جذبہ تھا کہ وہ رات کے دو بجے تک طلبہ کو اخبارات و رسائل پڑھاتے رہتے اور طلبہ کے لیے اجازت تھی کہ وہ جب چاہیں آئیں اور استفادہ کریں۔ عربی کا اردو متبادل اور اردو کا عربی متبادل، اتنا صحیح بتاتے کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی۔ انھوں نے اپنی تنہا ذات سے دارالعلوم دیوبند پر عربی زبان و ادب کے سلسلے میں تہی دامنی کے الزام کو ختم کیا۔

شانِ امتیاز

مولانا کی بہت سی خصوصیات و امتیازات ان کو موروثی طور پر، ان کے والد سے، انھیں وراثتاً ملی تھیں۔ ان کے والد مولانا مسیح الزماں کیرانویؒ، صاف گو، قدرے غصیلے، فراخ طبیعت، کشادہ نفس، سخی، خوش مزاج اور غیرت و حمیت اور شجاعت و خودداری کا مجموعہ تھے۔ وہ کسی سے ناراض

---

(۹۴) قابل ذکر ہے کہ راقم الحروف کو بھی اس طرح کے خط کی، مولاناؒ کی تعلیم و تربیت سے، مہارت ہوگئی تھی اور مجھے مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے حضور میں باریابی دراصل ٹائپ کے طرز پر لکھی ہوئی ایک عربی تحریر ہی کی وجہ سے ہوئی، جو میں نے لکھی تھی اور جس کو مولانا سید محمد میاںؒ نے ایک ضرورت سے ان کے پاس بھیجا تھا۔ مولانا ندویؒ اس تحریر کو دیکھ کر اس درجہ خوش ہوئے کہ مولانا سید محمد میاںؒ کو لکھا کہ میں نے اتنا پاکیزہ عربی خط ہندوستان میں شاید و باید ہی کسی نوجوان کا دیکھا ہے۔ ہندوستان میں، میں بھی عربی کا ایک طالب علم ہوں، اگر آپ اپنے شاگرد کو مجھ سے ملنے یہاں بھیج دیں، تو خوشی ہوگی۔ یہ واقعہ بہت دل چسپ اور تفصیل طلب ہے، جوان شاء اللہ، اگر زندگی اور مشاغل نے موقع دیا، تو کسی اور تقریب سے ذکر کیا جائے گا۔

ہو جاتے، تو یہ چاہتے کہ وہ کھل کر معافی مانگے۔ اگر وہ معافی کا خواست گار ہوتا، تو غصے کا اثر اس طرح زائل ہو جاتا کہ اس کا کوئی اثر باقی نہ رہتا اور دل صاف ہو جاتا۔ وہ چور، ڈاکو، جن اور حوادث سے کبھی خوف زدہ نہ ہوتے تھے۔ سچائی اور ایفائے عہد میں طاق تھے۔ نماز کی پابندی اتنی تھی کہ عدالت میں مجسٹریٹ سے صاف کہہ دیتے کہ اب نماز کا وقت ہے، اس لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔ سفر میں گاڑیاں رکوا کے نماز ادا کرتے۔ وقت کے بھی انتہائی پابند تھے۔ غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ امرا و رؤسا کی دعوت میں عام طور پر شریک نہ ہوتے تھے۔ منتظم مزاج آدمی تھے اور ہمیشہ منظّم زندگی گزارتے تھے۔ وہ اپنے ملازمین اور اولاد کی طرف سے کسی سستی، کاہلی، کام چوری کو، قطعاً برداشت نہ کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ تمام باتوں میں وہ اپنے والد کی تصویر تھے، خصوصاً اس لیے بھی کہ ان کے والد نے ان پر اور ان کے تمام بھائیوں پر نظم و سلیقہ اور مستعدی اور ان تمام اوصاف کا رنگ چڑھانے کی بھرپور کوشش کی تھی، جن کو وہ خود برتتے تھے اور جن کو ایک مہذب اور سچے انسان؛ بل کہ اچھے مسلمان کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

مولانا نے خود لکھا ہے کہ:

''مکتب کے زمانے میں تاکید تھی کہ وقت پر سیدھے مکتب جانا اور سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا، کسی سے کلام یا ہنسی مذاق نہ کرنا، کوئی چیز کسی سے نہ لینا اور اختلاط سے بچنا... گھر سے باہر حتی کہ گھر کے چبوترے سے اتر کر

قریب میں بھی کہیں جانا ہوتا، وہ بھی بلا اجازت نہیں ہوتا تھا... مکتب میں پڑھنے والے محلے کے چند مہذب اور کم عمر ایک دو لڑکوں کو ہمارے گھر میں آ کر کھیلنے کی اجازت تھی۔ نماز کے وقت ہر کھیل ختم کر دیا جاتا تھا۔

گھر کے کاموں میں ہماری کچھ مخصوص ڈیوٹیاں بھی تھیں، جن سے نظم، سلیقہ اور مستعدی کا سبق ملتا رہتا تھا۔ مثلاً گھر کی ضروریات خرید کر لانا اور ان کا حساب باضابطہ لکھ کر والد صاحب کو پیش کرنا... گرمی کے موسم میں شام کو چارپائیاں صحن میں ترتیب کے ساتھ، بعد نماز عصر بچھانا اور ان پر طے کیے ہوئے حسب تعداد افراد بستر رکھنا؛ چوکی پر کھانے کے لیے فرش بچھانا؛ مغرب سے قبل مختلف زنانہ و مردانہ مکان کے حصوں میں روشن کی جانے والی لالٹینوں کو صاف کر کے، ان کی بتیاں ٹھیک کرنا اور تیل ڈالنا۔ صبح نمازِ فجر کے بعد دو تین ہلکی چارپائیاں صحن میں چھوڑ کر، باقی کو مع بستروں کے ان کی جگہوں پر پہنچانا۔ کوئی چارپائی یا اس پر بستر ٹیڑھا نہیں ہوتا تھا۔ خاص ترتیب کے ساتھ ہی رکھنا ہوتا تھا۔ دالان اور کمروں میں چارپائیوں کی جگہ اور رخ متعین تھے، اس کے مطابق روزانہ عمل ہوتا تھا۔ گھر میں صفائی ستھرائی اور پاکی کا اہتمام رہتا تھا۔ کوئی بچہ ہاتھ دھوئے بغیر، پینے کے لیے خود پانی نہیں لے سکتا تھا۔ یا کسی بڑے سے مانگتا تھا یا ہاتھ صاف اور پاک کر کے پیتا تھا اور کمال یہ تھا کہ والد صاحب ہمیں، جن باتوں سے منع کر دیتے تھے، ہم ان کی عدم موجودگی میں بھی ایسے ہی پابند رہتے تھے، جیسے ان کے

سامنے۔ کسی کام کو صرف ڈر خوف سے کرنا اور دل میں اس کی قدر نہ ہونا بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ تربیت کا بنیادی اصول یہی ہے کہ ہر کام محض ڈرا کر نہ کرایا جائے؛ بل کہ اس کی اچھائی اور برائی ذہن میں بٹھا کر اس کا عادی بنایا جائے۔

مولاناؒ نے سچ کہا ہے کہ

''الحمد للہ ان کی تربیت اور ذہن سازی سے، ہم سب بھائی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور بہ قدر استطاعت دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (۹۵)

حالات و واقعات، کام کرنے کے ماحول، زندگی کے نئے تقاضے، طلبہ و اساتذہ کے ہمہ وقتی علمی و تدریسی معاشرے، اسفار اور بڑے بڑے لوگوں سے اختلاط وغیرہ نے، ان صفات کو جو مولانا نے والد صاحب سے اخذ کی تھیں، اور صیقل کر دیا تھا۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی تمام طلبۂ دارالعلوم سے ممتاز نظر آتے۔ رہن سہن، اٹھک بیٹھک، حرکات و سکنات، طرزِ کلام اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ ایک نئے انداز، نئے اطوار اور سب سے الگ اور مہذب شناخت کے آدمی محسوس ہوتے تھے۔

ان کے ایک رفیقِ درس، دور طالب علمی کے حوالے سے، ان کی بابت لکھتے ہیں:

''کمرے میں چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی نظر آتی

---

(۹۵) ''خودنوشت سوانح کے چند اوراق''

تھی۔ مولاناؒ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن فرماتے اور اپنی نشست و برخاست اور گفتار و رفتار میں بھی، عام طلبہ سے ممتاز نظر آتے۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ہوتی اور گفتگو میں سنجیدگی رہتی۔"(۹۶)

مولانا کے ایک دوسرے رفیق لکھتے ہیں:

"داخلے کے بعد، میں مولانا معراج الحق کا پرچہ لے کر جب برج جنوبی (جو مولانا کیرانویؒ کی رہائش گاہ تھی) میں داخل ہوا، تو عام طلبہ کی رہائش سے بالکل مختلف، سلیقہ مندی اور صفائی ستھرائی کی ایک دل آویز شکل میرے سامنے آئی۔ پورے کمرے میں صاف ستھری سفید چاندنی، ایک طرف چھوٹی سی تپائی، جس پر سفید غلاف، اس پر ایک قلم دان اور چند کاغذ رکھے تھے۔ ایک گاؤ تکیہ جو معلوم ہو رہا تھا کہ لحاف کو گول کر کے اس پر غلاف چڑھا دیا گیا ہے... طاق پر ایک پردہ پڑا تھا، جب چائے کی ضرورت پیش آئی، تو اس میں سے ایک خوب صورت چائے دان اور شکر دان نکالا گیا۔ چاندنی پر ایک دھلا ہوا معمولی کپڑے کا ایک دستر خوان بچھایا گیا، اس پر چائے کا جملہ سامان رکھا گیا اور پینے کے بعد برتن دھو کر، پھر اسی طرح سجا دیے گئے۔ اس ملاقات کے دوران، مولانا مرحوم کی متانت، سنجیدگی اور پروقار گفتگو نے مجھے گرویدہ کر لیا۔"(۹۷)

---

(۹۶) مولانا عبداللہ سورتی: "رفیق محترم"

(۹۷) مولانا پروفیسر بدرالدین الحافظ: "ان کی یادوں کے سفینے" ترجمان دارالعلوم

دار الفکر کے زمانے میں، حالاں کہ وہ عسرت سے نبرد آزما تھے، لیکن سلیقہ مندی اور نفاست کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا، حتیٰ کہ آپ کے بعض رفقا یہ سمجھتے تھے کہ مولانا بہت خوش حال اور صاحب مال و منال ہیں۔ مولانا ابوالحسن بارہ بنکویؒ نے صحیح لکھا ہے کہ ظاہری رونق اور چہل پہل کی وجہ سے عام دیکھنے والوں کو، وہاں ہمیشہ خیر و عافیت اور خوش حالی ہی نظر آتی، جب کہ حقیقت حال سے، ہم چند افراد ہی آگاہ تھے۔ (۹۸)

چناں چہ مولانا کے دار الفکر کے ایک تربیت یافتہ، اس زمانے کی بابت لکھتے ہیں:

''کھانا کھانے کا انداز بڑا رئیسانہ تھا۔ میں اکثر ان کے ساتھ شریک طعام رہا۔ کھانے سے قبل سفید دستر خوان بچھایا جاتا تھا اور اس پر اعلیٰ طرز کی پلیٹیں رکھ دی جاتیں اور سفید دستر خوان میں روٹیاں ہوتیں، ضرورت کے مطابق روٹیاں نکال کر دستر خوان کو ڈھک دیا جاتا تھا... چائے کی پتی اعلیٰ کوالٹی کی استعمال کرتے تھے اور چائے بڑی نفاستِ طبع سے نوش فرماتے تھے۔ چائے پینے کے دوران بالکل خاموش رہتے، کپ اٹھا کر منھ تک لے جاتے اور پھر رکھ دیتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بغیر گھونٹ لیے کپ کو رکھ دیا ہے۔'' (۹۹)

ان کی نفاستِ ذوق، سلیقہ مندی اور ہر کام میں بے نظیر حسنِ ترتیب کا

---

(۹۸) ''شہید نازِ اربابِ تقویٰ''

(۹۹) سید احمد رامپوری

رنگ، وقت کے ساتھ ساتھ اور شوخ ہوتا گیا؛ بل کہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ علما کی جماعت اور مولویت کے صالح عناصر کا بہترین نچوڑ تھے اور اس کے غلط عناصر سے بڑی حد تک پاک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ المُعَاصَرَةُ سَبَبُ الْمُنَافَرَة (کہ ہم عصری نفرت کا سبب ہوا کرتی ہے) لیکن مولانا کا یہ بھی امتیاز ہے کہ ان کے معاصرین، ہم درس، اور رفقائے کار کی بڑی تعداد نے، جو کسی ذہنی دباؤ اور تحفظ کا شکار اور جو بے جا احساسِ برتری کی لعنت میں گرفتار نہ تھی، کھلے اور صاف لفظوں میں علمائے معاصرین کے درمیان، ان کی شانِ انفرادی اور وحید العصری کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں میں ان کے صرف ایک ہم درس کی شہادت کے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:

"بہ ہر حال ۴۰ سال سے زائد مدت کے تعلقات اور سفر و حضر میں بعض اوقات رفاقت اور ان کے ساتھ علمی، تربیتی، انتظامی موضوعات پر تفصیلی گفتگو کے سبب، یہ بات بندے کے مشاہدے میں آئی، جس میں ذرہ برابر مبالغہ، یا بے جا مدح سرائی نہیں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بہت سی ایسی خوبیوں اور بلند صفات سے نوازا تھا، جو اس دور کے بہت سے اہلِ علم میں نہیں پائی جاتیں۔ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔ ان کی مردم ساز شخصیت، مثالی کردار و اخلاق، تعلیم و تربیت کے انوکھے اور مؤثر طریقے وغیرہ صفات میں، وہ بلا شبہ اپنے اقران و احباب میں ممتاز تھے۔ ان کی باوقار مگر دل کش شخصیت نے ہزاروں انسانوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اگر مدارسِ عربیہ میں مولانا جیسی شخصیتیں

پیدا ہو جائیں، تو ہر طرح اور ہر لائن میں انقلاب آ سکتا ہے۔‘‘(۱۰۰)

مولاناؒ جس طرح طلبہ سے ملتے، خوش طبعی، کشادہ دلی سے پیش آتے، مزاح بھی کرتے، ضرورت کے وقت لہجے میں سختی بھی آ جاتی، غصہ بھی ہوتے، اس کے باوجود مولانا کے ادب واحترام اور نظم وضبط میں کوئی فرق نہ آتا اور طلبہ کو کوئی ناگواری، ان کے سلسلے میں نہ ہوتی اور نہ ان کے دل میں، ان کے تئیں عظمت ومحبت میں کوئی فرق آتا۔ اس کی وجہ وہ انوکھا انداز تربیت تھا، جو صرف اُنھی کے ہاں ملتا تھا اور جس کی وجہ سے مولانا کے شاگرد بھی عام طلبہ سے نمایاں اور ممتاز ہو جاتے تھے، جیسا کہ وہ خود علما و اقران میں نمایاں تھے۔ ان کے طلبہ کا رہن سہن الگ تھلگ ہوتا، کمرہ و بستر ہمیشہ صاف ستھرا دکھائی دیتا، کتابیں سلیقے سے لگی ہوتیں، کسی چیز پر گرد جمی نہ ہوتی، مطبخ سے کھانا لینے جاتے، تو ناشتے دان یا بند برتن میں، جب کہ دیگر طلبہ ایک المونیم کے پیالے میں سالن اور اسی پر دو روٹیاں رکھ کر پورا دارِ جدید عبور کرتے ہوئے نظر آتے۔ مولانا کے شاگرد ٹہلنے جاتے، تو ان میں نمایاں وقار جھلکتا نظر آتا، وہ فٹ بال اور والی وال کھیلتے، تو اس میں بھی عربی کی اصطلاحات اور روزمرہ کو استعمال کرتے، دکان داروں سے قرض نہ لیتے، اگر ضرورت ہوتی، تو ساتھیوں ہی سے لے کے وقت پر، حسبِ وعدہ واپس کر دیتے۔ مولانا خود اس کا خیال رکھتے اور ضرورت مند طلبہ کو عطیہ یا قرض کی شکل میں مدد فرماتے۔ اس کے لیے النادی میں ’’صندوق الاِسعاف‘‘

---

(۱۰۰) مولانا عبداللہ سورتی۔

امداد فنڈ بھی قائم کر رکھا تھا۔ قدم قدم پر طلبہ کو ہدایت اور راہ نمائی اور ان کی غلطیوں پر باز پرس۔ غرض دن رات کی ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ طلبہ، ان کی سخت باتوں کو بھی سر جھکا کر سنتے تھے اور اسی کا اثر تھا کہ بڑے سے بڑا مجمع ان کی ایک للکار پر سہم جاتا اور اشاروں پر چلتا تھا۔ وہ جب طلبہ کے بڑے سے بڑے مجمع کو خطاب کرتے تو سارے مجمع سے، ان کی ایک ایک بات کی تائید کی ''بیشک بیشک'' سے آواز آتی۔ مولانا نے طلبہ کے اندازِ فکر کو بدلنے اور ان کی سطحِ زندگی کو بلند کرنے میں مسیحا کا رول ادا کیا تھا۔

وہ ہر بات پر طلبہ کو ٹوکتے اور غلط املا، غلط تلفظ، نامناسب اندازِ تخاطب، افتراق و اختلافِ بے جا، کسی کے ہاں ملاقات کے لیے، یا مدعو ہو کر کھانا کھانے کے لیے یا مہمان بن کر جانے کی صورت میں، اس کے مہمان خانے یا بیٹھک کے سامان کو بار بار دیکھنے اور دائیں بائیں جھانکنے سے بھی روکتے۔ دستر خوان پر سالن، روٹی اور اشیائے خورد و نوش کے سلسلے میں اپنے دوسرے ساتھیوں کا، اپنے سے زیادہ خیال رکھنے کی شدت سے تاکید کرتے اور اچھی بوٹی اور اچھا اور روغن دار شوربہ یا زیادہ سالن لینے پر، جس سے دوسروں کے لیے سالن کم پڑ جائے، یا خراب بوٹیاں اور بے رونق شوربہ رہ جائے، اپنے شاگردوں کو بہت سرزنش کرتے تھے۔ عموماً اس سلسلے میں خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی بداحتیاط ہی دیکھا جاتا ہے؛ لیکن مولانا کی تربیت سے کندن ہو کر نکلنے والے لوگ، اس حوالے سے بھی ممتاز اور ''یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ'' کا نمونہ رہے ہیں۔ پانی پینے اور چائے لینے کا

طریقہ بتاتے، گلاس میں کتنا پانی پیش کیا جائے کہ گلاس سے نہ چھلکے۔ چائے دانی سے چائے کپ میں، کس طرح اور کتنی نکالی جائے۔ چاندنی پر کس طرح قدم رکھا جائے؛ کہ وہ شکن آلود نہ ہو۔ کسی سے ملاقات کے لیے جانے میں وقت کا کس طرح لحاظ کیا جائے اور زیادہ وقت ضائع کیے بغیر واپسی کی اجازت لے لی جائے۔ یہ سب کچھ ضرور بتاتے اور بار بار تاکید کرتے۔

مولانا کی یہ عادت تھی کہ وہ بہت ہی لطیف انداز سے شاگردوں کی تربیت فرماتے۔ ان کے انداز اور برموقع اصلاح کا ایسا اثر ہوتا کہ آدمی زندگی بھر اس غلطی کو دہرا نہیں سکتا تھا: دارالعلوم کی قدیم مسجد میں سائبان کا حصہ کم تھا اور نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔ گرمی کے موسم میں خاص طور پر ظہر کی نماز میں اندر کی صفیں بھر جانے کے باعث، نمازی، اقامت کے انتظار میں اندر کی طرف جگہ پا جانے کی کوشش میں، محراب نما کمانوں میں کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن مولانا بھی کمان میں پہنچے، مجھے دیکھا کہ آگے صف میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں، مولانا نے زبان سے کچھ نہ کہا، خاموشی سے صف میں داخل ہو کر میرے پہلو میں، گھٹنا سرکا کر یک زانو بیٹھ گئے، مولانا کو دیکھ کر میں بھی سہم کر یک زانو ہو گیا۔ اُس دن سے آج تک جب کبھی مسجد میں ایسی کیفیت نظر آتی ہے، میرے زانو، خود بہ خود سکڑ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر، میں درس گاہ (صفوف عربی اور اب درس گاہ تکمیل ادب) میں مطالعہ کر رہا تھا، مولانا، ان دنوں ''القاموس'' میں کوئی کام کر رہے تھے: عربی، انگریزی اور اردو کی ڈکشنریاں ان کے سامنے رکھی رہتی تھیں۔ مولاناؒ کی

عادت تھی کہ کام کرتے کرتے طبیعت تھک جاتی، یا کسی مسئلے پر غور کرتے، تو اپنے اقامتی کمرے میں ٹہلنے لگتے۔ رات کا وقت ہوتا، تو کمرے کے سامنے صحن میں نکل آتے۔ اپنی درس گاہ میں روشنی نظر آتی تو کبھی وہاں چلے آتے۔ وہاں جو کوئی ہوتا، اس سے دو چار باتیں کرتے اور پھر واپس چلے جاتے۔ اس سے نہ صرف ان کی طبیعت میں بشاشت آجاتی؛ بل کہ طالب علم کی طبیعت پر بھی خوش گوار اثر پڑتا۔ ایک رات درس گاہ میں آئے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد، مجھ سے کہنے لگے لفظِ ''کنسیشن'' کی اسپیلنگ لکھ کر دو۔ میرے سامنے کتاب تھی، لکھنے کے لیے آس پاس کاغذ نہ تھا، بے ادبی جان کر ہمت نہ ہوئی کہ کہوں کہ کاغذ نہیں ہے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، تو درس گاہ کے ایک کونے میں، کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا، میں نے اس پر اسپیلنگ لکھی اور مولاناؒ کو دے دی۔ مولاناؒ نے اس ٹکڑے کو بڑی نزاکت سے اپنی چٹکی میں جکڑا اور فرمانے لگے: اس کاغذ کا تھوڑا سا حصہ بچ گیا ہے، اسے پھاڑ لو۔ میں نے شرم سار نگاہیں نیچی کیں اور مولانا مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ آج تک جب بھی کچھ لکھ کر کسی کو دینے کا موقع آتا ہے، تو مولانا کی چٹکی میں پھنسی پرچی اور شبیہ بہ یک وقت نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ یہ وہ اندازِ تربیت تھا، جو لطافت کی تاثیر لیے ساری زندگی کے لیے درسِ عمل بن جاتا تھا۔ (۱۰۱)

مولانا اپنے شاگردوں کے ساتھ فرقِ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے،

---

(۱۰۱) مولانا عبدالوحید حیدر آبادی، کمپیوٹر سنٹر، جامعۃ الملک سعود، ریاض: ''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے'' ترجمان دارالعلوم۔

مشفقانہ انداز میں دوستوں کی سی بے تکلفی روا رکھتے تھے؛ تاکہ کسی صحیح، غلط عمل پر جرح کرسکیں۔ اس سے وہ ان میں حق گوئی کی جرأت اور حق فہمی کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ شاگرد یا کوئی دوسرا کیسی ہی نادانی کرجائے، ان کے سامنے اپنے کیے پر پشیمان ہوجاتا، تو اس کو نہ صرف معاف کردیتے تھے؛ بل کہ پہلے سے زیادہ قریب کرلیا کرتے تھے۔ یہ وہ تربیت کا گر ہے، جس سے عادی مجرم کو بھی پارسا بنایا جاسکتا ہے۔ یہی وہ خوبیاں تھیں، جن کی بنا پر وہ دارالعلوم کے ہردل عزیز استاذ تھے، طلبہ اُن پر اپنی جان چھڑکتے تھے؛ اِس لیے کہ مولاناؒ نے بھی اپنا تن من دھن، سونا، جاگنا: سب کچھ ان کے لیے وقف کردیا تھا۔ (۱۰۲)

انھوں نے اپنے اندازِ تعلیم و تربیت سے طلبہ میں حوصلہ مندی اور جرأت کی روح پھونک دی تھی۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ الازہر عبدالحلیم محمودؒ (۱۰۳) (۱۳۲۸-۱۳۹۸ھ/۱۹۱۰-۱۹۷۸ء) دارالعلوم دیوبند آئے، تو انھیں جہاں

(۱۰۲) حوالۂ بالا۔

(۱۰۳) ان کی پیدائش، نہر اسماعیلیہ، مصر کے مشرقی ساحل پر واقع گاؤں "عزبة أبو أحمد" میں ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ اپنے گاؤں ہی کے مکتب میں ابتدائی تعلیم اور تیرہ سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ان کے والد نے انھیں جامعہ ازہر، قاہرہ میں داخل کیا۔ اس کے دو سال بعد "معہد زقازیق" کے قیام کے بعد، معہد میں داخل ہوگئے، جہاں ۱۹۲۸ء میں سکنڈری کی تعلیم کی تکمیل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے پھر "ازہر" واپس آگئے۔ ۱۹۴۰ء میں فرانس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ متعدد اعلیٰ علمی و تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں کے ممبر اور استاذِ زائر رہنے کے ساتھ ساتھ "المجلس الأعلى للشؤون الإسلامية" کے صدر اور "مجمع البحوث العلمية" کے سکریٹری جنرل رہے۔ ۱۳۸۹ھ میں مصر کے وزیر اوقاف منتخب ہوئے۔ بعد ازاں جامعہ ازہر کے ناظم اور شیخ الازہر کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسلام اور اَعلامِ اسلام کے موضوع پر بہت سی قیمتی کتابیں لکھیں۔ مصر میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے ←

اس بات پر حیرت ہوئی کہ اتنا بڑا دارالعلوم صرف عوامی چندوں سے چلا کرتا ہے، وہیں انھیں اس بات پر شدید حیرت ہوئی کہ ان کے لیے منعقدہ استقبالیہ جلسے کا اناؤنسر، درجہ ہفتم عربی کا ایک چھوٹا سا طالب علم تھا، جس کی عمر تقریباً ۱۵ برس تھی۔ اس کے بے تکلف عربی بولنے اور خالص عربی لہجے میں کارروائی چلانے سے انھیں خوش گوار حیرت ہوئی۔ جلسے کے بعد انھوں نے اس حیرت کا اظہار کئی مجلسوں میں کیا کہ ایک نوعمر عجمی طالب علم، اتنی اچھی اور خوب صورت عربی کیسے بول رہا تھا؟! یہ بچہ تھا محمد راشد اعظمی اور اس کے فن کار استاذ تھے مولانا وحید الزماں، جو خود ڈائس پر موجود تھے (۱۰۴)

وہ طلبہ میں صالح جوہر کی افزائش کے لیے، نئے نئے طریقے سوچتے، جو شاید کسی مدرسے کے کسی استاذ کے ذہن میں، نہ آسکتے تھے۔ وہ سہ ماہی اور شش ماہی امتحانوں میں بعض دفعہ طلبہ سے فرماتے کہ اپنی اپنی کاپیاں خود جانچو اور جو جتنی زیادہ غلطیاں نکال کر لائے گا، وہ اسی قدر زیادہ نمبرات پائے گا۔ یہی نہیں؛ بل کہ بعض دفعہ سوالات املا کرا کر، امتحان کے پورے وقفے میں درس گاہ سے غائب ہو جاتے اور اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مشغول ہو جاتے اور طلبہ کو فرما جاتے کہ امتحان میں نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہوگا، خدائے علام الغیوب کی نگرانی میں پرچہ حل کرنا ہے۔ مجال ہے

← زبردست حامی، پرجوش مبلغ اور عیسائیت اور اس کی تباہ کاریوں کے شدید نکتہ چیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء میں ان کی وفات پر یورپ کے بعض اخبارات نے اپنے تعزیتی مضامین میں، ان کو عیسائیت کے تئیں سخت متعصب اور دشمن قرار دیا۔

(۱۰۴) مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی: ''علم و اخلاق کی دنیا اجڑ گئی'' ترجمان دارالعلوم، اپریل مئی ۱۹۹۵ء

کہ کوئی طالب علم غائبانے میں بھی کسی کی طرف دیکھتا یا تانک جھانک کرتا؛ بل کہ ہر ایک یہ کوشش کرتا کہ اس کا ساتھی کسی طرح بھی، اس کی طرف متوجہ نہ ہو کہ اگر اچانک مولاناؒ تشریف لے آئے، تو حکم عدولی کی کسی صورت کو دیکھ کر انھیں شدید صدمہ ہوگا۔ ہر ایک کو ایسا لگتا کہ مولانا ہمارے پیچھے کھڑے ہیں، ان کی شبیہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ کسی اہم رکاوٹ کی وجہ سے، یا ناسازی طبع کی وجہ سے، اگر درس گاہ تشریف نہ لاتے، تو طلبہ کو تاکید ہوتی کہ درس گاہ میں بیٹھ کے مطالعہ و مذاکرہ میں مشغول رہیں۔ طلبہ پر ان کے غائبانے میں بھی، ان کی محبت و خلوص اور ان کے وقار و عظمت کا ایسا رعب ہوتا کہ وہ اسی طرح غرق مطالعہ و مذاکرہ رہتے، جیسے ان کے سامنے۔

مولاناؒ کے ایک انتہائی فرماں بردار شاگرد لکھتے ہیں:

شوال ۱۴۰۰ھ/ جولائی ۱۹۸۰ء میں تکمیلِ ادب عربی میں داخلے کے لیے، ہمارا ٹسٹ ہوا، تو مولانا سوالات لکھوانے کے بعد امتحان ہال سے اٹھ کر چلے گئے اور جانے سے پہلے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''دیکھیے آپ سب فضلائے دارالعلوم ہیں اور فاضل دارالعلوم ہونا میرے نزدیک، امانت دیانت، صداقت اور اعتماد کی سب سے بڑی ڈگری ہے؛ اس لیے میں آپ کی نگرانی ضروری نہیں سمجھتا اور یوں بھی اگر آپ چیٹنگ کرنا چاہیں، تو آپ کی اس بڑی تعداد کے مقابلے میں میری تن تنہا نگرانی کافی نہ ہوگی؛ اس لیے میں آپ کے ضمیر اور اعتماد پر، امتحان ہال سے اٹھ کر جارہا ہوں۔ گویا یہ امتحان آپ کی دو صلاحیتوں کا امتحان ہے۔ یعنی علمی صلاحیت اور تربیتی اور اخلاقی

صلاحیت۔ اگر ان دونوں صلاحیتوں میں سے آپ کسی ایک میں بھی ناکام رہے، تو میری جماعت (تکمیل ادب عربی) میں آپ کا داخلہ بے سود رہے گا۔'' چناں چہ مولانا اٹھ کر چلے گئے اور طلبہ نے ان کی بات کا اثر لیتے ہوے امتحان میں، کسی طرح کی چٹنگ نہ کی۔ مولانا بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اگر آپ طلبہ پر اعتماد کریں، تو طلبہ آپ پر اعتماد کریں گے۔(۱۰۵)

طلبہ میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے، کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ کیمپ کے زمانے میں بڑی بڑی خریداریاں، مولاناؒ نے طلبہ کے ذریعے ہی کرائیں اور بڑی بڑی رقومات کے ذریعے قیمتی اور گراں قدر اشیا انھیں کے ذریعے حاصل کی گئیں۔ مولانا فرماتے کہ اس سے طلبہ میں خود اعتمادی، خودداری، احساسِ ذمے داری، اپنے ادارے سے ہم دردی اور اپنائیت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ نیز فرماتے کہ طلبہ چوں کہ عموماً زیادہ گھوم کر ریٹ معلوم کرتے ہیں اور دکان داروں سے جھک کرتے ہیں؛ اس لیے کم سے کم داموں پر اشیا کی خریداری کراتے ہیں، جب کہ ملازمین عموماً ایک دو دکان دار سے زیادہ کے پاس نہیں جاتے اور سودا کرتے وقت زیادہ مول تول کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

وہ طلبہ کی شخصیت کے ابھرنے کے لیے، ایک حد تک آزادی بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ طلبہ کی شخصیت کی نشو ونما میں ایک حد تک آزادی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں دبا کر نہیں رکھنا چاہیے؛ بل کہ

(۱۰۵) مولانا مزمل الحق حسینی قاسمی استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

آزادی دینی چاہیے اور پھر کنٹرول کرنا چاہیے۔ یہ تربیت کا اہم جزء ہے۔ دباکر، جذبات کو کچل کر اور زبان بندی کر کے طلبہ کی شخصیت کو مسمار تو کیا جا سکتا ہے، ان کی شخصیت کی کوئی تعمیر ممکن نہیں۔

اپنے اِسی تربیتی انداز کی وجہ سے، انھوں نے رجال سازی کا جو کارنامہ انجام دیا، وہ تاریخِ دارالعلوم میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے بعد شاید ہی کسی کے حصے میں آیا ہو۔ پھر یہ کہ مولاناؒ کا کام اس حوالے سے، زمانے کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھا جائے، تو بہت بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ایک نام ور رفیقِ درس نے صحیح لکھا ہے کہ

''طلبہ کی راہ نمائی اور ان کی تربیت میں نہ صرف بے مثال کردار ادا کیا: بل کہ تعلیم و تربیت کی ایک نئی طرح ڈالی۔''(۱۰۶)

رجال سازی اور افراد سازی کا، جو فن اللہ کی طرف سے انھیں ودیعت ہوا تھا، اس سے انھوں نے بھرپور کام لیا۔ ان کے ایک لائق شاگرد لکھتے ہیں: ''راقم السطور جب النادی الادبی کا معتمد تھا، تو ایک مرتبہ استاذِ محترم نے ایک نئی تجویز رکھی کہ ماہانہ اجتماعات کی صدارت کوئی ذہین اور ممتاز طالب علم کیا کرے۔ کسی جلسے کی صدارت کرنا بھی ایک فن ہے اور دارالعلوم سے رخصت ہونے کے بعد، ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں کہ کسی جلسے کی صدارت کرنی پڑ جائے: اس لیے تقریر کی طرح صدارت کی مشق بھی ہونی چاہیے۔ دارالعلوم کے ماحول میں یہ انوکھا فیصلہ تھا۔ اول تو کوئی طالب علم اپنے ہی

(۱۰۶) مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی۔

جیسے ساتھیوں کے اجتماع کی صدارت کرے؛ یہ معاملہ ہی کچھ کم حیرت انگیز نہیں، پھر اپنے اساتذہ کی موجودگی میں صدارت کرنا... بہ ہر حال متعدد طلبہ نے اپنے اساتذۂ کرام کی موجودگی میں ''صدر جلسہ'' بننے کا شرف حاصل کیا۔ پورے وقار اور ادب کے ساتھ اپنے بڑوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہوے، محض مشق کی خاطر نہ کہ خود نمائی اور ستائش کے لیے۔ (۱۰۷)

اس طرح مولاناؒ نے ان گنت طلبہ کو صدارت جلسہ، نظامت جلسہ، نیز قلیل ترین مدت میں کسی جلسے کو برپا کر لینے کا فن؛ اسی طرح مہمان نوازی، مہمانوں کو حسبِ مراتب احترام و وقار کا مقام دینے؛ نیز مہمان بننے اور اس کے آداب کی پابندی کرنے کا سلیقہ سکھا دیا۔

وہ نہ صرف مصنف تھے؛ بل کہ مصنف گر بھی تھے۔ کوئی طالب علم کوئی مضمون یا کتاب لکھنے کے سلسلے میں مشورہ کرتا، تو فوراً مرکزی عنوان اور ذیلی عناوین بتا کر اس کا ایک مرتب نقشہ بنا دیتے اور تحریر و تالیف کا بال و پر عطا کر دینا، تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مضمون یا کسی تحریر میں نقص ہو، تب بھی حوصلہ افزائی کے لیے بہت تعریف کرتے اور ماشاء اللہ، بہت خوب وغیرہ سے دل بڑھایا کرتے تھے۔ وہ فرماتے کہ جس طرح کپڑوں پر پریس کیجیے، تو اس کی شکنیں دور ہوتیں ہیں اور سلوٹیں کھلتی ہیں، اسی طرح اپنے لکھے ہوے مضمون کو بار بار پڑھنے اور نظرِ ثانی کرنے اور اس کی تبییض کرنے سے، اس کے نقائص دور ہوتے ہیں؛ اس لیے اپنے مضمون یا تالیف کردہ

---

(۱۰۷) مولانا ندیم الواجدی: '' کچھ حقائق، کچھ تاثرات'' ترجمان دار العلوم۔

کتاب کو بار بار، ضرور پڑھنا چاہیے۔

قدیم اور فرسودہ طریقۂ درس، جس میں سارا بار استاذ پر ہوتا ہے، کو مولاناؒ نے یک سر بدل دیا اور طلبہ کی اصولی راہ نمائی کے ذریعے، ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ وہ طلبہ کو مکلّف کرتے کہ وہ اپنے ذہن سے سوچیں، اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کریں، اپنی عقل و خرد کو آپ صیقل کریں، غور و فکر کی عادت ڈالیں، اپنی طبعی ذہانت سے پورا پورا کام لیں۔

مستعدی و چستی

مولاناؒ مستعدی اور چستی کی ایک مثال تھے، آخری عمر تک یہ حال تھا کہ نوجوانوں کو، ان کا ساتھ دینا مشکل ہوتا تھا۔ وہ بعض ضروری کاموں کے لیے پوری پوری رات بیدار رہتے، سارے دن منہمک رہتے اور تھکاوٹ کا کسی کو احساس نہ ہونے دیتے۔ اس سلسلے کے سیکڑوں واقعات ہیں، کہاں تک انھیں قیدِ تحریر میں لایا جائے۔ ہم سارے شاگردوں کا، ان کے سلسلے میں اس حوالے سے بھی ذاتی تجربہ ہے؛ لیکن یہاں ان کے ایک وفا شعار اور ان کی زندگی کے آخری سالوں کے خدمت گزار کی زبانی ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے، جو سبق آموز بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۴۰۹ھ میں جب میں حضرت الاستاذؒ سے وابستہ ہوا، تو اگلے ہی روز حضرت کے کمرے کی صفائی اور کتابوں کی ترتیب کی سعادت مجھے میسر آئی۔ صبح ۹ بجے سے رات کے دس بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرے ساتھ اول

سے آخر تک حضرت الاستاذؒ بھی مصروف عمل رہے۔ یہ آپ کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ کام بتا کر الگ نہیں ہو جاتے؛ بل کہ سب کے ساتھ اور سب کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ رات کو جب خاصی دیر ہوگئی، تو حضرتؒ نے فرمایا کہ آرام کر لیجیے، صبح ان شاء اللہ بقیہ کام سے فارغ ہو جائیں گے؛ چناں چہ علی الصباح جب میں نماز سے فارغ ہو کر، کام کی تکمیل کی غرض سے، کمرے پہنچا، تو دیکھا کہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ حضرت والاؒ نے فرمایا کہ صبح چار بجے تک میں نے کام مکمل کر لیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ صبح آپ پھر حسبِ معمول تازہ دم ہو کر کام کرنے لگے تھے۔

وفات سے چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے: ''جواہر المعارف'' طباعت کے لیے پریس میں جانے والی تھی، اس میں جو کاتب صاحب کام کر رہے تھے، وہ بجنور کے رہنے والے تھے، ہنگامی طور پر کام کو جلد مکمل کرنے کے لیے، انھیں دیوبند بلا لیا گیا تھا۔ انھوں نے بہ عجلت تمام کام کو مکمل کر دیا۔ آپؒ کو اس کا اندازہ نہ تھا، آخری روز کاتب صاحب نے مولاناؒ سے عرض کیا کہ اصل کتاب کا کام ابھی رات میں مکمل ہو جائے گا اور مجھے چوں کہ کل گھر جانا ضروری ہے؛ اس لیے آپ شروع کے صفحات دے دیجیے، میں گھر جا کر ان کی کتابت کروں گا، پھر آپ کے پاس بھجوا دوں گا۔ مولاناؒ نے پوچھا کہ آپ کس وقت جائیں گے؟ کاتب نے کہا: مجھے صبح فجر کے بعد جانا ہے۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ پھر ان کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے واپس تشریف لے گئے، صبح ہوئی اور نماز کے فوراً بعد مطلوبہ صفحات لے آئے اور

کاتب کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا: لیجیے جناب، یہ صفحات پہلے سے تیار نہ تھے، صبح تک ہی انھیں مکمل کر پایا ہوں۔ (۱۰۸)

قوتِ فیصلہ اور ذکاوتِ حس

مولانا ہمیشہ اقدام و اصلاح اور پیش روی و تیز گامی کے قائل تھے۔ وہ تیز سوچتے، جلد فیصلہ کرتے، انھیں قوت فیصلہ کی غیر معمولی اور ٹھوس صلاحیت تھی۔ تردد اور پس و پیش یا تذبذب اور کسی مسئلے میں حیص و بیص کا شکار نہ ہوتے۔ کسی انتظامی اور صلاح و مشورے کے موقع پر شرکائے بزم سے پہلے متعلقہ مسئلے میں فیصلہ کن، خاکہ پیش کر دیتے اور انتہائی مرتب اور موثر انداز میں۔ کام کا دائرہ اور خاکہ بنانے میں انھیں دیر نہ لگتی۔ وہ سوچتے، غور کرتے، فیصلہ کرتے اور کام کا آغاز کر دیتے۔ انھیں پروگرام سازی اور ہر گوشۂ زندگی میں متعلقہ کام کی نقشہ گری خوب آتی تھی۔

مولاناؒ انتہائی ذکی الحس تھے، کسی مجلس میں تشریف لے جاتے یا کسی سے ملاقات کو جاتے اور وہ کچھ دیر بعد گھڑی دیکھنے لگتا، تو فوراً اٹھ جاتے کہ اب بیٹھنا مناسب نہیں، جتنے وقت تک ملنے کی ضرورت تھی وہ پوری ہو چکی۔

ظرافت

ظرافت و ذہانت اور فہم و فراست کا بھی ان کو قدرت کی طرف سے وافر

(۱۰۸) مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی مظفرنگری: ''زندگی کا آخری دور''

خزانہ ملا تھا۔ وہ زندگی کے ہر کام میں ظرافت اور مزاح کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ ٹرین میں بہت رش ہے، بیٹھنے کی جگہ نہیں؛ لیکن مولانا وحید الزماں صاحبؒ ساتھ ہوں، تو کوئی مشکل نہیں۔ خدا جانے وہ کون سی انگریزی بولتے کہ لوگ اس سے مرعوب ومتاثر ہوکر خود ہی جگہ دے دیتے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک ساتھی کو عربی لباس پہنا کے ایک دوسرے ساتھی کے کمرے میں عربی بولتے ہوئے پہنچے۔ وہ صاحب سمجھے کہ یہ کوئی معزز عربی مہمان ہے، انھوں نے اس زمانے کے ڈیڑھ دو سو روپے ضیافت پر خرچ کرڈالے، ضیافت کے بعد جب راز کھلا تو ساری مجلس قہقہہ زار بن گئی۔(۱۰۹)

مشکل سے مشکل وقت میں اور خشک کاموں کے دوران بھی وہ ظرافت اور مزاح سے اہلِ مجلس کو تبسم ریز بنائے رکھتے۔ کیمپ کے زمانے میں وہ رات کو ۱۲ ربجے کے بعد فائل دیکھتے، جن میں ہر نوع کے کاغذات ہوتے۔ فائلوں اور قانونی کاغذات کی خشکی انتہائی اکتا دینے والی اور قاتلِ ظرافت وشرافت ہوتی ہے؛ لیکن ان کے ایک شاگرد، جو اس زمانے میں اور تادم حیات مولانا کے بہت سے علمی وانتظامی کاموں میں دست راست رہے، لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ ایک بنگالی طالب علم نے اپنی ایک درخواست میں اپنے لیے دو گدّوں کی ضرورت کا اظہار کیا؛ لیکن اردو کم جاننے کی وجہ سے لفظ ''گدّوں'' کا املا ''گدھوں'' تحریر کیا اور لکھا کہ مجھے فلاں وجہ سے دو

---

(۱۰۹) مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی۔

''گدھوں'' کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے اس وقت مولاناؒ کے پاس چار آدمی موجود تھے اور قریب ہی چار گدّے بھی رکھے ہوئے تھے۔ مولانا نے درخواست پڑھ کر مذکورہ طالب علم سے فرمایا کہ بھئی یہاں چار گدھے موجود ہیں، آپ اپنے لیے دو کا انتخاب کر لیجیے۔ اس پر مجلس میں دیر تک شگفتگی اور تبسم کی فضا طاری رہی۔ (۱۱۰)

خودداری

مولانا نے خودداری اور کسی کی احسان مندی اور ممنونیت کو گوارا نہ کرنے کی خوبی اپنے والد سے ورثے میں پائی تھی۔ وہ مقروض ہوتے؛ لیکن کسی قریب کے آدمی کو بھی اس کا اندازہ نہ ہوتا؛ لیکن قرض کی ادائے گی میں وعدے کے اتنے پابند ہوتے کہ بعض دفعہ قرض لے کر پہلے قرض کو ادا کرتے۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ خود مقروض اور تنگ دست ہوتے؛ لیکن دوستوں کی ضرورت بھی قرض لے کے پوری کر دیتے۔ حالات کیسے بھی ہوں، انھوں نے اپنے رہن سہن اور طرزِ زندگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ان کو دارالعلوم سے ۱۵ روپے وظیفہ ممتاز طالب کی حیثیت سے ملتا تھا؛ لیکن وہ لکھنے پڑھنے میں محنت کے ساتھ ساتھ، دو تین گھنٹے کتابت کرتے؛ تاکہ وظیفہ اور کتابت سے حاصل کردہ یافت کے ذریعے گھریلو اور اپنے ذاتی مصارف کو پورا کیا جا سکے؛ لیکن وہ یہ سب کچھ

---

(۱۱۰) مولانا مزمل الحق حسینی قاسمی۔

عزت نفس اور خودداری کی انتہائی نگہ داشت کے ساتھ کرتے تھے۔

ہماری طالبِ علمی کے زمانے میں انھوں نے ہم لوگوں کو بتایا کہ ایک مرتبہ مظفر نگر کے ایک عالم ایک مدرسے کا اشتہار لکھوانے آئے، انھوں نے کہا کہ مولاناؒ جلدی لکھ دیجیے اور بہت اچھا، کہ دیگر مدرسوں کے اشتہارات سے ممتاز رہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ آج ہی لکھ دوں گا اور بہت خوب صورت؛ لیکن ۵۰ روپے لوں گا۔ عالم صاحب نے کہا کہ مولانا! یہ مدرسے کا اشتہار ہے، کچھ خیال کیجیے، ثواب ملے گا۔ مولاناؒ نے فرمایا: دیکھیے ثواب کے لیے، تو نماز روزے اور تلاوت و اذکار کیا کرتا ہوں، یہ کام تو صرف پیٹ پالنے کے لیے کرتا ہوں؛ اس لیے بہت خوب صورت اشتہار اور آج ہی، اس سے کم اجرت پر نہیں لکھ سکوں گا۔ عالم صاحب، آخرش ۵۰ روپے پر راضی ہو گئے

طالب علمی کے زمانے کے مولانا کے ایک ساتھی فرماتے ہیں:

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس کے یوم تاسیس کے موقع پر ۲۹ر اکتوبر کو ہر سال ایک تعلیمی میلہ ہوا کرتا تھا، جس میں ہر سطح کے طلبہ اپنے تعلیمی کاموں کی نمائش کیا کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں خاک سار کے سپرد محمد علی ہال کی آرائش کا کام کیا گیا۔ میں نے اس آرائش کے لیے چند اخلاقی آیات اور احادیث کے تراجم بڑے چارٹس پر لکھوانے کا پروگرام بنایا اور مولانا کیرانویؒ سے درخواست کی، انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق چند شرطوں کے ساتھ منظور کر لیا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ میں جامعہ آؤں گا، تو تمھارے کمرے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر کام کروں گا۔ مجھے کام دینے اور لینے کا صرف

تمھیں اختیار ہوگا اور کسی استاذ، یا افسر کو مجھ سے باز پرس کرنے کا حق نہ ہوگا۔ کام کا معاوضہ لینے کے لیے میں کسی افسر کے پاس نہ جاؤں گا، نہ کسی دفتر میں حاضری دوں گا، کام ختم ہونے پر آپ فوراً ادا ے گی کر دیں گے اور میں حسب قاعدہ رسید لکھ دوں گا۔ میں نے یہ تمام شرائط قبول کر لیں اور مولاناؒ نے حسبِ وعدہ وقت کے اندر کام انجام دے دیا۔ (۱۱۱)

مرض الموت اور وفات

مولانا ہمیشہ نحیف و ناتواں رہے، وہ جتنا کام کرتے تھے اور اپنے جسم و جان کو جتنا پگھلایا کرتے تھے اور جس طرح اپنی صحت کو طلبہ، دار العلوم اور علم ثقافت کی لیلیٰ پر شب و روز نچھاور کرتے تھے؛ اس کے بہ قدر جس آرام کی اور جس طرح کی غذا کی ضرورت تھی، انھوں نے دونوں حوالوں سے کوئی دل چسپی نہ لی۔ اپنی صحت اور زندگی کو تعلیم و تربیت کے میدان میں بے اعتدالی سے خرچ کیا؛ بل کہ اسراف کی حد تک استعمال کیا۔ وہ ہماری طالب علمی کے زمانے میں بھی تبخیر کی اکثر شکایت کرتے اور بعض دفعہ طشت میں پانی بھر کے، اس میں پاؤں ڈالے رہتے۔ ادھر سال ہا سال سے شکر کے مریض تھے۔ یہ مرض مجمع الامراض ہوتا ہے اور انسان کو گھن کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ یہ مرض واجد علی شاہ کی طرح نازک مزاج بھی ہوتا ہے۔ ذرا سی بداحتیاطی، زیادہ غور و فکر، کھانے کے خاص نظام کی عدم پابندی اور کم یا زیادہ

---

(۱۱۱) مولانا پروفیسر بدر الدین الحافظ

کھانا لے لینے سے، بہت جلد بڑھ یا گھٹ جاتا ہے۔ مولانا نے دارالعلوم کے لیے اپنے کو، جس طرح وقف کیے رکھا، اس میں اس مرض کی نازک مزاجی کا خیال رکھنا، ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ لاپروار ہے اور مرض اپنا کام کرتا رہا۔ بس یہ تھا کہ مرض کی شدت ہوتی تو، دہلی کے ایک ہسپتال میں وقتاً فوقتاً جاکے داخل ہوجاتے اور جیسے ہی کسی قدر چنگے ہوتے، واپس آ کے پھر دیوانہ وار علم و عمل کی متضاد سمتوں میں محوِ سفر ہوجاتے۔ انتظامی امور، تعلیمی مسائل، تدریسی مشکلات، گھریلو معاملات، تالیفی و تحریری خدمات اور زندگی کے گوناگوں حالات کی نذر ہوجاتے۔

کیمپ کے زمانے میں جو خاراشگافی کی، جس ہفت خواں کو طے کیا، جس درد کو پالا، جس الجھن سے دوچار ہوے، شب و روز جن زہرہ گداز حادثات و واقعات سے نبرد آزما ہوے؛ اس نے ان کی تمام قوتوں کو نچوڑ لیا تھا اور ناتواں جسم کے انگ انگ کو شکستہ کردیا تھا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کیمپ کے بعد اس سپاہی کی طرح، جو زبردست اور گھمسان کی لڑائی کے بعد، اپنے ٹوٹے ہوے جسم اور تھکے ہوے ذہن کو آرام دیتا ہے، مکمل طور پر، ساری الجھنوں سے دست کش ہوجاتا؛ لیکن انھوں نے کیمپ کے بعد کے مرحلے میں بھی کسی آرام و راحت کی ضرورت محسوس نہ کی اور دارالعلوم کی بھلائیوں کے ہر گوشے میں ان کی صلاحیتوں کا ابرِ بے حساب مسلسل برستا رہا۔ کیمپ کے زمانے میں بھی وہ ایک مرتبہ کئی روز کے لیے ہسپتال میں داخل ہوے، حتی کہ دارالعلوم پر قبضے والے دن بھی کیمپ کی بارات، اس دولھے کے بغیر

دار العلوم میں بھی اور سبھوں کو بارات کی بے رونقی کا احساس رہا۔

اس کے بعد وہ وقفے وقفے سے اور بار بار بیمار پڑتے رہے۔ اسی اثنا میں ان پر زبردست سحر بھی کر دیا گیا۔ شکر کے مرض سے پیدا شدہ متنوع عوارض اور سحر نے ان کو بالکل نڈھال کر دیا۔ شعبان ۱۴۱۵ھ/ دسمبر ۱۹۹۴ء میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، ہاتھ پاؤں پر ورم آ گیا، گردہ جو پہلے ہی سے متاثر تھا، اب زیادہ متاثر ہو گیا، تو آپ پنتھ ہسپتال میں داخل ہوے۔ پورا شعبان اور رمضان کے چند روز وہیں گزرے۔ پھر دیوبند تشریف لے آئے؛ لیکن یہاں آکر رمضان میں طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ عید کے بعد یعنی شوال ۱۴۱۵ھ = فروری ۱۹۹۵ء میں بہ غرض علاج، دہلی لے جایا گیا اور جیون نرسنگ ہوم میں داخل کیے گئے، جہاں عموماً وہ علاج کے لیے داخل ہوتے رہے تھے۔ مارچ کے مہینے میں ان کی علالت میں اتنی شدت آ گئی کہ انھیں انتہائی نگہ داشت والے یونٹ میں کئی دنوں تک رکھا گیا۔ ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی کے اب یہ گنے چنے دن ہیں۔ اس لیے انھوں نے زندگی میں اپنے سلسلے میں کسی بھی قسم کا اپنے دل میں میل رکھنے والوں کو یک طرفہ طور پر معاف کر دیا اور اپنے بڑے صاحب زادے مولانا بدر الزماں قاسمی کیرانوی سے (جو قطر سے، جہاں وہ برسر روزگار تھے، والد صاحبؒ کی علالت کی اطلاع پا کر ۲۴/ مارچ کو آ گئے تھے) فرمایا کہ اگر میرے سے کسی بھی طرح کی بدگمانی رکھنے والے کوئی صاحب عیادت کو آئیں تو بتا دینا کہ اب ہمارا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے؛ میں نے سب کو معاف کر دیا، اب وہ جانیں اور ان کا ضمیر۔

ایک روز طبیعت میں افاقہ محسوس ہوا، تو انھیں (آئی، سی، او) سے ہسپتال کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا، لیکن اگلے روز سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ گردے کام نہیں کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے بلیڈ یوریا بڑھ گیا ہے۔ گردوں کے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا، انھوں نے مشورہ دیا کہ اب سوائے ڈایالیسیس کے ان کا کوئی علاج نہیں۔ اس اثنا میں جیون نرسنگ ہوم میں رہتے ہوئے ہی ہومیو پیتھک علاج بھی کرایا گیا؛ لیکن معالج کے بیرونِ ملک کے سفر کی وجہ سے، یہ علاج جاری نہ رہ سکا۔ اب بلیڈ یوریا بہت بڑھا ہوا تھا اور جیون میں علاج کی کوئی شکل نہ تھی؛ اس لیے انھیں ان کے اصرار پر دہلی میں، ان کے برادر اوسط مولانا عمید الزماں صاحب کے گھر لے آیا گیا۔ بیماری کے پورے عرصے میں، وہ ہوش وحواس میں رہے اور مرض کی شدت کے باوجود مزاج میں نظم اور ڈسپلن کا اتنا خیال رہا کہ تیمارداروں کی بدنظمی پر بھی اُنھیں ٹوکتے رہے۔ پھر ایک روز ڈایالیسیس کے لیے ''ہولی فیملی'' ہسپتال لے جایا گیا؛ لیکن کم زوری کی وجہ سے، یہ کام یاب نہ رہا، چناں چہ گھر واپس لے آیا گیا۔ انتقال والی شام کو ساڑھے چھ اور سات بجے کے درمیان خون کی کئی الٹیاں ہوئیں اور ساڑھے سات بجے آخری الٹی کے ساتھ ۱۵/ اپریل ۱۹۹۵ء (شب ۱۵ ذی قعدہ ۱۴۱۵ھ) کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ (۱۱۲)

---

(۱۱۲) مرض الموت کی تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا بدر الزماں قاسمی کیرانوی کا مضمون: ''والد محترم کے آخری ایام'' ترجمان دار العلوم۔

رات ہی میں میت دہلی سے دیوبند لائی گئی۔ صبح ۴ بجے سے ۱۰ بجے تک دارالعلوم دیوبند کے طلبہ، اساتذہ اہالیان شہر کی زبردست بھیڑ زیارت کرتی رہی۔ ۱۱ بجے صبح دارالعلوم کے احاطہ مول سری میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دس ہزار افراد نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن سے اس سانحے کی خبر نشر ہو جانے کی وجہ سے، قریب کے اضلاع کے مدرسوں کے اساتذہ وطلبہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ نمازِ جنازہ دارالعلوم کے استاذ حدیث مولانا نعمت اللہ اعظمی مدظلہ نے پڑھائی اور اس گنجینۂ علم وکمال کو اکابر ومشائخ کے پہلو میں مقبرۂ قاسمیہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

رہے نام اللہ کا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

نور عالم خلیل امینی

جمعہ ۵؍ بجے شام ۱۱؍ رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ

۸؍ دسمبر ۲۰۰۰ء

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

ایک نظر میں

- نام: مولانا وحید الزماں بن مولانا مسیح الزماں بن مولانا محمد اسماعیل بن مولانا محمد حسین۔
- تاریخ پیدائش: ۱۷ر فروری ۱۹۳۰ء (۲۷ر شوال ۱۳۴۹ھ)
- مقام پیدائش: قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر، یوپی۔

ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد، دادا، پردادا سب حضرات عالم دین تھے اور آپ کی دادی، نواب قطب الدین مصنف ''مظاہر حق'' کی نواسی تھیں۔

- ابتدائی تعلیم: مدرسہ عربیہ جامعہ مسجد کیرانہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں بہ غرضِ تعلیم حیدر آباد گئے اور ایک سال قیام رہا؛ لیکن تقسیم ہند کی بنا پر تعلیم کا کوئی نظام نہ بن سکا۔
- ۱۹۴۸ء میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوئے۔
- ۱۹۵۲ء میں دار العلوم سے فارغ ہوئے۔

تعلیم کے دوران ممتاز طلبہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ زمانۂ تعلیم میں عربی

زبان کی اشاعت کے لیے ''سلسلۃ الدروس العربیۃ'' کے نام سے اسباق لکھ کر آویزاں کرتے تھے اور طلبہ کو مشق بھی کراتے تھے۔ دار العلوم میں آنے والے عرب مہمانوں کے استقبال اور سپاس نامے وغیرہ لکھنے کا کام آپ ہی انجام دیتے تھے۔ مختلف جلسوں میں عربی مقالے بھی پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دار العلوم کے عربی کے تحریری کام بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔ پانچ سال تک تمام کتابوں میں اعلیٰ نمبرات حاصل کیے اور خصوصی انعامات بھی۔ امتیازی حیثیت کی بنا پر دار العلوم کی جانب سے پندرہ روپے ماہانہ خصوصی وظیفہ بھی جاری کیا گیا۔ زمانۂ طالب علمی میں جمعیۃ الطلبہ کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔

- فراغت کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رئیس الاحرار مرحوم کے پرائیویٹ سکریٹری رہے اور ان کے ساتھ بڑی بڑی سرکاری ضیافتوں میں شریک ہوئے۔
- ۱۹۵۶ء میں ۹ افراد پر مشتمل ایک سرکاری خیر سگالی وفد (گڈول مشن) سعودی عرب گیا۔ آپ اس میں بہ حیثیت ایک ترجمان ممبر کے شامل تھے۔
- سعودی عرب سے واپسی کے بعد محمد احمد کاظمی مرحوم ممبر پارلیمنٹ کی کتاب ''تقسیم ہند اور مسلمان'' کا " تقسیم الهند و المسلمون في الجمهورية الهندية " کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔
- اسی زمانے میں مختلف موضوعات پر سات کتابیں تصنیف کیں، جن

میں سے بعض کے نام یہ ہیں: (۱) آخرت کا سفر نامہ (۲) شرعی نماز (۳) انسانیت کا پیغام (۴) اچھا خاوند (۵) اچھی بیوی۔

- اسی دوران ''القاموس الجدید'' اردو عربی ڈکشنری کی تکمیل کی۔
- ۱۹۵۹ء میں دیوبند میں ''دار الفکر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے تحت عربی اور انگریزی زبان کی کلاسیں جاری کی گئیں اور ماہ نامہ ''القاسم'' بھی اسی ادارے سے جاری کیا گیا، جو کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ اسی ادارے سے القاموس الجدید اردو عربی ڈکشنری پہلی بار شائع ہوئی۔
- ۱۹۶۳ء میں دار العلوم دیوبند میں بہ حیثیت استاذ عربی تقرر ہوا (آپ نے اس کے لیے کوئی درخواست نہیں کی تھی؛ بل کہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ نے از خود تقرر کیا تھا) ایک سال بعد استقلال کے ساتھ درجۂ وسطی (ب) میں آپ کا نام درج کیا گیا۔
- ۱۹۶۵ء میں سہ ماہی مجلّہ ''دعوۃ الحق'' کا اجرا عمل میں آیا اور آپ کو اس کی ادارت سپرد کی گئی۔
- چند سال بعد درجۂ وسطی (الف) میں ترقی دی گئی۔
- ۱۹۷۵ء میں درجۂ علیا میں ترقی دی گئی اور ۱۹۷۶ء و ۱۹۷۷ء میں عربی زبان وادب کے ساتھ حدیث کی دو مشہور کتابوں طحاوی شریف اور نسائی شریف کا درس بھی دیا۔
- ''دعوۃ الحق'' کے بند ہوجانے کے بعد پندرہ روزہ ''الداعی'' کی

ادارت کچھ عرصے تک سپرد رہی۔

- دارالعلوم میں تدریس کے دوران ''النادی الادبی'' کے نام سے طلبہ کی ایک عربی انجمن قائم کی، جس سے ہر سال تقریباً تین سو طلبا وابستہ ہوکر، عربی زبان کی تقریری اور تحریری مشق کرتے تھے۔ اس کے تحت بہت سے قلمی پرچے بھی نکالے گئے اور اس کے ذریعے طلبہ کو علمی پروگراموں کے ساتھ، انتظامی امور کی بھی تربیت دی گئی۔
- اسی عرصے میں ''القاموس الجدید'' عربی اردو ڈکشنری اور ''القراءۃ الواضحہ'' کے تین حصے اشاعت پذیر ہوئے۔ واضح رہے کہ القاموس الجدید (اردو عربی اور عربی اردو دونوں) اور ''القراءۃ الواضحہ'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور آخر الذکر کتاب بہت سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں داخل نصاب ہے۔
- ۱۹۷۷ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے ایک سہ رکنی وفد کی سربراہی کرتے ہوئے متعدد عرب ممالک (سعودی عرب، بحرین، متحدہ عرب امارات وغیرہ) کا دورہ کیا۔ ایک طویل عرصے تک آپ جمعیۃ علمائے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور اس کے پندرہ روزہ عربی اخبار ''الکفاح'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ جمعیۃ کے تصنیفی شعبے ''مرکز دعوت اسلام'' کے ڈائریکٹر بھی رہے، جو آپ ہی کی تحریک پر قائم کیا گیا تھا اور اس شعبے سے متعدد علمی اور اصلاحی کتابیں شائع کیں۔
- ۱۹۸۰ء میں اجلاسِ صد سالہ کے لیے فراہمیِ مالیات کے سلسلے میں

مشرقی یوپی کے اضلاع کا کام یاب دورہ کیا۔

- اجلاسِ صد سالہ کی تیاری کے لیے بنائی گئی کمیٹیوں کا آپ کو کنوینر مقرر کیا گیا، نیز دار العلوم کی تزئین و ترمیم اور تعمیر جدید کا کام بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔ آٹھ ماہ کے عرصے میں دار العلوم میں ہر چہار جانب بوسیدہ اور مرمت طلب عمارتوں کی اصلاح و ترمیم ہوئی اور بے شمار جدید تعمیرات ہوئیں، جیسے قدیم مسجد کا صدر دروازہ، دار العلوم کے صدر دروازے کی بالائی منزل کی تعمیر، احاطۂ کتب خانہ کا دو منزلہ برآمدہ، دفتر تعلیمات، دار جدید کی بالائی منزل کے بہت سے کمرے، دار الحدیث فوقانی کی دائیں اور بائیں جانب دو درس گاہیں اور ان کے سہ طرف برآمدے اور اس طرح کی مختلف تعمیرات۔
- اجلاسِ صد سالہ کے عین موقع پر ذیابیطس کے مرض کی شدت اور شب و روز کی محنت و شب بیداری کے نتیجے میں شدید بیماری کا حملہ ہوا، جس کے باعث اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ اسٹیج کا ذمے دار اور اناؤنسر بھی آپ ہی کو بنایا گیا تھا۔
- اجلاسِ صد سالہ کے اختتام پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند نے دار التربیت کی تعمیر اور اس کے نظامِ کار کو مرتب کر کے چلانے کا کام بھی آپ کے سپرد فرمایا۔ اس کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر نے دس لاکھ کی رقم عنایت کی تھی —— اس کے بعد دار العلوم کے حالات اندرونی طور پر بگڑنے

شروع ہوئے، جس نے رفتہ رفتہ انقلاب کی صورت اختیار کرلی۔

- ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم کے دوبارہ کھل جانے کے کچھ عرصے بعد ۱۹۸۳ء میں آپ کو ناظم مجلس تعلیمی بنایا گیا اور اسی سال آپ نے ماریشش، ری یونین، انگلینڈ، مصر اور پیرس کا سفر کیا۔
- ۱۹۸۵ء میں آپ کو معاون مہتمم بنایا گیا۔ اس زمانے میں بہت سی نئی تعمیرات اور دفتری نظام کی اصلاح، طریقۂ کار میں پھرتی اور تیز رفتاری اور نظام تعلیم میں پختگی پیدا کرنے جیسی بہت سی نمایاں انتظامی خدمات انجام دیں۔ ہندوستان کے بعض علاقوں سے مالیات کی فراہمی کا کام بھی کیا۔ پندرہ روزہ ''آئینہ دارالعلوم'' کا اجرا کیا۔
- پھر ۱۹۸۷ء میں معاون مہتمم کے عہدے سے استعفا دے کر تدریس پر واپس آ گئے۔
- دارالعلوم کی انتظامی ذمے داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد، ۱۹۸۸ء میں ''دارالمؤلفین'' کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے نے نوجوان فضلائے دارالعلوم کی تصنیفی رفاقت حاصل کی اور نامساعد حالات اور کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہ ہونے کے باوجود، دو سال کے عرصے میں تقریباً دو درجن کتابیں شائع کیں۔ نیز اسی دور میں سابق القاموس الجدید اردو عربی اور عربی اردو میں گراں قدر اضافہ کیا۔
- ۱۹۸۸ء میں دہلی میں منعقدہ ملّی کنونشن میں ''ملّی جمعیۃ علمائے ہند'' کا

قیام عمل میں آیا اور آپ کو بہ اتفاق رائے اس کا صدر منتخب کیا گیا۔

- ۱۹۹۰ء میں مجلس شوریٰ نے تدریسی ذمے داریوں سے سبک دوش کر کے آپ کو پنشن دینا منظور کیا۔
- ۱۹۹۰ء میں ہی وزارتِ حج و اوقاف سعودی عرب کی دعوت پر، حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔
- جنوری ۱۹۹۲ء میں وزارت اطلاعات ونشریات کویت کی طرف سے منعقدہ عالمی اسلامی کانفرنس میں شرکت فرمائی۔
- اسی سال مرکزی جمعیۃ العلماء کے صدر منتخب ہوئے۔
- ۱۹۹۳ء-۱۹۹۴ء میں ایک ضخیم قاموس بڑے سائز کی ۱۸۰۰ر صفحات پر مشتمل تالیف فرمائی۔
- اسی دوران مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی معارف القرآن سے اہم علمی و تحقیقی مباحث کو کئی جلدوں میں ''جواہر المعارف'' کے نام سے جمع فرمایا، جس کی ایک جلد چھپ چکی ہے۔
- ۱۹۹۴ء میں قرآن پاک کے اردو ترجمے کا آغاز فرمایا۔
- ۱۹۹۵ء میں مشکوۃ شریف سے اخلاق و آداب و معاشرت پر مشتمل حدیثوں کا ایک قیمتی مجموعہ مرتب فرمایا۔
- تقریباً تمام ہی عربی ملکوں کا وقتاً فوقتاً دورہ فرمایا اور وہاں کی دعوت پر کانفرنسوں اور مجالس علمی میں شرکت فرمائی۔
- بہت سے مدرسوں کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے۔

- بہت سے مدرسوں میں عربی زبان کے شعبوں اور ادبی انجمنوں کے سرپرست رہے۔
- ان کے شاگرد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جامعات و مدارس میں اساتذہ یا جماعتوں اور اداروں کے قائدین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
- ان کے بعض شاگرد برصغیر کے نامور اہل قلم اور عربی و اردو زبان و ادب کے مسلم ادیب اور مصنف کی حیثیت سے اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں۔

(*) حاشیہ ص:۲۴۵

حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہ: دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس و نائب مہتمم ہیں۔ ۲۱ / ربیع الاول ۱۳۳۷ھ = ۲۳ / دسمبر ۱۹۱۸ء میں موضع ''بسی'' ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب جناب عبدالشکور خاں صاحب زمین دار اور فوج میں ملازم تھے، علما اور علم دوست اور دین دار آدمی تھے۔ ترک موالات کے فتوے کے بعد انھوں نے انگریزی حکومت کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اپنی دین داری کی وجہ سے اپنے تینوں صاحب زادوں: مولانا بشیر احمد خاں صاحب، حافظ عبدالکریم اور مولانا نصیر احمد خاں صاحب کو دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔

مولانا نصیر احمد خاں صاحب نے حفظ قرآن پاک کے ساتھ ساری تعلیم از ابتدا تا دورۂ حدیث شریف مدرسہ منبع العلوم، گلاؤٹھی، بلند شہر میں حاصل کی۔ پھر ۱۳۶۱ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور دوبارہ دورۂ حدیث کیا نیز دیگر بہت سے علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔ اساتذہ میں حضرت مدنی، ان کے اپنے بڑے بھائی مولانا بشیر احمد خاں صاحب اور مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک شامل ہیں۔ یکم ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ کو دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس تقرر ہوا۔ ۲۴ / ذی قعدہ ۱۳۷۲ھ کو وسطی ب میں ترقی ملی اور ۲۴ / شعبان ۱۳۸۶ھ کو وسطی الف میں۔ جب کہ ۶ / صفر ۱۳۹۱ھ کو درجہ علیا میں، نیز اسی تاریخ کو منصب نیابت اہتمام پر سرفراز کیا گیا۔ صفر ۱۴۰۰ھ میں قائم مقام صدر مدرس اور ربیع الاول ۱۴۱۲ھ میں صدر مدرس کا عہدہ تفویض ہوا۔ ۱۳۹۷ھ سے بہ حیثیت شیخ الحدیث بخاری شریف کی تدریس کی ذمے داری تفویض ہوئی۔ تین مرتبہ حج اور زیارت سے شرف یاب ہو چکے ہیں۔ تواضع حلم و بردباری، نرم خوئی، خوش اخلاقی، صلاح، تقوی وغیرہ صفات کی وجہ سے آپ طلبہ، اساتذہ، ملازمین اور تمام متعلقین دارالعلوم میں محبوب شخصیت کے مالک ہیں۔ معقول ومنقول دونوں میں کامل دست گاہ رکھتے ہیں؛ بل کہ دارالعلوم میں علوم عقلیہ کے ماہرین کی اس وقت آخری کڑی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اشاریہ

INDEX

شخصیات

ب پ ت ث

ج ح خ

د ذ ر ز

ع غ

ف ق ك گ

(ل) (م)

ن

مقامات

الف

☆ ☆ ☆

کتابیات

(الف) (ب) (پ)

☆ ☆ ☆

ادارے

س ش ص ط

ع ف ق ک

☆ ☆ ☆

☆ ☆

☆

”وہ کوہ کن کی بات...“

نام ور علما، ادبا اور صحافیوں کے

تاثرات کی روشنی میں

یہ کتاب صرف سوانح حیات ہی نہیں؛ بل کہ ایک ادبی شاہ کار بھی ہے

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند، ۱۴؍جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ = ۸؍نومبر ۱۹۹۵ء

مکرمی جناب مولانا نور عالم صاحب! زید لطفکم

سلام مسنون! حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات پر مشتمل آپ کی تصنیف ''وہ کوہ کن کی بات'' پڑھنے کا موقع ملا۔ مولانا مرحوم کے حالات و واقعات، آپ نے اس خوب صورتی سے تحریر کیے ہیں کہ ان کی علمی و عملی زندگی کی متحرک و خوش نما تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے گویا ''یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ حضرت محترم، دارالعلوم کے مایہ ناز اور قابل فخر فرزند تھے۔ دارالعلوم کے لیے ان کی تعلیمی و انتظامی و تعمیری خدمات، دارالعلوم کی تاریخ میں نقش کالحجر رہیں گی۔

کتاب اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بے مثال ہے اور سبق آموز ہونے کی بنا پر، اس کے محاسن میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ حضرت مولانا مرحوم کے آہنی عزم و حوصلے اور قوتِ عمل کے تابندہ کارناموں کی دل چسپ حکایت، پڑھنے والوں کے لیے حوصلہ افزا، درس انگیز اور جذبہ خیز ثابت ہوگی۔

''وہ کوہ کن کی بات'' زبان کی شگفتگی، انداز بیان کی برجستگی و بے ساختگی کے اعتبار سے لائق صد تحسین ہے۔ پڑھنے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کا کوئی شیدائی و فدائی پاس بیٹھے ان کی داستان حیات سنا رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب، صرف سوانح حیات ہی نہیں بل کہ ایک ادبی شاہ کار یا شہ پارہ بھی ہے۔

یہ کتاب اساتذہ و تلامذہ کے لیے مشعل راہ ہوگی

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحبؒ، مبارک پور/ اعظم گڑھ، ۲۶؍ربیع الآخر ۱۴۱۶ھ

عزیز گرامی مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بہ عافیت ہو۔

آپ کی مرسلہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' ملی، یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔

کتاب اس قدر دل چسپ اور مؤثر انداز میں لکھی گئی ہے کہ ملتے ہی ہاتھ میں لیا، تو ختم کر کے ہی رکھا۔ اس میں نہ انشائیہ ہے، نہ سوانحی خاکہ ہے اور نہ سوانح عمری ہے؛ بل کہ اس میں مختصر ہونے کے باوجود سب کچھ ہے۔ آپ نے اپنے علمی مربی اور استاذ مولانا وحید الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متفرق حالات کو، جس عقیدت و محبت اور سلیقہ مندی سے مرتب کیا ہے، اس کا ظہور کتاب کی سطر سطر سے ہوتا ہے؛ انداز بیان

اور طرزِ تحریر نے کتاب کو علمی اور ادبی بنا دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کی زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اور مردم سازی، مردم شناسی، تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور تنظیم میں وہ کس قدر کام یاب تھے۔ یہ آپ کی سعادت مندی ہے کہ قلیل عرصے میں اپنے محسن و مربی استاذ کے حالات کو نہایت والہانہ اور سبق آموز انداز میں لکھ کر، ان کے علمی و ادبی کارناموں سے اہلِ علم کو روشناس کرایا ہے۔ ان شاء اللہ یہ کتاب ہمارے مدارس کے اساتذہ و تلامذہ کے لیے مشعلِ راہ ہوگی اور وہ اس سے بہت کچھ حاصل کریں گے۔

آپ نے یہ اچھا کیا کہ مولانا مرحوم کے جن تلامذہ و متعلقین کے نام کتاب میں آئے، ان کا تذکرہ حاشیے میں کر دیا، یہ بھی بڑے کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے علم و قلم میں برکت عطا فرمائے۔ والسلام

ہر سطر سے، فارسی اور اردو ادب کے ساتھ مصنف کا شغف، جھلکتا ہے

جناب سید حامد صاحب، سابق وائس چانسلر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

تعلیم آباد نئی دہلی ۳۰؍ اکتوبر ۱۹۹۵ء

مولانا نور عالم خلیل امینی نے از راہِ کرم اپنی کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' کی ایک جلد سے مجھے نوازا۔ فاضل مصنف دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب پڑھاتے ہیں؛ لیکن ان کا پیرایۂ بیان فارسی ادب کے اثرات کی غمازی کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ زورِ قلم میں اضافہ ہو۔

انتسابات اور ''حرفِ اول'' سے امینی صاحب کے عیقدت مندانہ زاویۂ نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کا موضوع اور صاحبِ کتاب کے ممدوح حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی قاسمی سابق استاذ و معاون مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں۔ اس برگزیدہ شخصیت کے ساتھ مصنف کے قلم نے عقیدت مندانہ انصاف کیا ہے۔ خود لکھتے ہیں کہ '' بے جا طور پر مولانا ہمارے قلم اور زبان کے اعصاب پر نہ صرف پیشِ نظر تحریر میں، بل کہ آیندہ بھی موقع بے موقع چھائے رہیں تو کچھ عجب نہیں۔

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے اسلوبِ نگارش کو مولانا ابوالکلام آزاد کے طرزِ تحریر پر ڈھالا ہے۔ فارسی اور اردو ادب سے ان کا شغف ہر سطر سے، جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔

ماشاء اللہ آپ اردو کے میدان کے بھی شہ سوار نکلے

حضرت مولانا ابوالقاسم نعمانی

رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند ۱۴؍۴؍۱۹۹۵ء

عزیز گرامی قدر برادرم مولانا نور عالم صاحب زید فضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مرسلہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات...'' بروقت موصول ہوگئی تھی، اسی دن، دوتین مجلسوں میں کتاب دیکھ لی۔ آپ کی عربی تحریریں تو پڑھتا ہی رہتا ہوں؛ لیکن کوئی باضابطہ اردو تحریر پڑھنے کا یہ پہلا موقع ہے۔ ماشاء اللہ آپ اس میدان کے بھی شہ سوار نکلے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کتاب پسند آئی۔ یہ وضاحت شروع ہی میں کردی گئی ہے کہ مولانا مرحوم کی کوئی باقاعدہ سوانح نہیں ہے، اس لیے اس میں زندگی کے کچھ گوشوں کا نہ ہونا، نہ محلِ کلام ہے، نہ اس کی وجہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

کتاب کو خراجِ عقیدت ومحبت کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور اس نقطۂ نظر سے یہ خوب ہے۔ اصل کتاب اور حواشی کے ذریعے بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں:

دنیائے تخیل ہے کہانی میری	کہتا ہے کوئی مجھ سے کہانی میری
اس ''محفل'' پرکیف کے صدقے کہ مجھے	یاد آگئی گم گشتہ ''جوانی'' میری

(علیم مسرور)

شکرگزار ہوں کہ آپ نے، اس گم نام کا نام بھی حضرت مولانا کے نام کے ساتھ جوڑ کر، اسے زندہ جاوید بن جانے کا موقع فراہم کیا ہے، اب یہ مقصد حاصل ہو یا نہ ہو؛ لیکن آپ تو شکریے کے بہ ہر حال مستحق ہیں۔

کتاب ٹکسالی اردو زبان وادب کا نمونہ ہے

مولانا محمد بدرالدین اجمل القاسمی
رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، ۱۸/۱۱/۱۹۹۵ء

مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۲۲؍ جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۶؍ نومبر ۱۹۹۵ء، کے موقع پر، جب احقر دیوبند حاضر ہوا، تو اسے قدرے اطمینان کے ساتھ برادرِ مکرم جناب مولانا نور عالم صاحب خلیل امینی کی شاہ کار اور باوقار تصنیف ''وہ کوہ کن کی بات...'' کے پڑھنے کا موقع ملا۔ کتاب کی ہر چیز: کاغذ، ٹائٹل، کتابت، طباعت، ترتیب، اسلوبِ نگارش نہایت عمدہ دیدہ زیب اور دل کش ہے۔

یہ کتاب نہ صرف حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی رحمہ اللہ جیسی قابلِ فخر، باکمال، باصلاحیت، عہد ساز، مردم ساز اور سحر طراز شخصیت کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک حسین مرقع ہے؛ بل کہ تعلیم وتربیت کے حوالے سے، برصغیر ہندوستان کے اسلامی مدارس، بالخصوص مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی گزشتہ تقریباً نصف صدی کی تاریخی دستاویز بھی ہے۔

مولانا موصوف کا اسلوبِ نگارش نہایت دل چسپ، پیرایۂ بیان شستہ وشگفتہ اور جملوں کی نشست وبرخاست تذکرہ نگاری کی دنیا اور ہمارے عربی مدارس کے ماحول میں ٹکسالی اردو زبان وادب کا اچھوتا نمونہ ہے۔

کتاب کی ہر ہر سطر، موصوف کی حضرت مولانا کے تئیں پرخلوص جذباتِ عقیدت ومحبت کی عکاس،

موصوف کی طبعی نفاست پسندی کی آئینہ دار اور اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ موصوف نے حضرت مولانا کی یگانۂ روزگار اور بے شمار خوبیوں کی حامل شخصیت سے، نہ صرف یہ کہ عربی زبان وادب کی دولتِ بے بہا حاصل کی ہے؛ بل کہ مولانا کے مزاج ومذاق کو بھی خوب اچھی طرح سے پیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ محترم امینی صاحب کی یہ کتاب، جہاں ان کے لیے بڑی سعادت وخوش بختی کی بات ہے، وہیں دوسرے حضرات کے لیے قابلِ رشک اور اساتذۂ مدارس کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

☆ ☆ ☆

کتاب شروع کرنے کے بعد ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا

مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مفتی دارالعلوم دیوبند، ۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

برادرِ عزیز (مولانا امینی) سلمۂ اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کی تازہ تصنیف لطیف ''وہ کوہ کن کی بات...'' ابھی ایک صاحب سے ملی، سرسری طور پر دیکھ گیا، پسند آئی، خاک سار پر جو حاشیہ لکھا ہے، وہ بھی پڑھا۔ آپ کی کتاب کا لب ولہجہ اور بے ساختگی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اگر میرا کوئی ایسا شاگرد ہوتا، تو مرجانے میں فائدہ تھا۔ جو بھی آپ کی کتاب پڑھے گا اور اہلِ دل ہوگا، تو وہ ایسے تلمیذ رشید کی سعادت مندی پر لازماً فخر کرے گا اور کہے گا کہ کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے بھی مل جاتا اور میں مرجاتا۔ اللہ آپ کی یہ خدمت قبول فرمائے اور اس کے ثمرے میں کوئی ایسا ہی آپ کو شاگرد بھی عطا کردے، آمین

بڑے خوش قسمت ہیں وہ اساتذہ اور علمائے کرام، جنھیں اپنی زندگی میں علمی، اصلاحی اور تعلیمی خدمات کے مواقع میسر ہوئے اور انھوں نے اپنی زندگی میں، ان خدمات کو اخلاص کے ساتھ انجام دیا، بالخصوص تلامذہ کی تعلیم وتربیت میں پوری دل چسپی لی اور انھیں کار آمد بنا کر، ملک وملت کی خدمات کے لیے تیار کیا۔ ایسے اساتذہ کی خدمات پر جس قدر فخر کیا جائے کم ہے۔ حضرت مولانا وحید الزماں مرحوم قاسمی کیرانوی کا ایسے ہی اساتذہ میں شمار ہے۔

''وہ کوہ کن کی بات'' میں ان کی تعلیمی وعلمی خوبیوں اور خدمات کا بڑے وقیع اور دل پذیر انداز میں تذکرہ ہے۔ آپ نے اپنے تعلق اور مولانا کی مساعی جمیلہ کو موثر انداز میں بیان کیا ہے، پوری کتاب کی زبان شگفتہ وشیریں اور سادہ وسلیس ہے۔ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک مرتبہ میں پھر دہراتا ہوں کہ اپنا خیال ہے کہ مصنف کے جذبۂ دل سے متاثر ہوئے بغیر کوئی پڑھنے والا نہ رہ سکے گا؛ بل کہ وہ سوچے گا کہ کاش ایسا شاگرد ہمارے حصے میں بھی آتا۔

یہ کتاب طلبۂ مدارس کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے، انھیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ آپ ہم سبھوں کی طرف سے لائق صد تبریک وتہنیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی یہ خدمت قبول فرمائے۔

اسے کتاب کیوں کہیے؟ دل کے ٹکڑوں کا حسین گل دستہ نام دیجیے

مولانا برہان الدین سنبھلی، استاذ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

از لکھنؤ ۱۴۱۶/۴/۴ھ

مکرمی ومحترمی فاضل گرامی مولانا نور عالم صاحب امینی زاد فضلکم وعم الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج شریف؟ کل اچانک رجسٹرڈ ڈاک سے پیکٹ ملا، کھولا تو اس کے اندر جنت نگاہ، اور فردوس ''ہوش'' کو ہم دست پا کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں؛ کیوں کہ راقم کی نظر سے اب تک ایسا حسین ڈسٹ کور نہیں گزرا تھا، کہ جو نقوش زریں سے مزین ہونے کے ساتھ ''لَوْنُهَا یَسُرُّ النَّاظِرِیْنَ'' کا بھی مصداق ہو! یہ تو ظاہر کے بارے میں میرا اولین تاثر وانطباع تھا۔ ایسے ظاہر کے نظارے کے بعد قلب ونگاہ کو یہ تاب کہاں تھی کہ باطن کو جھانکے بغیر رہ جائے، چناں چہ نہ صرف جھانکنے؛ بل کہ اس کے اندر ڈوب جانے پر دونوں مصر اور بے چین ہوئے (حالاں کہ ان دنوں، ان دونوں کی توجہ طلب کئی اور کتابیں اتفاقاً پہونچ گئی تھیں) اور جب تک اس کنارے سے دوسرے کنارے تک کی سیر نہ کرلی، بے تابی ختم نہیں ہوئی۔ ساتھ ہی قاآنی کے ان قصائد کی یاد تازہ ہوگئی، جو اس نے اپنے ممدوح کے لیے کہے تھے۔

اسے کتاب کیوں کہیے دل کے ٹکڑوں اور جگر پاروں کا حسین گلدستہ نام دیجیے، جس کے ذریعے واقعہ یہ ہے کہ آپ نے حق تلمذ ادا کردیا اور یقیناً اس زریں فہرست میں نام لکھالیا، جس میں شاگردوں کے اپنے اساتذہ کے ساتھ والہانہ تعلق کی تاریخ بنانے اور جریدۂ عالم پر نقش دوام ثبت کردینے والوں کے نام ہیں۔ جس طرح آپ نے اپنے استاذ کے بارے میں لکھا ہے کہ ''قریبی دور میں ان کی نظیر نہیں ملے گی...'' اسی طرح میرا تاثر یہ ہے کہ ایسے تلمیذِ باتمیز کی بھی قریبی دور میں نظیر نہیں ملے گی۔ بیان مطلب کے لیے آپ کے سامنے الفاظ کے ذخیرے اور تمثیلات وکنایات کے دفاتر، لگتا ہے کہ ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور دعوتِ انتخاب دے رہے تھے: تاکہ جس کا انتخاب ہوجائے وہ اپنی قسمت پر نازاں ہو! (قاآنی سے تشبیہ اسی وجہ سے دی) ممدوح اصلی کے ذیل میں اور جن بہت سے لوگوں کا ضمناً ذکر آگیا ہے، وہ بھی اپنے کو یقیناً خوش قسمت سمجھ رہے ہوں گے!۔

مولانا سید محمد الحسنی مرحوم پر جو کچھ آپ نے ایک صفحے میں لکھ دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ان کی ''سوانح حیات'' کا متن متین ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسی حسین کتاب، تو جس قیمت پر بھی ملے سستی ہے۔ ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں کتاب کا ختم ہوجانا میرے دعوے کی دلیل ہے، اس سے ''دیوبندیوں'' کی پاکیزگیٔ ذوق کا بھی ثبوت ملتا ہے (جنھیں بہت سے لوگ اس کوچے سے ناآشنا سمجھتے ہیں) آپ کے اس قلمی شاہ کار کو دیکھنے والے کے لیے، یہ فیصلہ کرنا یقیناً مشکل ہوگا کہ آپ عربی زیادہ اچھی لکھتے ہیں یا اردو؟ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ہر صاحب ذوق، اس کتاب کو شوق کے ہاتھوں لے کر قدر کی نگاہوں سے پڑھنے پر مجبور ہے

مولانا محمد رضوان القاسمی
ناظم دار العلوم سبیل السلام، سبیل نگر حیدر آباد، ۱۲؍ جمادی الاخری ۱۴۱۶ھ = ۶؍ نومبر ۱۹۹۵ء

اخی الاعز مولانا نور عالم خلیل امینی زادہ اللہ علما و شرفا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمہ پر آپ کی تحریر کردہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات...'' نظر نواز ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی ذات والا صفات اپنی گونا گوں خوبیوں، علمی و عملی کمالات اور اپنی تعلیمی و تربیتی اور انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ان کی پہلو دار اور ہمہ جہتی و ہمہ رخی شخصیت میں ایک معلّم کی دردمندی و دل سوزی، ایک مربی کی شفقت نوازی و کرم گستری، ایک خطیب کی جادو بیانی و سحر انگیزی، ایک مصنف و مؤلف کی وسعت ظرفی و بلند فکری، ایک مدبر و منتظم کی بیدار مغزی، حوصلہ مندی اور ایک صحافی کی دور اندیشی و دیدہ وری نظر آتی ہے۔ علم و عمل کے صبر آزما سفر میں، وہ حقیقی معنوں میں ''کوہِ استقامت'' تھے۔ ہمت و شجاعت، اعلیٰ ظرفی و بلند حوصلگی کے وہ پیکر مجسم تھے۔ عربی زبان و ادب کی انھوں نے جو لازوال اور قابلِ رشک علمی خدمات انجام دی ہیں، وہ نہ صرف دار العلوم دیوبند؛ بل کہ پورے برصغیر کی علمی و دینی جامعات، تحریکات اور شخصیات کے لیے باعث افتخار ہیں۔ قحط الرجال کے اس دور میں انھوں نے ''مردم سازی'' کا جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ میری نظر میں ان کی تمام قابلِ ذکر اعلیٰ صفات میں سب سے بڑی صفت ''مردم سازی'' کی تھی، ان کی اس صفت نے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی کا سلیقہ سکھایا ہے، ان کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارا ہے، چھپے ہوئے جوہر کو چمکایا ہے اور میدانِ کار میں اتار کر کام کرنے کا مثالی حوصلہ بخشا ہے مگر اب تو:

وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ

آپ نے دار العلوم دیوبند کی ایک عظیم عہد ساز شخصیت پر، جس دقت نظری اور وسعت فکری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، اس پر آپ یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں۔ طرز نگارش اور اسلوب بیان بھی خوب ہے۔ ہر صاحبِ ذوق آپ کی اس کتاب کو شوق کے ہاتھوں لے کر قدر کی نگاہوں سے پڑھنے پر مجبور ہے۔ مولانا مرحوم سے متعلق آپ کے تاثرات اور احساسات کا یہ مجموعہ، مولانا کے بعد ایک مخلص معلّم اور مشفق مربی کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی بافیض صحبت کا ایک بدل ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں، اپنے پُرتاثیر قلم کا جادو کچھ اس طرح جگایا ہے کہ کتاب کے اوراق میں مولانا ہمیشہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے، ان کو دیکھنے والے اور نہ دیکھنے والے دونوں یکساں طور پر ان کی اس نقل و حرکت اور آمد و رفت سے لطف اندوز اور مستفید ہوتے

رہیں گے اور جگر کا یہ شعر پڑھ کر آپ کو داد دیتے رہیں گے:

وہ آئے کب کے، گئے بھی کب کے، نظر میں اب تک سمار ہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

تاہم ان کے بعض خواب، بعض جھمیلوں میں پھنسنے کی وجہ سے جو ادھورے رہ گئے اور لغت نویسی کے جدید خاکوں میں جو رنگ نہیں بھرے جاسکے، اس کا افسوس تو ہم جیسے شاگردوں کو ہمیشہ رہے گا۔ دار الفکر سے دار المؤلفین کا علمی اور فکری سفر بھی ان کا ایک خواب تھا، کاش یہ ''شجر طوبیٰ'' اپنی بہار جاں فزا مزید دکھلا سکتا اور اسے مستحکم بنیادیں فراہم ہوسکتیں۔

ہاں یہ بھی آپ نے اچھا کیا کہ مولانا کے آخری دور کے تذکرے پر ''مصلحتوں'' کی چادر ڈال دی اور کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا...

میں دوبارہ اس کتاب کی تالیف وترتیب اور حسن طباعت واشاعت پر تہنیت ومبارک باد پیش کرتا ہوں۔ واقعہ ہے کہ خوبیوں کی حامل شخصیت پر، خوبیوں کے حامل قلم نے، اپنی خوبیوں کا جو جوہر دکھایا ہے، وہ بہت خوب ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین وعلم کی اور عربی زبان کی خدمت لیتا رہے اور آپ کا مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو اور قلم کسی طرح کے تعب اور تھکن سے آشنا نہ ہو۔

کتاب ''عروس جمیل درلباس حریر'' کی مصداق ہے

ڈاکٹر شمس تبریز خاں قاسمی

شعبۂ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی، ۲۶ر ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ = ۲۳ر ستمبر ۱۹۹۵ء

برادر محترم مولانا امینی صاحب زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہدیۂ امینی سرمۂ سلیمانی بن کر پہنچا ''وہ کوہ کن کی بات'' کو رجسٹری سے منگوانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ ہدیہ بن کر نظر نواز ہوگئی۔ کتاب اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں کے لحاظ سے عروس جمیل درلباس حریر کی مصداق ہے اور اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد سامنے آکر غم زدگان کے لیے ایک وجہ تعزیت بن گئی۔

آپ نے حضرت مولانا مرحوم کی پہلو دار شخصیت کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈال دی ہے کہ آئندہ مولانا پر لکھنے والے اس روشنی میں مولانا مرحوم کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔

آپ نے بجا طور پر مولانا کیرانوی کی آدم گری اور مردم سازی کی صلاحیت پر، زیادہ توجہ مبذول کی ہے، جو آج کے اساتذہ میں مفقود نظر آتی ہے۔ آپ میری نظر میں مولانا کیرانوی کے خلف الصدق ہیں اور مولانا مرحوم کی تعلیم وتربیت کا ایک عمدہ نمونہ۔ جو لوگ مولانا مرحوم سے واقف ہیں، ان کو آپ کی تحریر میں

خلوص ومحبت، عقیدت وقلبی تعلق، احسان شناسی اور اعترافِ حق ہی نظر آئے گا۔ کسی بڑی شخصیت کے تعارف کے لیے، جس ژرف نگاہی اور مردم شناسی، خلوص وصداقت، حساسیت اور قوتِ اظہار اور سیرت نگاری کی صلاحیت اور اپنے موضوع سے ہم دردی وہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے؛ اس لیے آپ نے موضوع کا حق ادا کرنے میں بڑی حد تک کام یابی حاصل کی ہے۔

میں مدیر الداعی کی عربیت وادبیت کا تو قائل ہی تھا، ماشاء اللہ ان کی اردو بھی بہت رواں دواں اور شستہ وشگفتہ نظر آئی۔

کتاب کا وجود، ادبی ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ ہے

مولانا صادق علی قاسمی، ایڈیٹر ''نقوشِ حیات'' بستی

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب (برد اللہ ضریحہ) واقعی ''وحید زماں'' علم وعمل اور عزم وجزم کے کوہ گراں اور اسم با مسمیٰ تھے۔ وہ جہاں بھی رہے، جس مسند کو بھی سنبھالا، ان کی دیوانہ وار عملی زندگی؛ شاگردوں، دوستوں اور ماتحتوں کے لیے، ایک طوفان بن کر سامنے آئی، جس کی زد میں آکر، گھبرا کر ساحل تلاش کرنے والوں اور مد مقابل آکر، اس طوفان کو دبانے کی جہد مسلسل کرنے والوں اور اس سے ٹکرا کر اس سے چور چور ہو جانے والوں کو میں نے خود دیکھا بھی ہے اور سنا بھی۔

حضرت مولانا مرحوم کے اس طوفانی جذبے کو بھی دیکھا ہے جنھوں نے پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانوں کو توڑ پھوڑ کر اپنی منصوبہ بند تعمیرات میں، کنکر پتھر بنا کر دیواروں میں چنوا دیا۔

جب ان کی تیز طرار طبیعت پورے عزم وجزم کے ساتھ، طوفان کی صورت میں ڈھل گئی، تو اس نے حقیقی طوفان کی خصلت وجبلت ہی کو کچھ دیر اور کچھ دور کے لیے بدل دیا؛ اس میں پستی آگئی، سکون آگیا، اس کا دم خم ٹوٹ گیا، ساحل سے لگ کر کھو گیا، گم ہو گیا، ساحل میں منھ چھپا لیا۔

اور جن شاگردوں نے اس طوفان نما انسان کا ساتھ دیا، اس کے دست وبازو بنے رہے، وہی آج ملک وبیرون ملک میں عظیم شخصیتوں کے مالک ہیں، عظیم عہدوں پر فائز ہیں؛ کرسیاں انھیں سلام کرتی ہیں۔

مولانا نور عالم امینی اسی آتش فشاں طوفان کے تپے ہوئے کندن اور آب دار موتی ہیں، جن کا مضبوط، رواں دواں اور پر اثر قلم مولانا مرحوم کی تجہیز وتکفین کے ساتھ ہی حرکت میں آگیا اور مولانا مرحوم کے ساتھ خلوص ومحبت کے جذبۂ بے کراں نے انھیں ایک لخت بھی بیٹھنے اور سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ انھوں نے اپنے دلی جذبات وتاثرات، پراگندہ واردات وخیالات، مقالوں اور مقولوں کو موتی کے دانوں کی طرح کاغذ کے صفحات میں بکھیر دیا اور ''آپ بیتی'' ''استاذ بیتی'' ''احباب بیتی'' کا ایک مجموعۂ شاہ کار بنا کر، ایک دیدہ زیب حقائق سے بھرپور کتاب کی صورت میں عوام وخواص کی بارگاہ عقیدت میں، پیش کر کے مولانا علیہ الرحمہ کو زندۂ جاوید اور کتاب کو نقشِ جاوداں بنا دیا۔

کتاب کو پڑھ کر جہاں جگہ جگہ دل پرغم کے پہاڑ ٹوٹے، آنکھیں نم ہوئیں، بے تابیوں نے کروٹیں لیں، وہیں کتاب کی ظاہری و باطنی خوبیوں اور پائے دار نقش نے مسرتوں سے بھی ہم کنار کیا اور اس درد وغم کے سنگم نے ایک ایسا لاشعوری احساس پیدا کیا کہ اس کی نشان دہی مشکل ہی نہیں مجھ جیسے علم و قلم کے غریب کے لیے ناممکن بھی ہے۔ اس احساس و کیفیت کو کتاب کے مطالعے کے وقت چہرے پر دوڑنے والی ہمہ رنگی کیفیتوں ہی سے اخذ و انتزاع کیا جانا ممکن تھا، جس کے لیے خارج میں کوئی وجود ہی نہیں۔

کتاب کی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں کے باوصف، امینی صاحب کی اپنے دوستوں، ساتھیوں یا مولانا مرحوم کے متعلقین و منتسبین سے جو محبت تھی، جو تعلق تھا، جو جذبۂ ایثار تھا، جو شیفتگی تھی، وہ ان کے کردار سے ظاہر ہے کہ انھوں نے کتاب کو مجموعۂ اوصاف اور مجموعۂ احباب بنا دیا۔ یہ امینی صاحب کا وہ خلوص و ایثار ہے، جو آج کل نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ آج کل لوگ اپنے ساتھیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، انھیں اجاگر کرنا تو بڑی بات ہے۔

محترم امینی صاحب کا اسم گرامی میرے لیے کوئی نیا نہیں ہے۔ ملاقات تو چھوڑیے، شاید کبھی دور سے بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ میرا تاثر کتاب کا تاثر ہے، حق دوستی ادا کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ حضرت مولانا مرحوم کے تعلق سے کچھ لکھ گیا؛ لیکن دلی محسوسات کوتاہ قلمی کے باعث دل ہی میں رہ گئے، دل کے محسوسات کو لفظوں میں لکھ نہیں سکتا۔

کتاب کا مطالعہ ہر خاص و عام، اساتذہ، طلبہ سب کے لیے ضرورت کی حد تک مفید ہے۔ اس کتاب میں عزم ملے گا، حوصلہ ملے گا، کوہ کنی کے طریقے ملیں گے، تعلیم و تربیت کے سلیقے ملیں گے، اخلاق و ایثار کا درس ملے گا، بھائی چارگی، رہن سہن کے پھول اور اتحاد و اتفاق کے گل دستے ملیں گے اور کیا کیا ملیں گے، مطالعے پر موقوف ہے۔

کتاب کا نام بھی انتہائی موزوں ہے۔ کتاب میں زبان و بیان کی سلاست اور روانی، روزمرہ و محاورات کا استعمال قابل ستائش ہے۔ سوانح، آپ بیتی کے علاوہ، اس کتاب کا وجود ادبی ذخیرے میں، ایک اچھا اضافہ ہے۔

کتاب ظاہری و باطنی دونوں طرح کی خوبیوں سے آراستہ ہے

مولانا اسیر ادروی

ایڈیٹر ترجمان الاسلام، بنارس

یہ کتاب درحقیقت جدید عربی ادب وصحافت کے استاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں، ان کے ایک شاگرد رشید کا جذبات سے لبریز اور تاثرات سے بھرپور نذرانۂ عقیدت ہے۔ کتاب میں نہ مولانا مرحوم کے سوانح حیات کی جزئیات کا ذکر ہے اور نہ ان کی تمام علمی سرگرمیوں کا تحقیقی جائزہ لینے کا

التزام کیا گیا ہے: کیوں کہ مصنف کا مقصد یہ تھا ہی نہیں، البتہ مولانا مرحوم کی وفات سے ان کے تلامذہ کے وسیع حلقے میں جو غم ناک فضا بنی، جس درد و کرب سے ان کے دل و دماغ متاثر ہوئے، اسی فضا اور اسی کیفیت کا بھر پور اظہار کیا گیا ہے، مولانا مرحوم کے اندازِ تعلیم و تربیت کی اچھی عکاسی کی گئی ہے، ان کے طریقہ تدریس، جس نے بہت جلد طلبہ میں ذہنی و فکری انقلاب برپا کر دیا، اس کی بہترین منظر کشی کی گئی ہے، کہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جو خوب صورت بھی ہے اور دل کش بھی۔ کہیں کہیں بالکل شاعرانہ انداز ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے کتاب میں دل کشی بڑھ گئی ہے۔ مصنف اصلا جدید عربی ادب وصحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے عربی رسالہ الداعی کے مدیر ہیں۔ کتاب بہت خوب صورت، دیدہ زیب، دل چسپ، زبان و بیان کے لحاظ سے دل کش ہے۔ ظاہری و باطنی دونوں طرح کی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہر باذوق شخص سے اس کے مطالعے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔

''وہ کوہ کن کی بات'' ایک اہم اور دستاویزی کتاب ہے

پروفیسر ابوالکلام قاسمی
شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ۱۴/۱۰/۱۹۹۵ء

برادرم حضرت مولانا نور عالم صاحب!

سلام مسنون۔ آپ کی ارسال کردہ کتاب مل گئی تھی۔ جواب میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ میں پوری کتاب پڑھنے کے بعد اس پر اپنی رائے لکھنا چاہتا تھا۔

''وہ کوہ کن کی بات'' ایک اہم اور دستاویزی کتاب ہے۔ اس میں مولانا وحید الزماں مرحوم کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کا احاطہ بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ آپ کی زبان اور اسلوب بیان قابل تعریف ہیں۔ مافی الضمیر کے ادا کرنے کی جو قدرت آپ کو خدائے تعالیٰ نے عطا کی ہے، اس کا بھر پور استعمال ہونا چاہیے...

آپ کی کتاب نے مجھے متاثر ہی نہیں، مرعوب بھی کیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

کتاب میں محبت و عقیدت کی تراوش بھی ہے اور ادب وانشا کی حلاوت بھی

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، ایڈیٹر ''احوال و آثار''
''مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ مظفر نگر، یوپی، ۹/۶/۱۴۱۶ھ — ۳/۱۱/۱۹۹۵ء

وہ کوہ کن کی بات'' تالیف مولانا نور عالم خلیل امینی۔

حالیہ چند برسوں میں، علمائے دیوبند کے مرتب تذکروں کی قطار میں ایک نیا اور مفید اضافہ ہے، جو اپنے طرز تحریر کی وجہ سے (کم از کم دیوبند میں مرتب و مطبوعہ تذکروں کے درمیان) منفرد اور نرالی کتاب ہے۔

یہ کتاب، نہ بہ ظاہر سوانح ہے، نہ مرتب تذکرہ، نہ قصیدہ ہے، نہ ہی خالی پھیکا نذرانۂ عقیدت؛ بل کہ

معلومات، مشاہدات، تاثر ومحبت اور خراجِ تحسین کا ایک ایسا ملا جلا مجموعہ ہے، جس میں سوانح وتذکرہ کا لطف بھی ہے، محبت کی چاشنی بھی ہے، عقیدت کی تراوش بھی ہے اور ادب وانشا کی حلاوت بھی۔

اس کے ذریعے ایک بلند پایہ صاحبِ کمال استاذ ومربی (مولانا وحید الزماں کیرانوی) کی حسن تربیت اور بلند آگہی کا بھی علم ہوتا ہے، جنھوں نے متعدد؛ بل کہ درجنوں قابل قدر شاگرد اور عمدہ تصنیفات و لغات یادگار چھوڑیں اور ان کے شاگرد کی نظر میں فاضل استاذ کی جو قدر ومنزلت تھی، اس کا بھی اس کتاب سے بہ خوبی احساس ہوتا ہے اور ایک شاگرد کی سعادت مندی اور قدر دانی ہی تو ہے کہ انھوں نے استاذ مرحوم کو ایسا خوب صورت نذرانۂ عقیدت وتشکر پیش کیا۔

خدا کرے یہ زیادہ سے زیادہ مفید اور مقبول ہو اور تذکروں اور سوانحات کے نئے مصنفوں کے لیے، نئے اسلوب، نئے آہنگ کی تمہید ثابت ہو، آمین۔ بلاشبہ تالیف کے لیے مؤلف لائق مبارک باد ہیں۔ فقط

کتاب، صاحب کتاب کے لیے الجزاء من جنس العمل کی بشارت ہے

مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، مدیر البعث الاسلامی، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۴۱۶/۵/۱۲ھ = ۸/۱۰/اکتوبر ۱۹۹۵ء

محب گرامی منزلت جناب مولانا نور عالم صاحب امینی زاد مجدہ

مدیر الداعی دار العلوم دیو بند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی!

''وہ کوہ کن کی بات...'' کا گراں قدر تحفہ باعث مسرت ہوا، کتاب کی ظاہری اور باطنی خوب صورتی سے، قلب وذہن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ نے اپنے محسن ومربی اور استاذ عالی مرتبت کی جس طرح تصویر کشی کی ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے، جزاکم اللہ خیرا کثیراً۔ اس عصر میں جب کہ طالب علم اپنے محسن اساتذہ اور ان کی خصوصی شفقت کے زیر سایہ پلنے بڑھنے اور ''کچھ'' ہونے کے بعد، صاف انکار کر دیتے ہیں کہ وہ کسی کے مرہون منت ہیں، آپ جیسے فاضل، صاحبِ بصیرت عالم وادیب کا اپنے استاذ گرامی مرحوم کا، اس فراخ دلی سے اعتراف کرنا، کم از کم آپ کی احسان شناسی اور عالی ظرفی کی روشن دلیل ہے اور آپ کے لیے ''الجزاء من جنس العمل'' کی بشارت ہے۔

خدا کرے یہ کتاب مدارس اسلامیہ کے طلبہ کے لیے دلیل کا کام دے...

بلاشبہ یہ بے مثال کتاب ہے

ڈاکٹر محمد ظہور الحق، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترم المقام جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی تازہ تصنیف ''وہ کوہ کن کی بات'' ہر طرح کی ظاہری ومعنوی خوبیوں سے مرصع ہے۔ میں نے کتاب کا ابھی جزوی مطالعہ کیا ہے، موضوع کے ساتھ نام ہی، اس کا کچھ ایسا منفرد ہے، جو پڑھنے کا شوق پیدا کردے۔ بلاشبہ یہ ایک بے مثال کتاب ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ کے بارے میں مجھے بہت سی ایسی باتوں کا علم ہوا، جن کا دوسری جگہ ملنا مشکل ہے۔ ویسے تو کتاب کا ہر حصہ مولانا کی صفات حمیدہ، حوصلے کی بلندی اور عزم کی پختگی کا غماز ہے، مگر خاص طور دارالعلوم کے پرآشوب دور میں تعلیمی وتدریسی فیض کو جاری رکھنے کا کارنامہ، مولانا جیسی ہی شخصیت کا اہم حصہ تھا۔ یہ کتاب خاص طور پر ان لوگوں کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے، جو مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہوں۔

آپ کی گوناگوں مشغولیت سے واقف ہوں، پھر بھی اتنی جامع اور پرازمعلومات کتاب بہت کم وقت میں لکھ دینا، آپ کی غیر معمولی تصنیفی صلاحیت اور استاذ کی حق شناسی کا مظہر ہے۔

باقی الحمدللہ سب خیریت ہے۔ دعوات صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں گے۔

☆ ☆ ☆

امید ہے کہ یہ کتاب ہمارے بے نظیر ذخائر کتب میں وقیع تر ثابت ہوگی

جناب محمد ضیاء الدین انصاری، ڈپٹی لائبریرین، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲ر ستمبر ۱۹۹۵ء

محترم ومکرم جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب، دارالعلوم دیوبند

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی نور اللہ مرقدہ کے سوانح اور علمی وادبی کارناموں پر آپ کی تازہ ترین تصنیف ''وہ کوہ کن کی بات'' کے دو نسخے لائبریری کے لیے، بہ طور عطیہ ملے، جس کے لیے ہم آپ کے انتہائی ممنون ومتشکر ہیں۔

مولانا کیرانوی متنوع اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا علمی تبحر، زہد وورع، جدید عربی زبان پر مہارت، انتظامی صلاحیت، اپنی پرکشش شخصیت اور پرمغز وپرلطف اور عالمانہ گفتگو سے محفل کو کشت زعفران بنانے کی خداداد صلاحیت: ان تمام اوصاف میں وہ یکتا ویگانہ تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں آپ کی خدمات آب زر سے تحریر کیے جانے کے قابل ہیں۔ آپ نے ان کے سوانح قلم بند فرماکر، وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر عظیم دے گا۔

مجھے توقع ہے کہ ہمارے بے نظیر وبے عدیل ذخائر کتب میں آپ کی یہ تالیف، انتہائی وقیع اضافے کی حیثیت رکھے گی اور زیادہ سے زیادہ طالبانِ علم، اس سے مستفیض ومستفید ہوں گے۔

کتاب ہر اعتبار سے معیاری اور لاجواب ہے

مولانا اسعد اعظمی قاسمی، مدیر ''ترجمان دار العلوم جدید''نئی دہلی

مخدوم گرامی حضرت الاستاذ جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب زیدت معالیکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کتاب ہر اعتبار سے بے حد معیاری، لاجواب اور مصنف کتاب کے اعلیٰ اور نفیس ذوق کی آئینہ دار ہے۔ ٹائٹل اتنا دیدہ زیب ہے کہ بہتوں کی آنکھیں خیرہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مختلف شخصیات پر آپ کے لطیف اور ماہرانہ حواشی اور تبصروں نے کتاب کو بہت دل چسپ بنا دیا ہے۔

ابھی سرسری مطالعہ ہی کا موقع مل پایا ہے، پھر بھی مجھے ذاتی طور پر بہت سی نئی باتوں کا علم ہوا۔ کتاب کی زبان اور اسلوب اتنا اچھا اور معیاری ہے کہ جو لوگ آپ کی اردو سے واقف نہیں، انھیں بہت زیادہ حیرت ہوگی اور بہتوں کو رشک بھی کہ آپ عربی کے ساتھ اردو بھی اتنی اچھی کیوں لکھ لیتے ہیں۔ میری حقیر رائے میں آپ کو کبھی کبھی اردو میں بھی پڑھتے لکھتے رہنا چاہیے۔ گرچہ تدریس اور الداعی کی مصروفیتوں کے ساتھ وقت ملنا ذرا مشکل ہوگا۔

کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادبیات پر مصنف کی نظر خاصی گہری ہے

تبصرہ ''بادبان جدید'' دہلی، اکتوبر ۱۹۹۵ء

مولانا وحید الزماں کیرانوی کی سحر انگیز شخصیت، ان کے علمی تبحر اور دار العلوم دیوبند، نیز عربی ادب کی ان کی خاموش خدمت کے تعارف کے لیے، یوں تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ اس احساس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا نور عالم خلیل امینی نے اپنے طور پر ''وہ کوہ کن کی بات'' کے ذریعے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ لائق تحسین بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

''وہ کوہ کن کی بات'' اس کا عنوان ہے، یا کہیے کتاب کا نام ہے، جسے واوین میں دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے تین نقطے بھی دکھائے گئے ہیں، جو اپنے اندر معانی ومفاہیم کی ایک پوری دنیا سمیٹے ہوئے ہیں اور اس بات کی طرف بہت ہی بلیغ انداز میں اشارہ بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ جس عظیم شخصیت کو کتاب کا موضوع بنایا گیا ہے، وہ اپنے دائرے میں بے ستون وکوہ کن کی ولولہ انگیز داستان نئے انداز میں دہراتی رہی ہے۔

مولانا نور عالم، مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کتاب کے عنوان کے ذریعے، جو تاثر دینے کی کوشش کی ہے، اسے وہ آخری صفحے تک برقرار رکھنے میں کام یاب رہے ہیں۔ یہ کتاب دوسری چیزوں کے علاوہ اس بات کی بھی مظہر ہے کہ مولانا نور عالم میں لکھنے سمجھنے اور سمجھانے کی اچھی صلاحیت ہے اور جس طرح

انھوں نے مختلف عنوانات کا انتخاب کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو ادبیات پر ان کی خاصی گہری نظر ہے اور انھوں نے نئے ادب کا مطالعہ خصوصی توجہ اور دل چسپی سے کیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ عنوانات کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے مثلاً ''جمع کررہا ہوں جگرِ لخت لخت کو'' ''خاکِ عجم میں زبان عربی کی شادابی'' ''دل کی دھڑکنیں سننے والا مربی'' ''طلبہ کے دلوں میں دارالعلوم کے تئیں افروزی آتش عشق کی ایک مثال'' ''کیمپ دارالعلوم اور مولانا کے کارہائے شیشہ و آہن'' ''دارالعلوم سے رسمی تعلق کا اختتام اور قلبی تعلق کا دوام'' ''ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے۔''

یہ ایک اچھی علامت ہے کہ ہمارے طبقۂ علما اور اس سے وابستگی رکھنے والے طالبانِ کمال میں ادبیت کی طرف رجحان بڑھا ہے۔

مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی کی سوانح مرتب کرنے میں اور ان کی سیرت اور شخصیت کا معروضی اور موضوعی مطالعہ کرنے میں، یہ کتاب ہمارے لیے راستے کا چراغ بن سکتی ہے۔

ہم ایسے دور افتادگان کے لیے یہ خاص طور پر توجہ اور تحسین کے لائق بات ہے کہ مولانا وحید الزماں جیسی شخصیت کے بارے میں، ایک اچھی کتاب ترتیب دی گئی اور اس میں ان ضروری کوائف کو جمع کردیا گیا، جن کے آئینہ خانے میں، ہم مولانا اور ان کے دوستوں، ساتھیوں اور طالب علموں کی ایک چلتی پھرتی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ان متحرک نقوش سے وہ زندگی بھی سامنے آتی ہے، جو ہمارے ان علمی اداروں میں گزاری جارہی ہے، جن کو ہم اپنے دینی مدارس کہتے ہیں۔

مولانا نور عالم نے اس بات پر زور دیا ہے اور مولانا وحید الزماں کے حوالے سے، اس بات کو دہرایا ہے کہ ہمارے یہ مدارس صرف تعلیم گاہیں ہی نہیں ہیں؛ بل کہ تربیت گاہیں بھی ہیں، جن میں قلب و نظر کو ایک خاص انداز میں صیقل کیا جاتا ہے۔ ایسا ہے بھی اور ہونا بھی چاہیے۔

مولانا نور عالم نے آخر میں کوئی ببلوگرافی (کتابیات) تو نہیں دی، لیکن اشاریہ شامل کرکے یہ بہ ہر حال بتا اور جتادیا کہ کتابوں کی دنیا میں جو نو بہ نو انقلابات آرہے ہیں، ان سے وہ غافل نہیں ہیں۔ انھوں نے جو کچھ شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شخصیات کے تعارف میں نور عالم صاحب کا قلم کس طرح گل کترتا ہوا گزرتا ہے۔

زبان بہ حیثیت مجموعی سادہ، سلیس ہے اور اس میں علمی ذوق اور ادبی شوق کی پرچھائیاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی اس لائق ہے کہ اسے توجہ سے پڑھا جائے۔ مولانا مرحوم کی ہشت پہلو، ہمہ گیر اور ایثار پیشہ شخصیت اس لائق ہے کہ، اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روشناس کرایا جائے، تاکہ وہ جذبۂ بے پناہ، جس نے مولانا ممدوح کو زندگی کے آخری لمحے تک متحرک اور مضطرب رکھا، وہ عام ہو اور چراغ سے چراغ اس طرح روشن ہوتے چلے جائیں، کہ نامساعد حالات اور بے حسی کی تند و تیز آندھیاں، ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پانے لگیں۔

مولانا نور عالم نے، اس سلسلے کا بہت ہی خوب صورت اور بھرپور انداز میں آغاز کیا ہے، اسے مزید

آگے بڑھایا جانا چاہیے۔

مولانا کے متعلق جو بھی کام ہوگا اس کے لیے یہ کتاب منزل کا پتھر ثابت ہوگی

تبصرہ "نئی دنیا" نئی دہلی، ۲۶ر ستمبر تا ۲/۱ر اکتوبر ۱۹۹۵ء، تبصرہ نگار: ایم ودود ساجد

ادارۂ علم و ادب دیوبند (یوپی) نے استاذ ادب عربی و مدیر الداعی مولانا نور عالم خلیل امینی کی تالیف "وہ کوہ کن کی بات" شائع کی ہے۔ پونے دو سو کے قریب صفحات پر مشتمل یہ تالیف جتنی خوب صورو دیدہ زیب باہر سے ہے، اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اندر سے ہے۔ دراصل یہ تصنیف حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کی ہمہ جہت اور لازوال خوبیوں کا مرقع اور ان کی حیات کے چیدہ چیدہ گوشوں پر مبنی، ایک ایسی دستاویز ہے، جو صدیوں زندہ و تابندہ رہے گی اور طالبان علوم دین نسل در نسل اس سے استفادہ کریں گے۔ حالاں کہ یہ کتاب مولانا مرحوم کی کوئی باضابطہ سوانح نہیں ہے؛ لیکن پڑھنے والے خود محسوس کریں گے کہ انھوں نے مولانا مرحوم کی ذات سے وابستہ معلومات کا ایک وافر خزانہ پالیا ہے۔ مولانا نور عالم خلیل امینی عربی کے ہی نہیں، اردو ادب کے بھی جید عالم ہیں۔ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں اپنی اور مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے وابستہ ساٹھ سے زیادہ موضوعات پر تفصیل سے لکھا ہے اور مولانا کی رحلت کے بعد جتنی جلد یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے، وہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ مولانا وحید الزماں کیرانوی جیسی شخصیت بھلے ہی ہمیں نصیب نہ ہوں، مگر ان کی آغوش تربیت سے نکلنے والے موتی چہار جانب بکھرے پڑے ہیں، جو مولانا مرحوم کی جاں سوز محنتوں کا حق ادا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کتاب میں مولانا کے طرز تکلم، طرز تدریس، طرز مخاطبت اور طرز تربیت کے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا سے متعلق ابھی بہت کام ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہوگا؛ مگر "وہ کوہ کن کی بات" ان سب کے لیے منزل کا پتھر ثابت ہوگی۔ کتاب کی قیمت ۸۰ روپیہ ہے اور دیوبند کے علاوہ دہلی میں بھی دست یاب ہے۔

یہ کتاب مولانا کے کارہائے نمایاں کا احاطہ کرتی ہے

تبصرہ ہفت روزہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی، ۱۱ تا ۱۷ر ستمبر ۱۹۹۵ء

زیر تبصرہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ و ناظم تعلیمات و معاون مہتمم مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی مرحوم کے حالات و واقعات اور زندگی کے مختلف میدانوں میں، ان کے کارہائے نمایاں کا احاطہ کرتی ہے۔ دراصل یہ مولانا نور عالم خلیل امینی کے تاثراتی مضامین ہیں، جو مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مصنف نے مولانا مرحوم سے متعلق واقعات بیان کرتے ہوئے اشعار کا بھی سہارا لیا ہے، زبان و بیان میں ادب کی چاشنی اور فکر و احساس کی روشنی جا بہ جا بکھری ہوئی ہے۔

مثلاً مصنف اپنے تعلقات اور مولانا وحید الزماں مرحوم کی شفقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں "جب

بھی جی نہ لگتا، تو مولانا کے پاس جاتا اور تخمِ عمل اور نخلِ فکر و نظر کے لیے ہمیشہ ساز گار آب و ہوا کی ایک بڑی قسط لے کر واپس آتا۔ ناامید جاتا اور دل کے لالۂ افسردہ کو آتش قبا کر کے واپس آتا، کوئی خوشی ہو یا غم، ان سے ضرور ملتا: کیوں کہ وہ خوشی کو دوبالا اور غم کے لیے زود اثر مرہم ہم دست کر دیتے'' اس کتاب میں مولانا وحید الزماں مرحوم کے طریقۂ تدریس، مقناطیسی شخصیت، سلیقہ مندی، عربی خطابت، دوسروں تک اپنے علم و ہنر کو منتقل کرنے کی بے نظیر صلاحیت، عربی زبان کے ساتھ مولانا کی عقیدت و محبت، مولانا کی اعلان نویسی کے بے مثال فن کو نہایت دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور مصنف نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے منطقی دلائل، ٹھوس ثبوت اور کتابوں، تقریروں وغیرہ کے حوالے بھی دیے ہیں۔ یہی نہیں کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہیں اور سرورق کافی دل کش ہے۔

توقع ہے کہ اردو داں حلقوں بالخصوص مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کے دوستوں، شاگردوں اور عقیدت مندوں میں، اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کی جائے گی۔

یہ کتاب ایک تحفہ ہے

ضمیمہ قومی آواز، ۱۵/۱۰/اکتوبر ۱۹۹۵ء، تبصرہ: رحمت اللہ فاروقی

ازہر ہند دارالعلوم دیوبند نے اپنے دامن میں ہزاروں طلبہ کو تربیت دے کر، آسمان علم و ادب کا درخشاں ستارہ بنایا ہے۔ ان ہی اساطین علم و ادب میں دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ و معاون مہتمم مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کا نام شامل ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان کے حالات و واقعات، نوجوانوں کی موجودہ نسل پر ان کے اثرات و احسانات اور زندگی کے مختلف میدانوں میں ان کے تابندہ کارناموں کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف مولانا مرحوم کے خاص تربیت دادہ اور عربی و اردو کے استاذ و صحافی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد گزشتہ تین دہائیوں کے دوران دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان و ادب، خاص طور پر جدید عربی اسلوب سے طلبہ کو روشناس کرانے کے سلسلے میں، مولانا کیرانوی مرحوم کی مساعی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ضمنی طور پر بہت سے دوسرے فضلائے دارالعلوم (جن میں اکثریت مولانا مرحوم کے شاگردوں کی ہے) کا ذکر بھی آ گیا ہے، جو بہ ذات خود ایک تاریخی چیز ہے۔ مولانا کیرانوی کی گوناگوں شخصیت کا احاطہ کرنے والی یہ کتاب، طلبہ، مدارس عربیہ اور جدید عربی ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔

یہ کتاب مولانا کیرانوی کے حالات و واقعات کا مرقع ہے

تبصرہ ہفت روزہ ''بلٹز'' اردو بمبئی، جلد: ۲۳، شمارہ ۳۹، ۳۰ ستمبر ۱۹۹۵ء، تبصرہ نگار: شمیم طارق

دارالعلوم دیوبند میں عربی کے استاذ اور عربی رسالہ الداعی کے مدیر مولانا نور عالم خلیل امینی کی قابل

قدر تصنیف ''وہ کوہ کن کی بات'' عربی زبان وادب کے جید عالم، القاموس الاصطلاحی (اردو عربی اور عربی اردو) جیسی نایاب ڈکشنری کے مرتب اور کئی علمی تحقیقی کتابوں کے مصنف، صاحبِ تاثیر معلم و مربی، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے حالات و وقعات، نئی نسل پر ان کے احسانات و اثرات اور ان کے زندہ و پائندہ کارناموں کا جامع مرقع ہے۔

مصنف نے حرف اول میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ''جو انسان جس درجے کا ہوتا ہے، اسی درجے قدر دانوں کی مدح سرائی کا مستحق اور ناقدین کی عیب جوئی کا ہدف بنتا ہے؛ لیکن حضرت مولانا کے متعلق میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ مولانا ان نادرہ روزگار شخصیتوں میں تھے، جن کی تخلیقی قوت اور تربیتی صنعت گری کا معتبر و مثبت نتیجہ مخالف و موافق، دونوں طرح کی آب و ہوا میں خوش آیند طور پر سامنے آیا۔''

یہ کتاب ہر اعتبار سے لائق مطالعہ ہے۔ اس کو پڑھنے سے ان کی ایک اور خوبی کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا نے مولانا نور عالم خلیل امینی جیسے شاگرد بھی چھوڑے ہیں، ان کا یہی ایک کارنامہ جوانوں کی فکر و نظر کو وسعت صحرا دینے کی، ان کی بے پناہ صلاحیت کا مظہر ہے۔

کتاب کا اسلوب بیان، صاحب سوانح کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے

ماہنامہ طلسماتی دنیا، دیوبند، تبصرہ: ایم احمد قاسمی، نومبر، دسمبر ۱۹۹۵ء

مایہ ناز علمی شخصیت حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کے سانحہ ارتحال پر مولانا مرحوم کے شاگرد رشید، عربی زبان وادب کے مسلّم ادیب، مولانا نور عالم خلیل الامینی کے قلم اعجاز رقم کی وساطت سے، مرحوم کی کثیر الجہات شخصیت پر لکھی گئی کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' کی تمام علمی، ادبی حلقوں، نیز مولانا مرحوم کے تمام واقفین و معترفین میں شہرت انگیز پذیرائی ہوئی ہے۔

اتنی سادہ و سلیس اردو نثر میں اس قدر بھرپور طریقے پر، مولانا مرحوم کی ہمہ جہت صفات سے متصف شخصیت پر روشنی ڈالنا اور گہرا نقش ذہن پر مرتسم کر دینا مولانا نور عالم خلیل الامینی کی ہی قلم کاری اور فن کاری کا کرشمہ ہے۔ مصنف کا انداز تحریر نہایت ہی دل کش اور دل آویز ہے۔ زبان میں حالی کی سادگی، نذیر احمد کی برجستگی اور علامہ شبلی کی ایجاز بیانی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، جو ان کے اعلیٰ درجے کے ادبی شعور اور مختصر الفاظ میں جامع بات کہنے کے ہنر کی غماز ہیں۔ کتاب کی جادو بیانی اور رسیلا پن کا کوئی بھی ادبی مذاق رکھنے والا شخص، اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی برجستہ تحریر اسی بات کی مؤید ہے کہ مصنف نے عبارت کو عبارت آرائی کے لیے نہیں؛ بل کہ اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ صاحب کتاب کے زود نویسی کے تعلق سے، شاید یہ کہنا بہت حد تک درست ہو کہ انھوں نے اس کیے پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے کہ عمدہ اور بہتر لکھنے والوں کی تخلیقی رفتار سست ہوتی ہے۔

مذکورہ کتاب ایک سوانحی تحریر ہونے کے ساتھ ساتھ، ادبی فن پارہ بھی ہے، جس میں مصنف کی

شخصیت جھلک رہی ہے۔ کتاب مختصر ہونے کے باوجود، جامع مکمل اور بھرپور ہے یہ مرحوم کی ایک بولتی تصویر ہے، جو ہمارے احساسات کو برانگیختہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ مصنف نے مولانا مرحوم کی زندگی کے نہایت نازک ولطیف پہلوؤں پر، جس انداز سے روشنی ڈالی ہے، یہ صرف اسی شخص کے لیے ممکن ہے جو مولانا مرحوم کو قریب سے جانتا ہو، ان کو برتا ہو اور ان کے اندرونی خیالات وزندگی سے بہ خوبی واقف ہو۔ مصنف کے لیے سوانح نویسی اور خاکہ نگاری کی فنی نزاکتوں پر پوری دست گاہ اور مرحوم کی شخصیت کی پوری بصیرت کی وجہ سے ہی، ممکن ہو سکا کہ ایک ایسی کتاب وجود میں آ گئی، جس میں ندرت، تازگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ، ایسا اسلوب بیان بھی ہے، جو شخصیت کے ساتھ پورا میل کھاتا ہے اور ایسا ایجاز بھی، جو مرحوم کے تمام گوشہ ہائے حیات پر محیط ہے۔ کتاب جانب داری اور ایسی بے جا عقیدت مندی، جس سے شخصیت مجروح ہوتی ہو، یک سر پاک ہے، مصنف نے سوانح نویسی کے دشوار گزار مراحل میں، جن میں ہر وقت اس کا خطرہ یا امکان خطرہ بنا رہتا ہے کہ سوانح کہیں" شے دیگر نہ بن جائے" میں اپنی فن کارانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ ایک امر حقیقت ہے کہ اس کتاب کی قلمی تصویریں چلتی پھرتی اور ہنستی بولتی معلوم ہوتی ہے۔

کتاب نہایت جامع، سبق آموز اور حوصلہ افزا ہے

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

سربراہ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، دھولیہ، مہاراشٹر، ورکن شوریٰ دار العلوم دیوبند

جب قدرت الٰہی کو اپنے کسی بندے سے کوئی غیر معمولی، انقلاب آفریں کام لینا منظور ہوتا ہے، تو اسے گوناگوں صلاحیتوں سے پوری فیاضی کے ساتھ نوازا جاتا ہے، تاکہ زندگی کے مختلف میدانوں میں وہ تابندہ کارہائے نمایاں انجام دے سکے۔ مولانا وحید الزماں رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی مخصوص ومنتخب بندوں میں سے تھے۔ مولانا مرحوم میں بہت سی خوبیاں بہ یک وقت جمع تھیں، گویا وہ ایک مشین تھے، ہمہ وقت مصروف عمل۔ انھوں نے ہر نرم وگرم ماحول، ہر ناسازگار فضا اور ہر مخالف طوفان کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا؛ مگر اپنے مشن کے احیا میں ادنی سستی کو پاس نہ آنے دیا۔ انھوں نے اصلاحی وتربیتی، تعلیمی، وتدریسی ایسے میں ایسے محیر العقول اور پرتاثیر طریقے اختیار کیے، جو سوفی صد کام یاب ثابت ہوئے۔ آج کے مادہ پرستانہ دور اور شر انگیز دور میں اصلاح وتزکیہ کے فرائض کو بہ حسن وخوبی انجام دینا، کوہ کنی سے بھی دشوار تر ہے؛ مگر اللہ تعالیٰ نے بہ ظاہر تو انسان کو تمام مخلوق سے کم زور بنایا ہے؛ مگر حقیقت میں عزم وہمت، ارادہ وحوصلے کی ایسی طاقت وقوت بخشی ہے، جس کے آگے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

ضعف ہمت ہے : ورنہ اے ناداں !
ابن آدم سے کیا نہیں ہوتا

مولانا مرحوم عجیب وغریب انسان تھے۔ واقعی وہ کوہ کندیدن وجوئے شیر آوردن کا مصداق تھے۔

ضرورت تھی کہ جن لوگوں نے مولانا مرحوم کو قریب سے نہیں دیکھا اور ان کے نوع بہ نوع کمالات کا مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ان کو مولانا کی متنوع زندگی کی جھلک دکھائی جائے،شاید کچھار کا سویا ہوا شیر جاگ اٹھے۔اللہ تعالیٰ ہمارے دوست مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کو جزائے خیر مرحمت فرمائے کہ انھوں نے بروقت اس ضرورت کو محسوس کیا اور مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف گوشوں اور تعلیم وتربیت کی پرپیچ وادیوں میں،ان کے تابندہ نشانات اور پائندہ کارناموں کی جھلک کتابی صورت میں پیش کی ہے،جو مختصر سہی،مگر نہایت جامع،سبق آموز،حوصلہ افزا ہے اور ساتھ ہی ساتھ زبان وادب کی مٹھاس اور دلچسپی سے بھرپور معمور بھی ہے۔ کسی مصنف کا کمال،عبارت کی طوالت اور الفاظ کی کثرت میں نہیں ہے:بل کہ مختصر عبارت میں مقصد کو واضح کردینا ہے۔

مصنف کتاب امینی صاحب کے اس کمال کا اعتراف نہ کرنا حقیقت شناسی سے گریز ہوگا۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

اس کتاب میں مولانا کیرانوی کا دل نشیں انداز میں تعارف ہے

تبصرہ ''بحث ونظر'' پھلواری شریف،پٹنہ،شمارہ ۳۱،جلد ۹،جمادی الاولیٰ-رجب ۱۴۱۶ھ

زیر تبصرہ کتاب مولانا نور عالم خلیل امینی مدظلہ استاذ دارالعلوم دیوبند و مدیر ''الداعی'' کی تصنیف ہے،جو مولانا موصوف نے اپنے شفیق استاذ اور عربی زبان کے بلند پایہ ماہر و ادیب حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے بارے میں تحریر فرمائی ہے۔ یہ اشک ہائے غم ہیں،جو ان کی آنکھوں سے ٹپکے ہیں اور آنسوؤں کے وہ قطرے ہیں جن کو انھوں نے اپنے دامن میں سمیٹنے کے بجائے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔افراد سازی مولانا مرحوم کا طرۂ امتیاز تھا،مصنف اس خصوصیت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''لیکن حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب کی ذات وصفات نے اس کے فکر و نظر کو صیقل اور عقل وخرد کو،جس طرح روشن وتابناک بنادیا،اُس کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہم ایسے لوگ جو کچھ ہیں،جہاں ہیں اور جس طرح ہیں،خدا کی حکمت وتوفیق کے طفیل مولانا کی صنعت گری کی دین اور ان کے علم وآگہی کی دریوزہ جام ہیں۔''

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کی شخصیت ''اپنی ذات سے انجمن تھی''انھوں نے عربی زبان و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دی ہیں،مولانا نور عالم امینی نے اپنی اس کتاب میں مولانا کی جامع شخصیت کا تعارف جس دل نشیں انداز میں کرایا ہے،وہ قابل قدر ہے۔حضرت کیرانوی کی ہمہ گیر بلند وبالا شخصیت کے متعلق مصنف نے مختصر سی مدت میں اپنے تاثرات کو ایک کتاب کی شکل دیدی ہے،یہ ان کے حضرت کیرانوی سے خصوصی تعلق،غایت محبت واخلاص کی دلیل ہے۔اللہ تعالیٰ قبول فرماکر فلاح دارین کا ذریعہ بنائے، آمین۔یہ کام حضرت کیرانوی کے تلمیذ رشید مولانا نور عالم خلیل امینی ہی کرسکتے تھے اور مولانا موصوف نے یہ

کام کر کے وابستگانِ کیرانوی پر احسان کیا ہے۔ یہ اظہار عقیدت و محبت بھی ہے اور بہترین خراج عقیدت بھی۔ یوں تو مولانا کیرانوی کی صلاحیتیں گوناگوں تھیں، ان کی ذات والاصفات بڑی پہلو دار تھی اور مولانا نے عربی و اردو زبان کی قاموس مرتب فرما کر عربی و اردو زبان کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ مولانا کیرانوی کا سب سے اہم کارنامہ دارالعلوم دیوبند کی ''النادی العربی'' کے ذریعے افراد سازی ہے، انھوں نے اس کے ذریعے طلبہ میں عربی ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ مولانا کیرانوی نے ذہین تلامذہ کو نخل آرزو قرار دے کر ان کو سال ہا سال جہد و مشقت کی بھٹی میں تپا کر کندن خالص بنا دیا۔ ماضی قریب میں مولانا کیرانوی کو قدرت نے خصوصی طور پر افراد سازی کا وصف عطا فرمایا تھا، وہ نہ صرف اپنے تلامذہ کے حق میں ''معلم کتاب'' تھے: بل کہ ایک مشفق باپ اور مخلص مربی کی طرح اپنے تلامذہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے اخلاق و عادات کے سنوارنے کی پوری کوشش کرتے، بسا اوقات نادار طلبہ کی پوشیدہ طور پر مالی کفالت بھی کرتے۔

انھوں نے نئی نسل کے جن نوجوانوں کو عربی ادب کے تعلق سے تیار کیا اور جن میں عربی زبان و ادب کا صحیح مذاق پیدا کیا، ان کی فہرست طویل ہے، خود مصنف مولانا نور عالم خلیل امینی اس وقت عربی کے ادیب شہیر ہیں اور ان کی تحریر عالم عرب میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے اور ان کے مشہور کالم ''اشراق'' کا مجموعہ بھی قاہرہ، مصر سے زیور طبع سے آراستہ ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔

مولانا کیرانوی میں جہاں افراد سازی کی بے پناہ صلاحیتیں تھی اور جن سے کما حقہ انھوں نے فائدہ بھی اٹھایا، وہیں مولانا میں تنظیمی و قائدانہ صلاحیتیں بھی بہ درجۂ اتم موجود تھیں۔

کتاب تاثراتی ہے اور اپنے موضوع کا پورے طور پر احاطہ کرتی ہے۔ حضرت مولانا مبین احمد قاسمی رام پوری نے تعارف میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا معراج الحق صاحب استاذ سابق و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند متوفی ۱۴۱۳ھ مطابق ۱۹۹۱ء اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی کے مشترکہ خادم رہنے کی سعادت حاصل رہی، اس لیے ان کی شائستگی و سلیقہ مندی دو آتشہ ہو گئی تھی۔ اُس وقت تو تیز طرار بھی تھے؛ لیکن اب عالم باوقار و بردبار بن گئے ہیں، اونچا سا عمامہ گھنیری پیچوں والا سر پر ڈال کر، خاصے رعب دار مولانا نظر آتے ہیں۔ ایک بار اسی شکل میں سرزمین پاک مکہ معظمہ میں مدرسہ صولتیہ کے دروازے پر اچانک نظر آ گئے۔ خدا نے خیر کیا کہ میرے اوپر "خر موسیٰ صعقا" کی سی کیفیت طاری ہونے سے قبل ہی انھوں نے از خود مسکرا کر اپنے ''جلال'' کو میرے لیے قابل تحمل بنا دیا۔''

اس کتاب میں مؤلف نے جس جرأت و بے باکی اور حمیت ایمانی کے ساتھ مولانا کیرانوی اور ان کے تلامذہ کا تذکرہ کیا ہے، وہ مولانا امینی کے شایان شان ہے۔

کتاب بہ ہر صورت جاذب نظر و جاذب توجہ ہے، گٹ اپ دیدہ زیب، کتابت و طباعت روشن اور

صاف ہے، کتاب ظاہری ومعنوی: دونوں خوبیوں سے مالامال ہے، اہل علم بالخصوص فضلائے دارالعلوم اسے شوق کے ہاتھوں لیں گے۔

تبصرہ نگار: نسیم احمد قاسمی

یہ کتاب ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے

(مجلہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک، پاکستان، شمارہ: ۴-۵/ جلد: ۳۲ رمضان، شوال ۱۴۱۷ھ)

دارالعلوم دیوبند کے ہر ایک فاضل کو اللہ تعالیٰ نے وہ وہ خصوصیات ودیعت فرمائی ہیں، کہ وہ مستقل تصنیف اور تذکرے کے متقاضی ہیں۔ ان ہی نابغہ روزگار ہستیوں میں ایک شخصیت حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قدس سرہ ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کی ہے۔

آپ کے نام ور اہل قلم اور برصغیر کے مشہور ادیب تلمیذ رشید مولانا نور عالم خلیل امینی مدیر الداعی (عربی) دارالعلوم دیوبند نے آپ کی وفات کے بعد ایک انوکھے انداز میں آپ کی خصوصیات تحریر فرمائی ہیں، جن میں آپ کی شخصیت، علمی مقام، طرز تدریس، انوکھا انداز نظامت اور آپ کی شخصیت کے دیگر زاویوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

موصوف نے یہ کتاب ایک غالی عقیدت مند، یا بہ حیثیت ایک شاگرد نہیں لکھی ہے، جس میں بے جا غلو سے کام لیا گیا ہو: بل کہ آپ کی شخصیت کی حقیقی اور واقعاتی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کتاب کے نام سے کتاب کی اہمیت اور اچھوتے پن کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کوہ کن کی بات میں انتہائی اختصار کے ساتھ آپ کی بھرپور شخصیت کی عکاسی گویا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ آپ نے انتہائی سادہ انداز میں مولانا کی تمام زندگی، ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ کتاب ہر مدرسے، ہر طالب علم اور ہر منتظم اور لائبریری کے لیے ضروری ہے: بل کہ نصاب کا ایک حصہ بنانے کے قابل ہے۔ بہ قول حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ (دارالعلوم حقانیہ کے تمام اساتذہ کو چاہیے کہ اس کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کریں) کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بیسیوں فضلا اور ابنائے دارالعلوم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپ کا طرز نگارش انتہائی خوب صورت ہے، اشعار کا برمحل و برموقع استعمال، نکتہ آفرینی وادبی نکات کی چاشنی نے، کتاب کی ثقاہت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ کتاب اتنی معلوماتی اور اتنی دل چسپ ہے کہ ایک ہی نشست میں پڑھ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ہمارے پاس اس کا پہلا ایڈیشن ہے اور مصنف نے اپنے گراں قدر خط میں، کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ایک گراں قدر مقدمے کا تذکرہ کیا ہے۔ الغرض کتاب ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے۔

امینی صاحب نے اس کتاب میں اپنی انشاپردازی کا جادو جگایا ہے

(تبصرہ: ''اخبار مشرق'' کلکتہ، ۱۶ر ستمبر ۱۹۹۶ء، تبصرہ نگار: احسن مفتاحی)

مولانا وحید الزماں کیرانوی ایسی مقناطیسی اور سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے، جو اپنی تعلیم وتربیت سے

ذرے کو آفتاب بنانے کی صلاحیت اور لیاقت رکھتے تھے، جس کا ایک بین ثبوت مولانا نور عالم خلیل امینی ہیں؛ جو مولانا مرحوم کے شاگرد رشید، دارالعلوم دیوبند میں عربی ادب کے استاد اور عالمی شہرت کے حامل عربی کے سحر طراز انشا پرداز اور صحافی ہیں۔ مولانا نور عالم صاحب کے جوہر، عربی زبان و ادب میں نمایاں ہوتے رہے ہیں، عربی میں ان کی استعداد کے معترف، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی بھی ہیں، جنھوں نے اپنی کئی کتابوں کا ترجمہ مولانا نور عالم سے کرایا اور وہ کتابیں عرب دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

مولانا نور عالم خلیل امینی اپنے استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی پر تاثراتی کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' لکھ کر، اردو زبان و ادب کے بھی چھپے رستم ثابت ہوئے۔ کتاب اتنی شگفتہ اور پیاری اردو میں ہے، جسے بار بار پڑھنے کا جی چاہتا ہے اور مولانا نور عالم پر رشک آتا ہے۔ مولانا نور عالم خلیل امینی سے میری صرف ایک ملاقات دارالعلوم دیوبند میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی قیام گاہ پر بڑی پر تکلف چائے پلائی تھی۔ میرے ہم راہ مولانا مفتی محمد سلمان تھے، جنھوں نے میرا تعارف کرایا تھا۔ اس ایک ملاقات میں ہی مولانا نور عالم صاحب میرے دوست بن گئے اور اکثر و بیش تر خط لکھ کر دوستی کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ حسن اخلاق اور مروت یقیناً مولانا وحید الزماں کیرانوی کا فیض ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانوی عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے، جو طبعاً زود رنج تھے اور کسی بات پر ناراض ہوتے، تو لگتا کہ وہ اپنے مخاطب کی جان لے لیں گے؛ مگر وہی مخاطب محبت سے ان کو سلام کرتا، تو وہ پگھل جاتے اور اس کے لیے اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو جاتے۔ یہ حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے حسن اخلاق، جذبہ صادق اور ان کے دیانت دار ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کی دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے ہوتی تھی۔ ان کے دل میں کینہ نہیں تھا اور محبت کے ایک بول پر سارے اختلافات فراموش کر دیتے تھے۔ یہ سنی سنائی بات نہیں؛ بل کہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ مولانا وحید الزماں کیرانوی ایسے مظلوم انسان تھے، جن میں خوبیاں بہت زیادہ تھیں اور کم زوریاں بہت کم تھیں؛ لیکن ان کی خوبیوں کو نظر انداز کر کے ان کی ناقدری کی گئی اور یہ حقیقت فراموش کر دی گئی کہ انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔

مولانا نور عالم خلیل امینی نے اپنے استاذ گرامی مولانا وحید الزماں کیرانوی پر تاثراتی کتاب ''وہ کوہ کن کی بات...'' ایسے دل چسپ اور پیارے انداز میں لکھی ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ایک ماہ میں ختم ہو گیا اور دوسرا ایڈیشن بھی دیکھتے دیکھتے ختم ہو گیا۔ اتنا بڑا اعزاز اردو کی کسی کتاب کو نہیں ملا ہے۔ اب تیسرے ایڈیشن کی تیاری ہے۔ مولانا امینی مولوی ہیں اور مولویوں کی بد سلیقگی مشہور ہے؛ لیکن ان کے ممدوح مولانا وحید الزماں کیرانوی بہت نستعلیق شخصیت کے مالک تھے اور بہت صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے؛ اس لیے ان کے شاگرد رشید مولانا امینی نے صوری اعتبار سے بھی اتنی عمدہ کتاب شائع کی ہے، جسے ترقی یافتہ ملکوں کی کتابوں کے مقابلے میں فخر سے یہ کہ کر پیش کیا جا سکتا ہے، کہ ہم ہندوستانی بھی کتابیں شائع کرنا جانتے ہیں۔

مولانا امینی نے ''وہ کوہ کن کی بات'' میں ایسا دل چسپ، شگفتہ اور پیارا اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ

قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور کتاب کے مطالعے کے دوران وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ مولانا وحید الزماں کیرانوی کی سحر انگیز شخصیت کا جادو تو ہے ہی، مگر اس کا سہرا مولانا امینی کو بھی جاتا ہے، جنھوں نے اپنی انشا پردازی کا جادو جگایا ہے۔ میرے خیال میں اردو میں گزشتہ ۱۰ سال کے اندر کسی شخصیت پر اتنے اعلیٰ معیاری کوئی تاثراتی کتاب منظر عام پر نہیں آئی ہے۔ میرے نزدیک ''وہ کوہ کن کی بات'' ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس کا شمار اردو کے بہترین ادب میں کیا جانا چاہیے۔ ادب کا مطالعہ بہ شرطے کہ وہ صحیح قسم کے ادب کا مطالعہ ہو اور صحیح طریقے سے کیا جائے، مطالعہ کرنے والے کے ذہن کو لطیف اور بیش قیمت مواد سے آراستہ کر دیتا ہے۔ ''وہ کوہ کن کی بات'' کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا۔ ادب کا مطالعہ اور وہ بھی ایسا ادب، جو کسی سربرآوردہ شخصیت پر اپنے تاثرات کا نچوڑ ہو، ہمیں قدر شناسی اور احترام کے جذبے کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس طرح کے مطالعے سے زندگی کے رنگ روپ اور مزاج کے ادراک میں مدد ملتی ہے اور وجدان میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی کا بہ راہ راست تجزیہ، جو ایک فرد واحد حاصل کرتا ہے، وہ بہ ہر طور محدود رہتا ہے۔ زندگی بہت وسیع، بہت زیادہ متنوع اور بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ ہم اپنے مطالعے کے ذریعے دوستوں کے تجربات کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ جو لوگ ہم سے فاصلے پر ہیں، یا ہم سے برسوں پہلے گزر چکے ہیں، مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا سوچتے تھے، کیا محسوس کرتے تھے اور کیا آرزوئیں اور امیدیں رکھتے تھے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ''وہ کوہ کن کی بات'' اس معیار پر مکمل پوری اترتی ہے۔

''وہ کوہ کن کی بات'' پر دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی، ڈاکٹر ظہور الحق اور جناب سید حامد نے اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ ملک کے بہترین جرائد اور اخبارات نے تبصرے شائع کیے ہیں۔ مولانا امینی کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کی کتاب پر تبصرہ کروں، جب کہ ان اکابر کے تبصروں اور تاثرات کی موجودگی میں میری کیا حیثیت ہے۔ مولانا امینی نے خود اپنی کتاب پر جو تبصرہ لکھا ہے اور اس کا پس منظر و پیش منظر بیان کیا ہے، وہ اردو ادب کا شاہ کار اور اتنا معیاری ہے کہ مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

''وہ کوہ کن کی بات...''

مولانا وحید الزماںؒ کو ایک خوب صورت نذرانۂ عقیدت

تبصرہ: ''ترجمان دار العلوم جدید نئی دہلی'' ''مولانا وحید الزماں کیرانوی نمبر''

عصر حاضر کے منفرد معلم و مربی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے سانحۂ ارتحال کے چند ماہ بعد ہی، ان کے ایک نمایاں شاگرد اور دار العلوم دیوبند میں ان کے علمی جانشین مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب نے اپنے

محبوب استاذ کو کتابی شکل میں ایک ایسا دل کش اور خوب صورت ہدیۂ عقیدت پیش کیا کہ ایک تلمیذ رشید کی طرف سے اپنے استاذ کے لیے، اس سے بہتر خراج عقیدت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک معروف اہل قلم نے مولانا نور عالم صاحب کی کتاب "وہ کوہ کن کی بات" پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی دل لگتی بات کہی کہ جو بھی اہل دل اس کتاب کو پڑھے گا، وہ تمنا کرے گا کہ "کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے بھی مل جاتا اور میں مر جاتا۔"

"وہ کوہ کن کی بات" کئی حیثیتوں سے ایک منفرد اور انوکھی کتاب ہے اور یہ اس کی انفرادیت ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک ڈیڑھ ماہ کی مختصر مدت کے دوران، کتاب کا پہلا ایڈیشن نایاب ہو گیا۔ فاضل مصنف نے ارباب ذوق کے شوق بے پناہ کا خیال کرتے ہوئے، بڑی عجلت کے ساتھ کتاب کا دوسرا ایڈیشن مزید آب تاب اور ایک دل چسپ اور طویل مقدمے کے اضافے کے ساتھ شائع کیا اور اس ایڈیشن کو بھی اسی ذوق و شوق اور اتنی ہی تیز رفتاری کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ مصنف محترم ان دنوں اپنی کتاب کے دامن میں پھول اور ستارے ٹانکنے میں مصروف ہیں اور عن قریب، اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کر کے اہل ذوق کی قوت خرید کو ایک بار پھر آزمانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس کتاب کی پہلی انفرادیت اس کا پرکشش اور نرالا عنوان ہے، جو مدارس عربیہ کے روایتی انداز سے مختلف ہونے کی بنا پر دیکھنے والے کی توجہ کو فوری طور پر مبذول کرتا ہے اور ساتھ ہی مولانا وحید الزماں علیہ الرحمۃ پر حرف بہ حرف منطبق بھی ہے۔ طبع دوم کے مقدمے میں مصنف نے کتاب کی وجہ تسمیہ، اتنے دل چسپ ودل آویز انداز میں بیان کی ہے کہ صرف اس مقدمے سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہی اگر دوسرے ایڈیشن کو خریدا جائے تو ہمارے خیال میں کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ کتاب کی طباعت، کتابت، کاغذ اور خصوصاً اس کا سرورق، اتنا پرکشش اور جاذب نظر ہے کہ مدارس کے ماحول میں اس کی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

لیکن کتاب کی اصل انفرادیت اس کے پرمغز و پراثر مندرجات اور اس کے دل نشین و دل پذیر انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب مولانا وحید الزماں کیرانوی مرحوم کے فکر و عمل کے دورانیے کا، اتنی خوب صورتی سے احاطہ کرتی اور ان کے کمالات و خصوصیات کی ایسی مؤثر تصویر کشی کرتی ہے کہ کتاب کا مطالعہ شروع کرنے کے بعد قاری اس میں کھو سا جاتا ہے اور مصنف کی جادو بیانی سے مسحور ہو کر، کتاب کو ختم کیے بغیر نہیں رہتا۔ کتاب کی ہر سطر سے فاضل مصنف کا جوش و جذبہ اور اپنے استاد سے ان کی گہری اور والہانہ عقیدت و محبت چھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

"وہ کوہ کن کی بات" کوئی مکمل اور باضابطہ سوانح عمری نہیں ہے؛ بل کہ (جیسا کہ مصنف نے حرف اول کی ابتدائی سطور ہی میں وضاحت کر دی ہے) مولانا وحید الزماں صاحب کے بارے میں مصنف کے جذبات و تاثرات اور احساسات و مشاہدات اور مدارس عربیہ کی نئی نسل پر ان کے دیرپا اثرات واحسانات کا ایک مرقع ہے: اس لیے مصنف نے بجا طور پر کتاب کو صاحب سوانح کی زندگی کی، ان تفصیلات سے بوجھل نہیں کیا ہے، جو عموماً سوانح عمریوں میں بیان کی جاتی ہیں اور جن سے بسا اوقات قاری کو اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس

میں صرف وہی باتیں شامل ہیں، جو کسی بھی قاری کے لیے قابل توجہ اور سبق آموز ہو سکتی ہیں۔ بنابریں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب میں وہ بہت کچھ ہے، جو ہونا چاہیے اور وہ بالکل نہیں ہے، جو نہیں ہونا چاہیے۔

بہ ہر حال ''وہ کوہ کن کی بات'' ایک بھرپور اور جامع کتاب ہے اور اپنے مقصد میں پوری طرح کام یاب بھی۔ مصنف نے مولانا وحید الزماں صاحب کی ہشت پہلو شخصیت، ان کی تعلیمی و تربیتی و انتظامی انفرادیت، ان کی بیدار مغزی و دیدہ وری، بالغ نظری و روشن دماغی اور عالی ظرفی و حوصلہ مندی کی، اتنی مؤثر منظر کشی کی ہے، کہ مولانا مرحوم اس کتاب کے اوراق میں چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں اور قاری کے دل و دماغ پر ان کی عظمت و عبقریت کا گہرا نقش قائم ہو جاتا ہے۔

مولانا نور عالم امینی صاحب اصلاً عربی زبان کے انشا پرداز ہیں اور ہندوستان میں عربی کے چند گنے چنے انشا پردازوں میں شمار کیے جاتے ہیں؛ لیکن ''وہ کوہ کن کی بات'' لکھ کر انھوں نے اردو زبان میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا ہے۔ مولانا کے وہ قدر دان جو، ان کو عربی رائٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر حیرت و تذبذب میں مبتلا ہیں کہ ان کو عربی کا بڑا انشا پرداز قرار دیں یا اردو کا۔ کتاب کی خوب صورت اور معیاری زبان و بیان کو دیکھتے ہوئے، اسے بہ جا طور پر اردو کے ادبی ذخیرے میں بھی ایک خوش گوار اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں کسی مناسبت سے جن شخصیات کا ضمناً ذکر آ گیا ہے، ان کے بارے میں مصنف محترم نے بڑے دل چسپ، لطیف، ظرافت آمیز اور نپے تلے حواشی لکھ دیے ہیں۔ ان تعارفی خاکوں نے کتاب کی اہمیت دو چند کر دی ہے۔

''وہ کوہ کن کی بات'' ہر خاص و عام بالخصوص مدارس اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے، کہ وہ اس سے نہ صرف جوش عمل، سعی پیہم، سلیقہ مندی اور تہذیب و شائستگی کا درس حاصل کر سکتے ہیں؛ بل کہ کتاب کی مرصع زبان اور اس میں جا بہ جا بکھری ہوئی ادب کی چاشنی اور انشا کی حلاوت سے بھی محظوظ و مستفید ہو سکتے ہیں۔

ناشر کتاب ادارہ علم و ادب نے طبع دوم کے ساتھ کتاب کے بارے میں ممتاز علما، ادبا اور مفکرین کے تاثرات بھی علاحدہ کتابچے کی شکل میں شائع کر دیے ہیں۔ اتنی اہم شخصیات کے اتنے اچھے تاثرات، عموماً کسی کتاب کے سلسلے میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔

تبصرہ نگار: اسعد اعظمی قاسمی